

حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک نوجوان کی داستان

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول عام سلسلہ

بازیگر

راوی: بابر زماں خان
تحریر: فکیل عادل زادہ

ساتواں حصہ



بازار

کیسے قوی و جری، مقصد و با اثر ہو جاتے ہیں۔
دولت سے آدمی خریدے جاسکتے ہیں۔ ہوا، پانی،
روشنی، دولت سے موسم خریدے جاسکتے ہیں۔
بٹھل نے خانم کی دی ہوئی گھوریوں کی ڈبیا
سے گھوری نکالی اور سلامی کی بندر کی ہوئی بیڑی
سلگائی۔ ڈبے میں کسی قدر خشکی تھی۔ کھڑکیوں کے
بٹھسے گرا دیئے سے کچھ گرمی ہو گئی۔ میرے سامنے کی
برتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے، ٹانگیں پھیلائے بٹھل
گھوری چاٹا اور بیڑی کے کش لیتا رہا، پھر ہاتھ روم
جاکے اس نے منہ صاف کیا اور واپس آ کے برتھ
پر دراز ہو گیا۔ ابھی گاڑی نے پوری رفتار نہیں پکڑی
تھی کہ کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور ایک دو
منٹ بعد ہی چل پڑی، کوئی دس منٹ بعد مشہور
تیرتھ اسٹان ایوڈھیآ آ گیا۔ گاڑی یہاں بھی بہت
کم وقت ٹھہری۔ ایوڈھیآ گزر جانے کے بعد میں
نے روشنی کم کر دی اور بیک سے ٹیس نکال کے ایک
بٹھل کو دیا، دوسرا اپنے پاس رکھا۔ روشنیاں کم
ہونے سے ڈبے کا ماحول خوابیدہ سا ہو گیا تھا۔ تو اس

پہلے کی عجب کوشش کاری ہے۔ اسی ریل
گاڑی کے دوسرے ڈبوں میں لوگ ٹھس ٹھس کر
بیٹھے ہوں گے۔ بعض لوگوں کو تو شاید کھڑے ہونے
کی بھی جگہ نہ ملی ہو۔ ڈبا کو مختصر تھا لیکن ہمارے سوا
یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اوپر کی دو برہمیں، نیچے کی
دو کشادہ برہمیں اور ہم۔ سچ میں دیوار سے لگی ہوئی
لکڑی دونوں برہموں کے لیے میز کا کام دیتی تھی۔
واکھدانی سر بانوں کے قریب جڑی ہوئی تھی۔ گلاس
رکھنے کے لیے اسٹینڈ بھی پیوست تھا۔ ڈبا نئے رنگ
روغن سے آراستہ تھا۔ ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔
فرش بالکل اجلا، چھت پر پتھے، گدے نرم اور پکھیلے،
چیمو تو آدمی دھستا جائے۔ نرمی، گداز، رنگ، روشنی
دولت کو بہت مرغوب ہیں۔ مرغوب تو ہر ایک کو ہیں
لیکن دولت ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں
دولت سے زندگی نہیں خریدی جاسکتی مگر دولت
زندگی کیسی آسان کر دیتی ہے۔ دولت تو ایک
طاقت ہے، جس کے پاس جتنی زیادہ، اتنا وہ طاقت
ور۔ دولت سے معذرت تو اس، مخنی اور ضعیف بھی

سے چلتی گاڑی بھی لوری کا کام کرتی ہے اور تو اتر سے ڈبے کی لرزش پگھوڑے کی کیفیت رکھتی ہے۔ میں نے بھی پھسل کی تھید میں لیٹ جانا چاہا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ بار بار حویلی کے دروایا م سانسے آ جاتے تھے اور حویلی ہر لمحے دور دور ہی تھی۔ بیانی پر نقش مناظر دیواروں اور فاصلوں سے نہیں ملتے۔ اس مرتبہ وہاں کچھ زیادہ ہی وقت گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔ تھا کر کسی کی یاد آتی تھی تو پھسل آٹھ دس دن سے روکا ہوا تھا کہ سب کچھ میری نادانیوں اور کوتاہیوں سے شروع ہوتا ہے۔ آس سول اسٹیشن پر میں اتنی ضد اور ناراضی کا اظہار نہ کرتا تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ پھسل تو فیض آباد کا رخ کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اول تو ہمیں فروزاں اور یاسمن کو ساتھ لے کر فیض آباد جانا چاہیے تھا۔ یہ ممکن نہ ہوا تو پہلی گاڑی سے ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ ہمارے بغیر فروزاں اور یاسمن کو حویلی میں بہت اجنبیت محسوس ہو سکتی ہے۔ بے پے اتنے بڑے حادثات کے بعد انہیں تو بہت گداز چاہیے مگر یہ میرا گمان تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے فیض آباد پہنچ جانے کے دن بھر بعد ہم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بے شک ہمیں دیکھ کے ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ ہماری آمد سے یقیناً انہیں بہت حوصلہ ملا ہوگا لیکن پھسل بھی کیا غلط کہہ رہا تھا، ان کے پیچھے پیچھے ہمارے فیض آباد پہنچنے کی واقعی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ حویلی میں زریں اور خانم موجود ہیں۔ وہاں بیسیاں ہے۔ انہیں حراماں نصیبیوں کی اشک شونی کا ٹھن آتا ہے۔ کاش جیسا کہ پھسل کا ارادہ تھا، ہم اس وقت فیض آباد نہ جاتے تو نہ ہریا اور گورا کا واقعہ پیش آتا اور نہ شاید ٹھاکر بستی میں پورے 47 آدمی جان سے جاتے۔ پھسل صاف انکاری تھا کہ اس خون خرابے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میں نے بھی یہی

تسلیم کر لیا تھا مگر جب تانے بانے کا خیال آتا تھا تو کچھ دکھائی بھائی نہ دیتا تھا۔ پھسل کو اسی شام اور اسی رات مجھے ساتھ لے کے شہر کے مختلف مقامات اور خصوصاً رات کو دکن بیگم کے بالا خانے پر جانے کی ایسی کیا بڑی تھی؟ اسی شام، اسی رات ہی کیوں؟ شاید تمہیں نقش کرنے کی صورت ہی میں یہ بد بیریں کی جاتی ہیں اور پولیس کے جہاں دیدہ، گرگ باراں دیدہ افسران کی قسم کا کوئی نشان کھوتے میں کیوں ناکام رہے؟ کوئی عام مجرم ہوتے تو اپنے آثار ضرور چھوڑ کے جاتے۔ ٹھاکر بستی پر یلغار کرنے والے کیسے ہنرمند اور پختہ کار لوگ تھے۔ یہی چیتاں نکلتے دس پولیس افسروں کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ ایک دو نہیں اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ جامو کا اچانک نکلنے سے آنا اور ایک رات کے بعد چھلاوا ہو جانا۔ اپنے آدمی گورا استاد کی ہریت کے بعد میری تلاش میں یا حویلی کے کیمینوں کو زک پہنچانے کے لیے شورہ پست ٹھاکر بل دیو کی حویلی کی طرف کوچ کرنے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے تھے اور تدارک کی یہی صورت تھی کہ ٹھاکر بستی سرے سے نیست و نابود کر دی جائے۔ یوں حویلی ہی محفوظ نہیں رہے گی، ایک خلقت کو بھی امان مل جائے گی۔ جب بھی ان پہلوؤں اور عواقب پر دھیان جاتا تھا، میرا سر پکے لگتا تھا۔ سارے جسم پر کانٹے سے آگ آتے تھے۔ بار بار میں نے اپنے آپ کو متنبہ کرنے، خود کو الگ رکھنے اور سب کچھ فراموش کر دینے کی کوشش کی لیکن دوسرے پر قابو پانا آسان، خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

سہمیں پھسل سے فیض آباد سے روانگی میں غلٹ تو نہیں ہوئی ہے۔ آدمی بہت ہوش مند ہو، بیکے ہوئے کھوں کی زد پر جتا ہے۔ وہ مجھے کی قابل سمجھتا تو میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرے رہنے کا مشورہ دیتا۔ اس نے صاف لفظوں میں پولیس افسروں کو متنبہ

کر دیا تھا کہ اس کے غیاب میں حویلی کے کیمینوں سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔ ورمانے کوئی وعدہ کیا تھا نہ اختلاف کیا تھا۔ لیکن پولیس کا کیا بھروسہ ہے۔ ایک ورمانے نہیں، دوسرے افسر بھی با اختیار ہیں۔ کسی وقت بھی کسی کا دماغ گھوم سکتا ہے۔ ورمانا کا جادو بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر حویلی کے لوگوں کو ہمارے باہر کے معاملات سے کسی ہی آشنائی ہو، پولیس، تھانے، پکھری کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہمارے چلے جانے کے بعد انہیں بے امانی، بے سرو سامانی سی محسوس ہو رہی ہوگی۔ پھسل کی بدایتوں پر وہ ہر طرح کا رہند ہیں مگر کوئی دھڑکا تو انہیں ہر دم لگا رہنا چاہیے۔ یہ سفر تو ہم کچھ دن بعد بھی کر سکتے تھے۔ چند دن پہلے یا چند دن بعد سے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ آدمی وقت کا پابند رہے، وقت بھی تو اس کا کچھ خیال کرے۔ وقت ہمارے اختیار سے نکل جاتا تھا۔ راستوں میں دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ راستے بھی تو رخ بدل لیتے ہیں۔ مجھے تو اب یہ سارا کچھ معمول سا لگتا تھا، کسی فرض یا قرض کی ادائیگی کی طرح۔ ابھی بھی تو معلوم ہوتا تھا کہ ہم محض اپنی سلی، اپنی دل جوئی کے لیے صبح و شام سفر کا وظیفہ انجام دے رہے ہیں، کیونکہ ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہنا چاہیے، کیوں کہ سفر کے سوا ہماری استطاعت میں کیا ہے۔ پہلے کسی بستی میں داخل ہوتے وقت دل دھڑکنے لگتا تھا کہ اب منزل دور نہیں ہے۔ اب اتنی بستیوں کی خاک چھاننے کے بعد کسی نئی جگہ جاتے ہوئے ناکامی کے احساس سے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں۔ پھسل کا البتہ یہ حال نہیں تھا۔ ہر صبح تروتازہ ہو کے کھلوں اور بگیوں میں مولوی صاحب کی صدا کیں لگانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ سب ایک مٹی سے بنے ہیں تو ہر شخص کی مٹی الگ ہے۔ پھسل کا یقین قائم تھا۔ اتنے آرام، خاطر و امداد، عزیزوں کی رفاقت چھوڑ کے وہ سفر کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ سفر چاہے شاہی، بجز سے میں کیا

جائے یا آٹھ گھوڑوں کی بگھی میں، سفر تو سفر ہوتا ہے۔ سفر، اپنا کھل، عشرت کدہ، اپنا گھر نہیں ہوتا۔ پھسل کا یقین کچھ ایسا بے جواز بھی نہیں تھا۔ بے شمار بستیوں کی کوچ گردی کرتے ہوئے ایک شہر جنٹلمین میں ہم مولوی صاحب کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ حیدر آباد میں بھی ہم نے ان کا گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ ٹھکریا سادات میں مولوی صاحب کے خاص دوست حافظ عبدالحق تک ہماری رسائی ہو گئی تھی۔ وہ بھی مولوی صاحب کا ایک گھر تھا۔ اتنا کچھ حرکت میں رہنے ہی سے ممکن ہوا تھا۔ منزل، مراد سے مشروط نہیں ہے۔ منزل مل جانا اور چیز ہے، مراد پانا اور۔ اور جہاں مراد بر نہ آئے، اسے منزل ہی کیوں کہا جائے۔ کاش دنیا ہی کچھ چھوٹی ہوتی اور اسی نسبت سے لوگ بھی کم ہوتے۔ خدا کو آخر اتنی بڑی دنیا بنانے کی کیا ضرورت تھی یا پھر آدمی کی سائی بھی بڑھائی ہوئی۔ آدمی کی چار آنکھیں، آٹھ ہاتھ چہرے بنائے ہوتے، آدمی کے پر لگائے ہوتے۔ دنیا کی وسعت کے اعتبار سے یہ آدمی تو بہت حقیر ہے۔ آدمی تو دو گز کا ہوتا ہے۔

یہ پیچر گاڑی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دم لیتی بڑھتی رہی۔ میں تو جاگتا ہی رہا۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل چل رہی تھی۔ پھسل میری طرف سے منہ پھیر کر سو گیا تھا۔ اس کے غافل ہو جانے سے مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا۔ تنہائی کا سا احساس، اس وقت جانے کیوں مجھے اس تنہائی کی بڑی طلب تھی۔ پھسل جاگ رہا تھا تو مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی جیسے وہ مسلسل مجھے دیکھ رہا، میرے بارے میں سوچ رہا مگر یہ تنہائی بھی عجب ایک خود فریبی، کیسا ایک گمان ہے۔ آدمی کتنا ہی اکیلا ہو، اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ جانے کتنے لوگ، کتنے منظر سننے پرانے، اچھے برے اسے گھیرے میں لیے ہوتے ہیں۔ آدمی تو سوتے میں بھی کتنا تنہا ہوتا ہے۔ تنہائی تو شاید ایک ہی وقت، ایک ہی صورت

میں ممکن ہوتی ہے اور کسی نے کہا ہے، آدمی اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ وہ مستقل اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہنسی آتی تھی۔ یہ میں کیسا آدمی ہوں۔ سامنے کا سارا آئینہ ہونے کے باوجود میرا دماغ الجھنے، ہنسنے لگتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس پر بھی خود مجھے بہت شک ہوتا ہے۔ کسی معذور، بے توازن، کسی مجہول آدمی میں مجھ سے سوا پھر کیا ہو سکتا ہے۔

پھر کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ انجن زور زور سے بیٹیاں بجانے لگا تھا مگر جیسے بادل گرے ہوں یا زمین زیر و زبر ہو گئی ہو۔ آہستہ ہوئی ہوئی گاڑی کو یکا یک جھکا لگا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ دوسرے لیے دو تین اور جھٹکے لیے اور ہسٹتی، ڈمگاتی، دھڑ دھڑاتی ہوئی دوبارہ رک گئی۔ رات کے وقت ڈبے ٹرانے کی گونج اور پیپوں اور پڑیوں کی چیخیں دور تک گئی ہوں گی۔ دھچکے اتنے شدید تھے کہ میں کونے میں دیکانہ بیٹھا ہوتا تو فرش پر جا پڑتا، پھر بھی سر کھڑکی سے ٹکرایا اور سارا جسم بھگن جھٹکا گیا۔ چند لمحوں تو مجھے اپنا ہوش نہیں رہا پھر ٹھٹھل کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی برتھ پر وہ بھی سر پکڑے ہوئے ہے۔ چہرہ بگڑا ہوا، آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔ میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ اسی اثنا میں وہ کسی قدر ٹھٹھل گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری پیشانی پر دائیں آنکھ سے اوپر خون چھلک آیا ہے۔ آنے سامنے ہم ایک دوسرے کو خطرناک دیکھا کئے اور وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ اس نے میری پیشانی چھوئی اور تھپس کا کونا چھٹکے خون پر رکھ دیا۔ ”کوئی ایسی چوٹ نہیں۔“ میں نے اس کی نشانی کے لیے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

اس نے سنائیں۔ تھپس ہٹا کے دوبارہ میری پیشانی کا جائزہ لیا۔ پیشانی ادھر ادھر سے دبا کے اسے سکون ہوا۔ میری جیب میں زریں کا دیا ہوا رومال تھا۔ اس وقت یہی ایک چارہ تھا کہ اس سے

کام لیا جائے۔ اس نے پیشانی پر کس کے رومال باندھ دیا۔ ”تمہارے بھی تو چوٹ لگی ہے۔“ میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ اس کی بے نیازی بھی مصنوعی تھی۔ ”تھوڑا سر دیوار پہ چاٹنا تھا۔“ ”زور سے لگا ہے؟“ تکلیف تو ہوگی؟ ””ٹھیک ہو جاؤ گے گا لوٹ پیٹ کے۔“

”مجھے بتاؤ، سب ٹھیک تو ہے نا۔“ میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا اور اس کا سر دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔ ”پر یہ کیا ہوا ہے؟ میں تو مرا ہوا تھا۔“ اس نے اپنی جانب سے میری توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ ”کچھ معلوم نہیں۔ میں جاگ رہا تھا، گاڑی آہستہ ہوئی ہوئی رکنے والی تھی کہ کیا ہوا، ایک دم جھٹکے لینے لگی۔ پہلا جھٹکا تو بہت زور کا تھا۔ ذرا تیز ہوئی تو لوٹ جاتی۔ اسٹیشن پر آ کے ایسا ہوا ہے۔ گاڑی تو پیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی۔“ اپنی آواز کا ہیجان خود مجھے کھٹکے لگے اور میں نے کچھ خمیر کے کہا۔ ”میں باہر جا کے دیکھتا ہوں۔“

میں اپنی بدحواسی میں کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ چیخ پکار تو اندر تک آرہی تھی۔ میں نے شیشہ چڑھائے باہر جھانکا۔ پیٹ فارم پر تو قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ لوگ دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ دروازہ کھول کے میں نیچے اتر گیا اور مجھے گاڑی کے پاس ایک جگہ کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے کچھ لوگ مجھ سے ٹکرائے اور مجھے گاڑی سے کچھ دور سا تھان کے کھبے کی طرف ہٹ جانا پڑا۔ یہاں سے وہاں تک لوگ ڈبوں کے دروازوں پر اتر رہے تھے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جن ڈبوں میں زیادہ مسافر ہوں گے۔ ان کا برا حال ہوا ہوگا۔ وہ تو جیسے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ سامان لڑھٹنے سے چوٹیں الگ

آئی ہوں گی اور کچھ دیر میں یہی دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے اور لوگ انہیں جلد سے جلد ڈبو سے نکالنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے پیٹ فارم لوگوں سے بھر گیا۔ بہت سے زخموں کو کھڑکیوں سے باہر نکالا گیا۔ جو کپڑا ہاتھ میں آتا، جیسے تیسے فرش پہ بچھا کے زخموں کو لٹا دیا گیا۔ لوگ گراہ رہے، سسک رہے اور چیخ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔ سارا پیٹ فارم طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

یہ اکبر پور جکشن تھا۔ فیض آباد سے یہاں تک کا فاصلہ 35 سے 40 میل کے قریب ہوگا اور گاڑی نے پورے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ سست رفتار کی وجہ انجن کی خرابی ہی ہو سکتی ہے۔ لوگ اس حادثے کی اپنے اپنے طور پر تاویلیں کر رہے تھے۔ ریلوے کے محکمے، حکومت اور انجن ڈرائیور کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے انجن تک جانے کا ارادہ کیا تھا اور چند قدم چل کے رو گیا۔ آگے جانے سے کیا حاصل تھا۔ ہر طرف ایک ہی منظر تھا۔ آگے جانا آسان بھی نہیں تھا۔ جانے کہاں سے لوگ نکل آئے تھے۔ ڈبوں کے قریب تو بڑی بھڑتھی۔ میرے سر میں اب ہلکی ہلکی تھپ تھپ رہی تھی۔ مجھے پھر ٹھٹھل کا خیال آیا۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ اس نے اپنی چوٹ کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس وقت گاڑی نے پہلا جھٹکا لیا، وہ سو یا ہوا تھا۔ یہی ہو سکتا ہے، سوئے ہوئے آدمی کا صرف وزن ہوتا ہے، اختیار نہیں ہوتا۔ جھٹکے نے جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور سر ہانے کی دیوار سے سر جا ٹکرایا، لڑھک کے وہ فرش پر بھی گر سکتا تھا۔ اپنے رہنے کی وجہ سے محفوظ رہا۔ جب میری نظر اس پر پڑی، وہ سر پکڑے ہوئے تھا۔ کسی شدید چوٹ میں کوئی اتنے کرب میں ہو سکتا ہے۔ ڈبے سے میں قریب

ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سر کی ماش کر رہا تھا۔ ”درد ہو رہا ہے کیا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”ایسا کر کے ٹھیک رہتا ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں دبا ہوں۔“

وہ منع کرتا رہا، میں نے اس کے ہاتھ ہٹا کے بلکے بلکے اس کا سر دانا شروع کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس جگہ زور سے دبانے پر اس کا کیا تاثر ہوتا ہے اور میں کچھ نہ جان سکا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور کچھ دیر بعد اس نے مجھے روک دیا۔ ”اب بیٹھ جا ادھر۔“ باہر تو بڑا ٹھیل چاہے۔ ”میں نے مختصر آسے باہر کا احوال بتایا اور کہا۔“ گاڑی اب بہت لیٹ ہو سکتی ہے۔“ ”کیا بولیں پھر۔“ وہ اچھٹی آواز میں بولا۔ ”تمہارے لیے چائے لادوں؟“ ”اسے میں کدھری ملے گی۔“

”دیکھتا ہوں، شاید مل جائے۔“ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ پیٹ فارم پر وہی نفسا نفسی تھی۔ ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس بسنے والے بھی تماشا دیکھنے آئے ہوں گے۔ پولیس بھی نظر آرہی تھی۔ ڈبے سے اتر کے راستہ بناتے ہوئے میں چائے کا اسٹال ڈھونڈتا رہا۔ اسٹال مل گیا لیکن چائے حاصل کرنا دشوار تھا۔ پہلے سے بہت مضطرب اور منتظر طلب گار وہاں دھڑنا دیے ہوئے تھے۔ چھینتا چھینتا کا سامنظر تھا۔ چائے بنانے والے کے اوسان بھی خطا معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہی تدبیر ذہن میں آئی۔ میں اسٹیشن سے باہر چلا آیا۔ اسٹیشن کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ ناپختہ قسم کا ہوٹل موجود تھا۔ بھیڑ تو وہاں بھی کم نہ تھی مگر چائے ملنے کا آسرا ہو گیا۔ ہوٹل والا گلاس دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے ضمانت کے طور پر پانچ روپے پیش کیے تو وہ دوسرا آدمی بن گیا۔ چائے بھی پھر

اس نے توجہ سے بنائی، ملائی بھی ڈالی۔ مجھ سے چوک ہوگئی۔ میں دس روپے کا نوٹ بڑھاتا تو وہ ڈبے تک چائے پینچانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتا۔ اندر پلیٹ فارم پر لوگوں سے بچتے بچاتے اپنے ڈبے تک پہنچنے میں مجھے پھونک پھونک کر قدم بڑھانے پڑے۔ لوگ راستہ ہی نہیں دے رہے تھے۔ خود سے زیادہ مجھے گلاس اسٹینڈ کا خیال تھا۔ کھانے پینے کی کسی چیز کے لیے میں نے ایسی ریاضت کبھی نہیں کی تھی۔ یہ تو ایک آزمائش تھی۔ بہر حال، کسی طور میں ڈبے تک آنے میں کامیاب ہوا۔ ہوا میں خشکی تھی اور ایسی نہیں کہ چائے جلدی ٹھنڈی ہو جائے۔ ٹھنڈی کو واقعی چائے کی طلب تھی۔ چند گھنٹوں میں تمام کر لی۔ ”کچھ دانا دنگا بھی کر لیتا۔“ وہ کسماتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں چاہ رہا۔“ میری آواز بھی خشکی ہوئی تھی۔

”گھر سے چلے ٹائم ہو گیا۔ تھوڑا ہلکا پھلکا کر لے۔“

”تمہیں کچھ خواہش ہے؟“

”اپنے کو بھی نہیں ہے پر اس کی رکھی چیزیں ڈھیر نہ ہو جائیں۔“ وہ تردد سے بولا۔ اس کا اشارہ زریں کی طرف تھا۔ زریں نے بیک میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی تھیں۔ معلوم نہیں، کیا کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی تو کیا کھول کے دیکھتا۔ زریں نے ضرور خیال رکھا ہوگا کہ جلد خراب ہو جانے والی چیزیں ساتھ نہ لے جائیں۔

چائے پی کے اور ٹھنڈی کو پیلا کے میں پھر ڈبے سے باہر آ گیا۔ اتنی دیر میں کسی قدر نظم و ضبط ہو گیا تھا۔ شور کی جگہ جھن بھنائی سو گوارے لے لی تھی۔ سپاہیوں کی بڑی تعداد نے پھرے اور پھرے ہوئے لوگوں کو قابو میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ دو چار ڈاکٹر بھی آ گئے تھے اور زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اسٹریچروں کی کسی معلوم ہوئی تھی۔ لوگ

چارپائیوں پر شدید زخموں کو باہر لے جا رہے تھے۔ میں تماشائی بنا کب تک کھڑا رہتا۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا اور چارپائیاں اٹھانے میں مدد دیتا رہا۔ پھر کئی بچوں کو گود میں بھر کے میں نے پلیٹ فارم سے باہر پہنچایا۔ جہاں ڈاکٹر زخموں کی چاروگرہی میں مصروف تھے، اس بیچ کے کونے سے نئی، ٹھہری نئی ایک بوڑھی عورت پر میری نظر پڑی۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ بیچ بیکار کر کے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے قابل بھی نہ تھی۔ لگتا تھا، اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی ہے۔ اس کا ڈھلکا ہوا سر دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھنکا کہ کہیں..... میں نے جھپٹتے جھپٹتے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کر آٹھپیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سمائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کوٹھے پر ہاتھ رکھ کے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ میں نے پوچھا، اس کے ساتھ کون ہے؟ کیا وہ اکیلی سفر کر رہی تھی؟ وہ کہاں سے آ رہی اور اسے کہاں جانا ہے؟ اس کا سامان کہاں ہے؟ اور ڈبے سے یہاں تک کون اسے لایا ہے؟ وہ اتنے سوالوں کے جواب میں دیدے گھما کے رہ گئی۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو اسے یوں اکیلا نہیں چھوڑ دیتا یا پھر معلوم نہیں، اس شخص پر بھی کیا گزری ہو۔

بیچ پر بیٹھا ڈاکٹر پاگل ہو رہا تھا۔ قریب کوئی اسٹریچر یا چارپائی بھی نہیں تھی۔ بوڑھی عورت کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ کچھ لوگ زخموں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ وہ ان کے عزیز ہی ہوں گے۔ بڑھیا کو بھی ڈبے سے یہاں تک کسی نے پہنچایا ہوگا۔ اپنے پیروں چل کے تو وہ ناسکس ہوگی۔ کوئی اور چارہ نہ دیکھ کے میں نے بھی اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی ٹھہری بازوؤں میں بھر لی۔ وہ بہت دھان پان تھی۔ باہر جانے کے

لے گیٹ پلیٹ فارم کے وسط میں تھا اور زیادہ دور نہیں تھا۔ تیر قدموں، رکاوٹوں اور بڑھیا کو احتیاط سے جکڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی۔ اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ بہت سے ٹانگے اور دوسری سواریاں زخموں کو لے جانے کے لیے منتظر کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کے کئی آدمی میری طرف لپکے۔ بڑھیا کو ٹانگے میں بٹھایا گیا اور دو آدمیوں نے اس کے دائیں بائیں بیٹھ کر اسے تھام لیا۔ لوگ غلط نہیں کہتے۔ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے یا پھر یہ کہ کوئی کتنا ہی برا ظالم، کتنا ہی برا ہو، کسی وقت بھی بہت اچھا اور نرم دل ہو سکتا ہے۔ شہر کے لوگ یہ افتادین کے اتنی رات کو، اپنا آرام چھوڑ کے اسٹیشن پر اٹھ آئے تھے اور ہر کوئی اپنی توہین کے مطابق سرگرم تھا۔ کسی شخص کے بغیر کہ کون کیا ہے۔ ٹانگا روانہ ہوا چاہتا تھا کہ میں نے بڑھیا کے سامنے جا کے اس کے زانوؤں پر ٹھکی دی۔ وہ بوڑھا نہ لگی۔ پوربی مجھے بھی خوب آتی تھی لیکن اس کی آواز بہت دھیمی اور منتشر تھی، میں کچھ اخذ نہ کر سکا۔ شاید وہ دعا میں مبتلا چاہتی تھی۔ جب میں نے اس کے زانوؤں پر ٹھکی دی تھی تو اس کی ویران آنکھوں میں لمبے بھر کے لیے چمک پیدا ہوئی تھی۔ آنکھوں کی زبان سب سے پہنچ ہوئی ہے۔ اس زبان کا کوئی نام نہیں اور ہر جگہ بولی اور بھی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی غنمانی لود دیکھ کے میرا دل بھی ڈلنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا قد بڑھ گیا ہو اور میں بے وزن ہو گیا ہوں اور جسے مجھ پر مشکشف ہوا کہ میرا وجود صرف میری غرض نہیں، دوسروں کو بھی اس سے کچھ سرکار ہے۔ کوئی اپنے لیے ٹھک سے جی نہیں سکتا تو اصرار بھی کیوں کرے، خود کو دوسروں کی نذر کیوں نہ کر دے۔ آدمی اپنے آپ سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھے۔ آدمی کو آدمی کی بڑی ضرورت ہے، اشیاء سے زیادہ۔

اسٹیشن کی عمارت کے باہر کھڑا میں ٹانگا جاتے

دیکھتا رہا۔ بوڑھی عورت کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں لیکن وہ اپنی بیچ کی ہوئی توانائی تا دیر پر قرار نہ رکھ سکی۔ میں نے دیکھا، اس کا جسم دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص پر ڈھلک پڑا۔ ٹانگا دور ہوتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ تا نگہ کا ثقاب کروں مگر اور کیا کر سکتا تھا۔ اسے وہ لوگ اسپتال کی طرف ہی لے جا رہے تھے۔

پلیٹ فارم پر واپس آ کے ٹھنڈی کی خبر لینے کے لیے میں نے ڈبے کا رخ کیا۔ وہ ترہ پر دراز تھا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا مجھے معلوم تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس رہ کے میں اپنے ڈبے سے نزدیک کی بیچ پر بیٹھے ڈاکٹر کے پاس چلا آیا اور اس کی ہدایت پر میں بھی لوگوں کو پٹیاں باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ شروع شروع میں جھجک ہو رہی تھی لیکن جلد ہی ہاتھ رواں ہو گیا۔

2 بجے کے قریب اسٹیشن خاصا پرسکون ہو گیا تھا۔ شہر کے بہت سے لوگ گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر یا تو ریلے کا عملہ تھا۔ شہر کی افسران تھے، پولیس بھی یا مسافر تھے۔

ڈبوں کے بجائے اب مسافر ٹولیوں کی شکل میں جا بجا پلیٹ فارم کے فرش پر اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے میں ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور ارد گرد کھڑے سپاہی مجھ سے مانوس ہو چکے تھے۔ زخموں سے فارغ ہو کے ڈاکٹر کے اوسان بحال ہوئے تو اس کی نگاہ میری پیشانی پر بندھے رومال پر گئی۔ وہ شرمندہ بھی ہوا، پریشان بھی۔ میں منع کر رہا تھا لیکن اس نے رومال کی گرہ کھول کے میرے زخم کا توجہ سے معائنہ کیا اور مرہم لگ کے پٹی باندھ دی۔ کئی گولیاں بھی ہر جگہ گھٹنے بعد پانی کے ساتھ گھٹنے کو دیں۔ وہ ایک مہربان آدمی تھا۔ اس نے میرا سینہ دیکھا، نبض دیکھی۔ پٹی سے مجھے سکون ہوا۔ پیشانی کی عین میں خاصی کمی ہو گئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے ساتھ ہی بٹھالیا اور سرگاہ پینے لگا۔

کھپ آرہی ہے۔ اکبر پور سے ادھر مشرق میں 30 میل دور شاہ خج، 45 میل دور جون پور اور مغرب میں 35 میل دور فیض آباد، سو میل کی دوری پر بارہ بنگلی ہے۔ کچھ دیر جاتی ہے، ہر طرف سے مدد آجائے گی۔ کئی زخمیوں کی حالت بہت نازک ہے، خصوصاً بچوں اور عورتوں کی۔ شہر والوں نے اسپتال میں جگہ کم پڑنے پر آسٹرم میں انتظام کر لیا ہے پونیس نے احتیاطاً مسافروں کا سامان ڈبو سے نکلوا کے پلیٹ فارم کے ایک کمرے میں محفوظ کر دیا ہے۔ کئی شدید زخمی مسافروں نے اپنے سامان کے بغیر اسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یہیں پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے ہیں۔ صرف درمیانہ اور تیسرے درجے کے مسافروں کے ڈبے خالی کرائے گئے ہیں۔ اول اور دوم درجے کے مسافروں کو بھی گہری چوٹیں آئی ہیں لیکن ان میں زیادہ تر اپنے ڈبو میں ہیں۔

ڈاکٹر کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کا نام آئندہ کشور سکینہ تھا۔ وہ ایک پسندیدہ شخص تھا۔ شاید میں بھی اسے پسند آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا، کچھ اپنی سنانا، کچھ مجھ سے پوچھتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ اتنے زخمیوں کی خبر گیری کے بعد وہ تھک گیا ہوگا، اسے گھر جانا چاہیے، ہائی ڈاکٹر بھی چاہیے ہیں۔ کہنے لگا۔ ”اے کاموں سے کوئی تھکن ہوتی ہے۔“ پھر بولا۔ ”تھکن دوطرح کی ہوتی ہے، ایک مٹھی، دوسری کڑوی۔ یہ بڑی مٹھی تھکن ہے۔“ پلیٹ فارم کی گھڑی ساڑھے تین بجارہی تھی تب وہ اٹھا۔ چلتے وقت مجھ سے بہت زور سے مصافحہ کیا اور اسی جوش سے بولا۔ ”تم سے اب شاید کبھی بھینٹ نہ ہو پر تم مجھ کو یاد رہو گے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی آپ یاد رہیں گے۔ کبھی اس طرح آتا ہوا تو ایک بار ضرور آؤں گا۔ اتنی دیر میں، میں نے آپ سے بہت جانا ہے۔ آپ جیسے آدمی کم ملتے ہیں۔“ وہ مسکراتا اور سرگرا پیتا ہوا گیٹ

اب انہیں حادثے کی نوعیت کے بارے میں غور کرنے کی مہلت ملی تھی۔ بیچ کے عقب میں کھڑا ایک عمر رسیدہ سپاہی کچھ زیادہ ہی واقف احوال تھا۔ اس نے بتایا کہ انجن میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ڈرائیور پرانا آدمی تھا، کسی طرح گاڑی یہاں تک لے آیا۔ اس نے کمال مہارت اور ہوش مندی سے کام لیا ورنہ گاڑی کسی بڑے حادثے سے دوچار ہو جاتی۔ جوئے، نے قیاس کیا تھا، سپاہی کم و بیش اسی ترتیب سے بیان کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق، اوپر کی برقصوں پر بیش تر مسافر سوئے ہوئے تھے، نیچے بیٹھے ہوئے بھی نیم خوابیدگی و نیم بیداری کی حالت میں تھے۔ عموماً تیسرے درجے کے ڈبوں میں گنجائش سے زیادہ مسافر ہوتے ہیں۔ اچانک شدید جھٹکے کی وجہ سے اوپر کی برقصوں پر سوئے ہوئے مسافروں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک جھٹکتے میں سب کچھ غٹ ریوڑ ہو گیا۔ رہی سہی کسر دوسرے جھٹکوں نے پوری کر دی۔ اوپر کی برقصوں پر رکھے سامان نے اور زیادہ تباہی مچائی۔ ایسے موقع پر آدمی کو اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے سامنے شخص وہ ہوتا ہے، اس کی اپنی ذات، اپنا وجود۔ ہر مسافر نے اس ناگہانی سے بچنے کے لیے دروازے اور کھڑکیوں سے کودنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہی، حالاں کہ گاڑی منٹ دومنٹ کے تلاطم کے بعد پرسکون ہوگئی تھی مگر وقت کی کمیت کیا، وقت تو کیفیت سے عبارت ہے۔ ابھی ایک لمحہ ہی بہت کاری ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں منظر بدل جاتا ہے۔

سپاہی نے بتایا کہ قریب قریب کے شہروں سے مدد آرہی ہے۔ لکھنؤ سے نئی گاڑی چل پڑی ہے۔ ریلوے والوں نے فیصلہ کیا ہے موجودہ گاڑی اور انجن کو کل پرنوں کی جانچ پڑتال کے بغیر نہیں چلایا جائے گا۔ فیض آباد اور بارہ بنگلی سے ڈاکٹروں، نرسوں اور حادثے کی تفتیش کے لیے بڑے افسران کی ایک

کی طرف جانے لگا تو میں نے چند قدم لپک کے اسے پھر چالیا۔ ”ڈاکٹر صاحب، مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”ایک گزارش ہے۔“

”ہاں ہاں بولو!“ وہ پللیں چمکانے لگا۔ میں نے ہنسی کرتے ہوئے کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو وہ میرے ہم سفر کو بھی دیکھ لے۔ گاڑی کے جھٹکے سے اس کا سر دیوار سے جا لگا تھا۔

وہ ناراض ہونے لگا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلٹ کے اس نے کہا ڈنڈر کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے ہٹل کو پہلے مطلع کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ سو نہیں رہا تھا۔ میرے پیچھے دو اجنبیوں کو داخل ہوتا دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا۔ کپا ڈنڈر کے ہاتھ میں ڈاکٹروں کا مخصوص بیگ تھا۔

”ان کو کیوں کشٹ دیا رہے۔“ وہ ابھی ہوئی آواز میں بولا۔

”کشٹ کیسا شری مان۔“ ڈاکٹر نے خوش گواری سے کہا اور ہٹل کو کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔ مختلف جگہوں پر اس کا سر دبا یا۔ ہٹل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا تو پوچھنے لگا۔ ”دکن ہوتی ہے؟“ ہٹل نے کچھ توقف کے بعد تندی سے جواب دیا۔ ”تھوڑی بہت تو ہوگی۔“

”تھوڑی بہت یا زیادہ؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”اپنے کو چلتی ہے۔“ ہٹل نے سر جھکا۔ مجھے یہی خدشہ تھا۔ اس کے جواب سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی جو اس نے ڈاکٹر سے اقرار کر لیا تھا۔ وہ ڈبے سے باہر بھی نہیں نکلا تھا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سر کا معائنہ کیا اور بیگ سے آلہ نکال کے سینے کا بھی پھر مائٹر لگا کر حرارت بھی دیکھی۔ ”کوئی، کوئی ایسی بات تو نہیں۔“ میں نے مضطربانہ پوچھا۔ ”فیض آباد بہت فریب ہے۔ کیا ہم گھر واپس چلے

جائیں؟“

”کیا بولتا ہے رہے۔“ ہٹل تنک کے بولا۔

”تم مت بولو، مجھے ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے دو۔“ میں نے سختی سے کہا اور ڈاکٹر سے پوچھا، ”ہاں ڈاکٹر صاحب، آپ کا کیا مشورہ ہے؟“ ”ویسے تو سب ٹھیک لگتا ہے پر تکلیف باقی رہے تو گھر لوٹ جانا چاہیے اور کسی اچھی جگہ دکھانا چاہیے۔“ ڈاکٹر کے لیے میں نے کوئی فکر اور تشویش کھوجنے کی کوشش کی مگر اس کا بوجھ سرد اور ساٹ تھا۔ اس نے نسخہ لکھا اور تاکید کی کہ بازار سے یہ دوائیں لے کے پابندی سے استعمال کی جائیں۔ اس کی ہدایت پر کپا ڈنڈر نے کئی قسم کی گولیوں کو الگ الگ پڑیاں بنا کے دیں اور ان پر خوراک کی مقدار درج کر دی۔

میں اب ہٹل کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر کو پلیٹ فارم کے باہر تک چھوڑنے کے لیے مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں نے راستے میں اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی دیکھی بات نہ کہہ دے۔ وہ بھی چپ رہا۔ اس کی خاموشی بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ جیسے عینے اس کا رسمی شکر یہ ادا کر کے میں نے اسے رخصت کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک آیا۔ ہٹل اب دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ پہلے میں نے اپنی سانسیں بحال کیں پھر آواز دھبی رکھ کے مفاہمانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی بہتر یہی ہے ہم فیض آباد لوٹ جائیں، وہاں آرام کا وقت مل جائے گا، وہاں اچھے ڈاکٹر حکیم ہیں، اسپتال بھی بڑا ہے۔ چند دن بعد پھر چل پڑیں گے۔ احتیاط کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔

”جوٹ مجھ کو لگی ہے رہے۔“ وہ جھنکلا کے بولا۔ ”ٹھیک۔“ میں نے ہٹل سے کہا۔ ”تمہی کو لگی ہے۔ تمہی بہتر جانتے ہو گے لیکن مجھے لگتی تو تم سفر جاری رکھتے؟“

”پہلے تجھ سے پوچھتے۔“

”اور میں تمہاری طرح ٹالتا رہتا تو.....“

میں نے اسے قائل کرنے کے بہت جتن کئے، وہ منتار با پھر کہنے لگا، آگے جا کے دیکھتے ہیں۔ آگے کچھ اچھا محسوس نہیں کیا تو کسی وقت بھی واپس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ فیض آباد سے دور ہوئے تو نکلتے چلے جائیں گے۔ اس کی بات کسی حد تک مقبول تھی لیکن میری تجویز اس سے زیادہ مقبول تھی۔ مجھے معلوم تھا، میری دلیس رائیگاں جائیں گی۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بیگ سے گلاس نکالا اور پلیٹ فارم کے ٹکے سے پانی بھر کے ڈاکٹر سکینہ کی دی ہوئی گولیاں اس کے سامنے بڑھا دیں۔ یہی بہت تھا کہ اس نے گولیاں ہٹلے میں کوئی ہیں پیش نہیں کیا۔

صبح چھ بجے کھنکھنے سے خالی گاڑی آگئی۔ صبح کہیں بھی ہو، بہت نرم اور ہلکی ہلکی ہوتی ہے۔ جیسے دنیا کا وزن کم ہو گیا ہے۔ ریلوے لائنوں پر پھرے کوکلوں میں سبزہ پھوٹ رہا تھا۔ صبح کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے کا رنگ کچھ اور، پھولوں کے رنگ کچھ اور۔ ریلوے کے عملے کی درخواست پر اول اور دوم درجے کے مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے نکل آئے۔ ان میں بھی کئی لوگوں کے بیٹیاں بندھی ہوئی تھیں یا پچائے چسپاں تھے۔ بعض لوگوں سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے ہٹل بھی تیار ہو گیا۔ قلی نے ہمارا سامان پہلے ہی اٹھا رکھا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا۔

ہٹلے ہوئے ہٹل کے پیروں میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ البتہ اس کی رفتار سست تھی۔ ہل پار کر کے ہم دونوں پلیٹ فارم پر آگئے تھے کہ میرے قدم اٹکنے لگے۔ کچھ فاصلے پر موجود پولیس کے گروہ میں مجھے ایک شناسا افسر نظر آیا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ یہ وہی افسر تھا، دوسری بار کو تو قلی میں حاضری کے وقت جس سے ہماری مذہبھیر ہوئی تھی ”استاد کھل!“ اس نے دور سے پکارا اور تیزی سے بڑھ کے عین

ہمارے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس طرح کہ ہم آگے جانے کے لیے پہلو بدل ہی کر گزر سکتے تھے۔ اس کے ماتحت سیاہی بھی اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک کھلے کے لیے میرے دماغ میں کئی طرح کے دوسروں نے بلغاری۔ میں نے بے چینی سے ہٹل کی طرف دیکھا۔ ہٹل نے توفیق کے خلاف اسے سلام کیا نہ کلام کرنے میں ہل کی۔ پولیس افسر کچھ مکدر ہوا اور تنی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم بھی اسی گاڑی میں تھے؟“

”نکٹ دکھائیں مائی باپ!“ ہٹل کے لہجے کی سختی پر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ اتنا مناسب بات تھی۔ پولیس افسر کی پیشانی تنک ہو گئی، آواز بھی اکڑ گئی۔ ”ہم کو پتا ہے۔ تم چھوٹا کام نہیں کرتے۔“

”بڑا مان بڑھایا تم نے۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”کیوں پوچھتے ہو صاحب؟“

”خمس بتانا چاہتے؟“

”ادھر ساروں سے پوچھ رہے ہو؟“

”تم سے پوچھتے ہیں۔“ پولیس افسر نے افسرانہ طور سے پوچھا۔

”اپنے کو یاد نہیں، کوئی تاتے داری نکلتی ہو تم سے۔“

”ناتا جوڑنے میں کیا دیر لگتی ہے۔“

”پہلے تم ہاتھ بڑھاؤ گے یا ہم آگے کریں؟“

”اس کا سے بھی آجائے گا۔“ پولیس افسر کی آواز بل کھا گئی۔

”کام کی بات کرو مہاراج!“ ہٹل نے برکتی سے کہا۔

”اپنے لیے کوئی پرچی چالان لائے ہو تو ویا

بولو، نہیں تو اپنا سرتہ چھوڑ دو۔“

پولیس افسر سمٹی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دکنے لگا تھا۔ اس کے ارد گرد کھڑے

سیاہیوں کے تنھتے پھڑک رہے تھے۔ پولیس افسر

نے ہمارے سامنے سے ہٹنے میں تامل کیا۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ ٹھٹھل ہاتھ بڑھا کے اسے ایک طرف کرنے کی جسارت کرے تو بات آگے بڑھے اور اسے من مانی کرنے کا جواز مل جائے۔ آنے والے لمحے میں کچھ بھی ممکن تھا۔ میرا جسم اٹھنے لگا تھا۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھنے والے مسافر بھی ٹھہر کے ہمیں دیکھنے لگے۔ ٹھٹھل نے ضبط کیا۔ آخر پولیس افسر خود ہی ایک جانب ہو گیا۔

آگے ریلوے کا قافلہ پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کی معاونت میں مصروف تھا۔ ہمیں پہلے جیسا ہی ڈبہ ملا۔ جب تک میں نے ڈبے میں قدم نہیں رکھا، مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور کوئی کسی وقت اچانک سامنے آکے ہمیں روک لے گا۔ رات بھر کی بیداری کے باوجود کسی ٹھٹھل کا احساس نہیں تھا لیکن اب جانے کیا ہو رہا تھا، کیا ہو گیا تھا، دل ڈوب سا رہا تھا۔ لگتا تھا، بہت دور سے چل کے آ رہا ہوں۔ ڈبے میں آکے مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔ میں نے ہر تھکے گدے پر خود کو ڈھیر کر دیا۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر لوں اور نہ کچھ دیکھ پاؤں، نہ سن پاؤں لیکن اپنے آپ سے بے گانگی کے چند لمحے بھی مجھے نہ مل سکے۔ قلی کی آواز پر مجھے ہٹلنا پڑا۔ میں بھول گیا، میں نے ابھی کچھ سٹے کیا تھا۔ ٹھٹھل کی حالت مجھے ٹھک نہیں لگتی تھی ورنہ پولیس افسر سے یہ تو نکال نہ ہوتی۔ میں نے سٹے کیا تھا کہ اسے بس آرام کرنے دوں گا اور سارے کام خود کروں گا۔ مجھے اپنی دل جمعی اور خوش گواری کا تاثر دیتے رہنا چاہیے۔ سامان رکھنے کے بعد قلی کسی اور خدمت کے لیے پوچھنے لگا۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھا ہو۔ پولیس افسر سے حجت کے دوران وہ سامان اٹھائے وہیں کھڑا رہا تھا۔ ٹھٹھل نے اس سے چائے کی فرمائش کی تو اس نے جیسے کوئی اعزاز سمجھا۔ پلک جھپکتے میں باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں چائے لے آیا۔ چائے بھی خاص قسم

کی تھی۔ اول درجے کے مسافروں کے شایان شان، الگ الگ برتنوں میں۔ ٹھٹھل نے اسے باس بیٹھے اور چائے پینے کی پیشکش کی تو وہ بری طرح جھکڑ بڑا گیا۔ دو ہی پیالیاں تھیں۔ میں نے اپنے لیے گلاس میں چائے بنائی اور اسے پیالی دینا چاہی۔ اس نے شدت سے انکار کر دیا اور اچک کے میرے سامنے سے گلاس اٹھالیا۔ وہ ہمارے برابر بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک مودب اور خدمت گزار آدمی تھا۔ ٹھٹھل کے اصرار پر یہ بہ مشکل برتھ پرکونے میں سکر کے بیٹھ گیا اور جھپکتے ہوئے اس نے ہماری خیریت پوچھنی پھر از خود رات کے واقعات بیان کرنے لگا۔ اس کی اطلاع کے مطابق، ڈاکٹر نے بہت کوشش کی لیکن تین عورتیں، دو بچے اور دو مرد مسافروں کو موت سے نہ بچا سکے۔ کچھ اور زخمیوں کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ بہت سے مسافر احتیاطاً روک لیے گئے ہیں۔ وہ رکنے کو تیار نہیں تھے لیکن افسروں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض زخمیوں کو کھنٹو اور فیض آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ قلی بھی انجن ڈرائیور کی تعریف کر رہا تھا کہ اس کی مشاقی سے گاڑی کسی بڑے حادثے سے بچ گئی۔ کہنے لگا کہ خدا نے خیر کر لی۔ جس کی گھسی تھی، اسے تو جانا ہی تھا۔ موت کے بھی کیسے کیسے بہانے ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی اجرت اور اندازا چائے کی قیمت سے زیادہ روپے دیے تو وہ حساب بتانے اور باقی روپے واپس کرنے لگا۔ میں نے واپس ہی نہیں لیے۔ وہ سلام کر کے اور دعا میں دے کے چلا گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی بھری گوری صراحی تھی۔ پانی کے لیے مجھے بار بار مختلف اسٹیشنوں پر اتارنا پڑتا۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور شکر یہ بھی نہیں تھا۔ چنی دیر گاڑی امبر پورا اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ قلی کی موجودگی کے باوجود مجھ پر بیجان سی کیفیت طاری رہی۔ روشنی اب پختہ ہو گئی تھی۔ صبح کی تاریکی

اور معصومیت رخصت ہوگئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی نے حرکت کی۔ اکبر پور تیزی سے دور ہوتا رہا اور گاڑی دونوں طرف پھیلے سبزہ زاروں سے گزرنے لگی تو میں نے بیک کھول کے توشہ دان نکالا۔ چار حصوں پر مشتمل توشے دان میں مرج تیسہ، میتھی بالک کی بھجیا، پوریاں، میٹھی نکلیاں اور سوچی کا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ پوریوں اور ٹکیوں کے خانے میں چھوٹی چھوٹی سلور کی کٹوریاں اچار اور چٹنیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ زریں نے ایسی چیزیں ہی منتخب کی تھیں جو سفر میں جلد متاثر نہ ہو سکیں۔ بیک میں تام چٹنی کی دو پلیٹیں، آسانی رنگ کے ریشمی کپڑے میں لپٹی اور سنہری ڈوری سے بندھے چمچے اور ایک مختصر پھول دار دسترخوان بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ سلیقہ دیکھ کے زریں کا سراپا آنکھوں میں اتر آیا۔ کسی نے کہا ہے، سلیقے سے مراد احساس تناسب ہے اور سلیقہ حسن ہے۔ سلیقہ آدمی کے اندر کے سلجھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور سلیقہ برداشت ہے۔ چیزوں کی تقدیم و تاخیر درجہ اور سلیقے وار ترتیب میں ایک محل چاہیے۔ زریں میں یہ خوبیاں بدرجہ کمال تھیں۔ کچھ قدرت کا عطیہ، کچھ خود اپنی نیت اور کوشش کا حاصل۔ کوئی بہت حسین ہو بہت بے سلیقہ بھی ہو سکتا ہے۔ زریں کو قدرت نے ہر طرح سے نوازا ہے۔ وہ خود بھی مجسم تناسب، مجسم سلیقہ ہے۔ حسن صرف رنگ روپ نہیں، ایک تناسب بھی ضروری ہے۔ زریں کا وجود تو جیسے تراشا گیا تھا۔ میں نے ہر تھ پر دسترخوان بچھا کے کھانا جن دیا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی لیکن کھانے کے رنگ اور خوشبو کا بھی ایک تاثر ہوتا ہے۔ ٹھٹھل بھی کھانے کی ہر تھ پر چلا آیا۔ ایک تو کھانا لذیذ تھا، کچھ ایک دوسرے کے خیال سے ہم نے سیر ہو کے کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے ٹھٹھل کو دوا کی دوسری خوراک دی اور پانوں کی ڈیبا اور ہوا اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ گھوڑی کھا کے اور بیڑی سلگا

کے وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کا نظارہ کرتا رہا، پھر برتھ پر دراز ہو گیا۔
اکبر پور سے مغل سرے کا فاصلہ 100 میل سے کچھ کم ہے۔ دو پہر دو بجے گاڑی مغل سرے پہنچ گئی اور اتفاق سے آدھ گھنٹے بعد ہی ہمیں کھلتے کی طرف جانے اور بڑی لائن پر چلنے والی تیز رفتار گاڑی مل گئی۔ میرا خیال تھا، ٹھٹھل پہلے دھن باد جا کے ظفر سے بات کرے گا۔ ظفر کو اب اپنی منگیت فروزاں کے پاس چلے جانا چاہیے۔ گوفروزاں، یاسمن اور ان کے مرنی نصیر بابا نے فیض آباد میں اس کی آمد کے لیے کسی بے غمی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب خاصے دن ہو گئے تھے۔ فروزاں کے والد ایرانی نژاد پروفیسر کے انتقال کے بعد ظفر ہی ان کے گھر کا واحد خیراں تھا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا فرض شناس و جیہد و شلیل، لائق فائق نوجوان ہو گا جو پروفیسر جیسے دیدہ ور نے اپنی نازک اندام، حور شامل بینی کے لیے منتخب کیا تھا۔ میں نے ظفر کی شرافت، نجابت اور لیاقت کے متعلق بہت سنا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ دو لاکھوں میں ایک فروزاں جیسی لڑکی کا منگیت تھا۔ علم و فضل کے جو یا اس سادہ شعار نوجوان پر کبھی نہفت سید محمود علی نے ہر قسم آزمایا تھا۔ اس نے پروفیسر کی مرحومہ بیوی اور اس کی بیٹیوں تک ظفر کی رسائی کا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ پروفیسر کے بے سہارا خاندان کو ظفر سے بدظن کرنے کے لیے اس نے بڑی شعیبہ بازی کی تھی۔ شہر آسن سول کی زمین اس شاطر نے ظفر کے لیے تنگ کر دی تھی۔ ظفر کو بڑی شہر دھن باد میں پناہ لینی پڑی اور اس کی حالت پاگلوں جیسی ہوئی۔ میرے پوچھنے پر ٹھٹھل نے بردوان شہر کا نام لیا۔ آسن سول سے ہم فیض آباد نہ جاتے تو ہمیں بردوان ہی جانا تھا۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”ظفر میاں کے پاس نہیں جانا؟“
”نہیں رے۔“ اس نے اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
”نصیر بابا کہتے تھے، اس کی حالت ٹھیک نہیں

تھی۔ اب دن بھی بہت ہو گئے۔ فیض آباد جا کے وہ سنبھل جائے گا اور ان دونوں فردزاں اور یاسمن کی تسلی بھی ہو جائے گی۔“
”ابھی اس کو ادھر ہی رہنے دے۔“
”کیوں؟ اب نہیں تو پھر کب؟“
”ابھی بائیں نہیں آیا۔“ ٹھٹھل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

وقت سے اس کی کیا مراد ہے؟ میں نے وضاحت نہیں چاہی اور خود مجھے کی کوشش کی۔ ایک ہی وجہ قریب قیاس نظر آتی تھی کہ فیض آباد کے دیگر گوں حالات کے پس منظر میں ظفر کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ بانی لوگوں کی بات دوسری ہے۔ زریں کی حوصلی اور فیض آباد، ظفر کے لیے اجنبی ہیں۔ میں نے پھر کوئی بحث نہیں کی۔ وقت کم تھا۔ کھلتے کی طرف جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مجھے ٹکٹ لینے کے لیے اسٹیشن سے باہر جانے میں وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ میری درخواست پر گاڑی کے ٹی ٹی نے بردوان تک کا کرایہ لے کر پرچی کاٹ دی۔

اول درے میں کوئی جگہ نہیں تھی، مجبوراً ہمیں دوسرے درے میں بیٹھنا پڑا۔ ڈبے میں پہلے سے نوجوان مرد و عورت اور شیر خوار بچہ موجود تھے۔ لباس سے آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔

چہروں کی نازکی اور چمک ہی آسودہ حالی کی چٹلی کھاتی ہے۔ نوجوان نے ڈبے میں ہمارے داخل ہوتے وقت ہمیں ٹوکا تھا کہ یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ ہے، یہ سن کے مجھے حراہہ آیا تھا۔ میں نے تڑخ کے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے۔“ وہ کچھ شرمندہ ہوا اور کسمسا کے رہ گیا۔ نظر آ رہا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا ہے۔ اس کی خوب صورت بیوی ہمیں دیکھ کے منہ پھیر کے بیٹھ گئی۔ یہ تجربہ ہمیں کئی بار ہو چکا تھا۔ اونچے درجے اور اونچے لوگوں میں بیٹھنے کے لیے

دام دورم ہی کافی نہیں ہوتے، کچھ اور بھی لوازم ہوتے ہیں۔ یوں بھی پہلے سے بیٹھا ہوا ہر مسافر ڈبے کو اپنی چاکیر سمجھتا ہے۔ بہر حال ٹھٹھل کو آرام کے لیے پوری برتھ مل گئی۔ بردوان تک طویل فاصلہ تھا۔ چار سو سو چار سو میل کے قریب۔ کم از کم بارہ گھنٹے کا سفر۔ صبح اکبر پور سے نکلتے ہی ہم نے کھانا کھایا تھا۔ اب دو پہر ہو گئی تھی۔ ٹھٹھل نے جانے کے ساتھ زریں کی دی ہوئی دو میٹھی نکلیاں کھاکیں اور مزید کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے بھی اسی براکتا کیا۔

چھوٹے چھوٹے اسٹیشن درگزر کرتی ہوئی گاڑی تیز رفتاری سے سفر کر رہی تھی۔ مغل سرے سے گاڑی چلے ہوئے ڈھائی گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ ٹھٹھل کا ٹیک اٹھ بیٹھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہیں۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے اضطراب سے پوچھا۔
”پٹنا اب کتنی دور ہے؟“ اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

”قریب ہی ہونا چاہیے۔ مغل سرے سے سو سو سو میل کی دوری تو ہے؟“ میں نے تذبذب سے کہا۔

ہمارے ہم سفر نے بھی سن لیا تھا۔ اس نے بھی دخل دیا کہ سات بجے تک گاڑی پٹنا پہنچ جانی چاہیے۔

”بٹے کو کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی کام ہے؟“ میں نے منتشر آواز میں پوچھا۔
”کچھ نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ جب آئے تو بول دیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”سر میں تھوڑی دھن ہے۔“
”دھن ہے، ہاں!“ میری زبان لڑکھاہٹ گئی اور مجھے دھچکا سا لگا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے میں اس کی

برتھ کی طرف جھپٹا اور اس کے پاس جا کے ٹھک گیا۔
میں نے غیر ارادی طور پر اس کی کلائی پکڑی۔ کلائی
گرم تھی۔ اس کی پیشانی چھوئی۔ پیشانی کھائی سے
زیادہ گرم تھی۔ ”تمہیں تو بخار؟“ میں نے سٹ
پٹاتے ہوئے کہا۔ ”کیا، کیا بہت زیادہ تکلیف
ہورہی ہے؟“
”اتنی نہیں جتنا تو.....“ وہ بیزاری سے
بولی۔ ”بولانا تھوڑا دکھتا ہے۔“

”قریب کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ میں
پہلے ہی کہہ رہا تھا، واپس چلو مگر تم.....“ میں نے مٹھی
ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب آراء شہر آ رہا ہے۔ آتا ہی
ہوگا۔ بکسر گزر چکا ہے۔ آراء بھی جنکشن سے ٹھک
ہے، وہاں اتر جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں کوئی بھی
گاڑی مل جائے گی۔“

اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی ورنہ چھوٹی موٹی
تکلیفوں کا تو وہ ذکر ہی نہیں کرتا تھا۔ میرا دل بری
طرح دھڑکنے لگا تھا۔ چلتی گاڑی میں، میں کبھی کیا
سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو گولیاں دی تھیں، اس کی دو
خوراکیں میں دے چکا تھا۔ شاید انہی کا اثر تھا کہ وہ
اب تک کسی قدر آرام سے رہا۔ میں نے وہی
گولیاں نکال کے اسے دیں۔ اس نے کوئی
اعتراض نہیں کیا۔ آدھے گلاس پانی سے نگل لیں۔
سر دبانے کے لیے ڈاکٹر نے مجھے منع کر دیا تھا۔
گولیاں کھا کہ وہ پھر لیٹ گیا۔ میں اپنی نشست پر
پہلو بدلتا رہا۔ مجھے تو اپنی فکر ہی رہتی تھی۔ میں نے
بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بیمار بھی ہو سکتا ہے،
اسے بھی چوٹ لگ سکتی ہے۔ اس دوران گاڑی دو
ایک اسٹیشنوں پر ٹھہری اور کھنڈے ڈبڑھ کھنڈے میں آراء
جنکشن آ گیا۔ میں نے سامان سمیٹ لیا تھا۔ سمیٹا
بھی کیا تھا، صرف ایک بیک ہی کھولا تھا۔ اس کی
آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ
آراء پر اترنے کو آمادہ نہیں ہوا۔ دوا سے شاید اسے
کچھ افاتہ ہوا ہو۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کیا

بات ہے، بتاتے کیوں نہیں؟“ میں نے یہ ظاہر
ناراضی سے کہا۔
”ٹھیک ہے رہے۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں
بولی۔
”میں کہتا ہوں، یہیں اتر جاتے ہیں۔ میری
بات مان لو۔“
”پٹنے پٹنے دیکھیں گے۔“

میری انتہا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی تک
ہی نہیں تھی کہ ہم اور دور جا کے فیض آباد والی گاڑی
پکڑیں۔ میں اس حالت میں اس سے جت بھی نہیں
کر سکتا تھا۔ آراء شہر بھی گزر گیا۔ ہمارے ہمسفر نے
پٹنے پٹنے کا وقت سات بجے بتایا تھا۔ گاڑی آٹھ
سے کچھ پہلے پٹنا شہر میں داخل ہوئی۔ ٹھکل کو میں
نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیار تھا۔ میں
دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ قلی کو فوراً بلا لوں۔ گاڑی
رکتے ہی قلی اندر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ
مغل سرائے کے لیے اب گاڑی کس وقت ملے گی تو
وہ حیرت زدہ ہوا تاہم اس نے بتایا کہ دو گھنٹے بعد
ہاؤس ایکس پریس ادھر سے گزرے گی۔ میں نے
اسے ہدایت کی کہ وہ ہمیں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ
روم میں پہنچا دے۔ ٹھکل منتار ہا تھا۔ جب میں قلی
سے بات کر رہا تھا، وہ کچھ نہیں بولا۔ گاڑی سے اتر
کے اس نے قلی کو اسٹیشن سے باہر چلنے کا حکم دیا۔ میں
اس کی صوت دیکھتا رہ گیا۔

”شہر جانا ہے۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”شہر
کیوں؟ پھر بدوان ہی چلو۔“ کوئی جواب دینے
کے بجائے وہ آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کے گیٹ کی
طرف بڑھتا رہا۔ میری کسی بات کی اس کی نظر میں
کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ مجھے بڑی جھنجھلاہٹ
ہورہی تھی لیکن مجھے اس کے ساتھ ہی چلنے رہنا تھا۔
میں نے چپ سا دھ لیا۔

اسٹیشن کے باہر ایک دوسرے سے پیوست
گیجیوں اور تانگوں کی ایک بڑی تعداد مسافروں کا

منتظر تھی۔ ٹھکل نے مجھے دوائے کو اشارہ کیا اور اسے
گراؤ ہوٹل چلنے کو کہا۔ بھیجی میں ہمارے درمیان
سکوت رہا۔ اچھی رات کی ابتدا تھی۔ شہر کی سڑکیں
صاف ستھری اور روشن تھیں اور خوب چمک چمک تھیں۔
اسٹیشن سے ہوٹل کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بھیجی نے
ہمیں ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ کاؤنٹر پر ہوٹل کے
رجسٹر میں رسمی خانہ پری کے بعد مجھے کمرے کی چابی
مل گئی اور مجھے حیرت ہوئی۔ کمرے میں جانے کے
بجائے ٹھکل کاؤنٹر کے سامنے صوفے پر بیٹھا رہا۔
میں نے غلے کر لیا تھا کہ اب میں اپنی زبان ہی بند
رکھوں گا۔ ہوٹل کے خدمت گار نے ایک کشادہ،
نہایت آرام دہ کمرے میں ہمارا سامان
پہنچایا۔ سامان رکھ کے اور کمرہ منتقل کر کے میں فوراً
ٹھکل کے پاس چلا آیا۔ میرے پہنچنے ہی وہ لہجہ گیا۔
میں نے سنا نہیں تھا۔ اس نے کس وقت بھیجی کو
غصے سے رہنے کے لیے کہا تھا۔ کوچوان کو جب اس
نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا نام بتایا تو میرا ماتھا
ٹھکا اور میں چپ نہ رہ سکا۔ ”اسپتال چار ہے ہو؟“
میں نے سراستہ کی سے کہا۔

”ہاں رہے، دکھا دیں ادھر۔“
”کیا بات ہے؟ کچھ بتاؤ، کیا حال ہے؟“
”دیکھتے ہیں رہے ادھر جا کے۔“
”مجھ سے مت پھپھو۔“ میں نے ہڈیانی انداز
میں کہا۔

”تیرے ساتھ ہی چلتے ہیں۔“
”کیا، کیا بہت زیادہ.....“ میری آواز سینے
گئی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش
رہنے کی تلقین کی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری پرسش یا
دخل اندازی اسے گراں نہ گزر رہی ہو۔ اس موقع پر
مجھے سوال جواب نہیں کرنے چاہئیں۔ میرا دل ہول
رہا تھا۔ ہوٹل سے اسپتال کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ بھیجی کی
رفارست بھی جتنی دیر ہو رہی تھی۔ میری وحشت

بڑھتی جاتی تھی۔ آخر بھیجی ایک بڑے اسپتال کے
سامنے رگ گئی۔ بھیجی سے اتر کے ہم نے خاص
عمارت کا رخ کیا۔ جانے ٹھکل کس طرح چل رہا
ہوگا۔ کچھ وہی جانتا ہوگا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔
وہ اسپتال کی عمارت میں اپنے پیروں سے داخل ہوا
تھا لیکن ظاہر تھا، کسی بڑی تکلیف ہی میں اس نے
سفر ترک کر کے اسپتال کا رخ کیا ہے۔ دواؤں اور
علاج معالجے سے اسے ویسے بھی کچھ سہارا نہیں رہا
تھا۔ اسپتال کے عملے نے ہمیں پختہ عمر کے ایک
جواں ٹھکل ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا۔ کوئی
توقف کے بغیر میں نے اسے جلدی جلدی سارا
واقعہ بتایا اور گزارش کی کہ وہ ہم پر خصوصی توجہ
دے۔ وہ ایک کم گو آدمی تھا۔ عینک لگائے، کچھ
ڈھیلا ڈھالا سا، کسی انگریزی کتاب کے مطالعے
میں مصروف، بے تاثر سا ایک شخص۔ اس نے کچھ
کے بغیر ٹھکل کو ایک گوشے میں رکھے معائنہ بستر پر
لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور سر کے مختلف حصے دبا کے
دیکھے اور کچھ وہی سوال کرنے لگا جو گزشتہ رات
ریٹل کے ڈبے میں اکبر پور کے ڈاکٹر سکین نے کیے
تھے۔ وہ مجھے نو آموز ڈاکٹر لگتا تھا۔ میں نہیں کہنا چاہتا
تھا لیکن میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے صاف کہہ
دیا کہ بہتر ہے، وہ اسپتال کے کسی اور ڈاکٹر کو بلا کے
اس سے مشورہ کرے۔ میری تجویز پر وہ برا فرد خستہ
نہیں ہوا، سر ہلانے لگا۔ ٹھکل بھیجی کے اس نے چہرہ
کو طلب کیا اور کسی ڈاکٹر سری ناٹھ کو بلانے کے لیے
کہا۔

کچھ دیر میں کسی ڈاکٹر کمرے میں جمع ہو چکے
تھے۔ ان میں ایک زیادہ عمر کا تھا۔ ان سب نے
ٹھکل اور مجھ سے سوالوں کی ٹھکرار کی اور ٹھکل کے
باس سے ہٹ کے مشورت کرنے لگے۔ وہ پیش تر
انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ بہت کچھ مجھے بھی
سنائی دے رہا تھا۔ پہلے تو وہ آپس میں الجھتے رہے۔
ان کی رائے تھی کہ ہر کس بڑی چوٹ کے آثار نظر

نہیں آتے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ صبح تک ٹھہل کو اسپتال میں روک لیا جائے۔ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے صبح سویرے اسپتال آ جاتا ہے۔ اس کے آنے تک ٹھہل کو سکون کی دوا میں دئی جاتی رہیں اور رات کسی طور گزاردی جائے۔ ممکن ہے، ایکس رے کی ضرورت پڑے۔ یہ فیصلہ بھی ڈاکٹر رائے ہی کر سکتا ہے۔ ان کا انداز بے حد سرد مہری کا تھا۔ آپس میں صلاح مشورے کے بعد بڑی عمر کا ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہم مریض کو رات بھر کے لیے۔“

مجھے معلوم تھا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے روک دیا اور انگریزی میں پوچھا۔ ”ڈاکٹر رائے اس وقت کیوں نہیں آ سکتے؟“ مجھے انگریزی میں بولنا دیکھ کے ان کے جسم لہرا گئے، آنکھیں پھیل گئیں۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد نرمی سے کہا۔ ”وہ اس وقت گھر پر رہتے ہیں اور مریض دیکھنا پسند نہیں کرتے۔“

”کون سا ڈاکٹر ہے؟“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”مرض گھڑی دیکھتا ہے جو ڈاکٹر گھڑی کا پابند ہے۔ یہ اسپتال بھی رات کو بند کر دیا کریں۔ رات آرام کے لیے ہوتی ہے۔ آپ سارے بھی یہاں کیوں ہیں۔ گھر جا کے آرام کریں۔“

”آپ اطمینان رکھیے۔ ہم رات بھر ان کی خبر گیری کریں گے۔ کوئی ایسی گھبرانے والی بات نہیں معلوم ہوئی۔“ ڈاکٹر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”ہم بردوان چارے تھے۔ بٹنے کے اس اسپتال میں دکھانے کے لیے ہم نے آگے کا سفر ختم کیا۔ ہم کسی امید سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ازراہ کرم آپ ڈاکٹر رائے سے رابطہ کیجیے یا مجھے ان کا پتا بتائیے۔ میں ان کے پاس جا کے منت کرتا ہوں۔ ہم ان کی، جتنی بھی نہیں ہو، ادا کر دیں گے۔“

ڈاکٹر رائے کے کچھ اصول ہیں جناب۔ ”ڈاکٹر نے منافی سے کہا۔“ پھر کسی اور ڈاکٹر کو بلائے کا بندوبست کیجیے۔ کیا اس بڑے شہر میں ڈاکٹر رائے کے سوا کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا، اوروے پیسے کی فکر مت کیجیے۔ کوئی بھی نہیں اور کتنا بھی خرچ ہو۔“ میری درخواست میں درشتی شامل تھی۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر کسی قدر بے چارگی کی کیفیت میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے لگا۔ ”دیکھیے نا؟“ میں نے اس سے کہا۔ ”اسپتال میں کوئی بھی مریض کسی وقت، کسی حالت میں آ سکتا ہے، کیا بس یہاں ڈاکٹر رائے پر انحصار کیا جاتا ہے۔ آپ، آپ، آپ لوگ یہاں پھر کس لیے ہیں؟“ ”یہ ہمیں پیچیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دماغ کا معاملہ ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا ہے۔“ ڈاکٹر کی آواز الجھ رہی تھی۔

”پھر تو اور ضروری ہے۔ آپ یہ کیس صبح پر کیوں ٹال رہے۔ پھر ایک مہربانی کیجیے اس شہر میں، میں اجنبی ہوں، کوئی سواری مجھے فراہم کر دیجیے۔ میں خود ڈاکٹر رائے کے گھر جا کے دہائی دیتا ہوں یا جس ڈاکٹر کو آپ بتائیں جس کے اصول اتنے سخت نہ ہوں۔ جو اپنے پیشے سے انصاف کرتا ہو، جو واقعی ڈاکٹر ہو یا کوئی ایسا ڈاکٹر جو روپے پیسے کو بہت عزیز سمجھتا ہو۔“ میری مدد کیجیے۔ یوں ٹھہرے کھڑے آپ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔“

میرے منہ میں جواب آیا، میں کہتا گیا۔ جی میں تو یہ آتا تھا کہ جب سے چاقو نکال لوں۔ یہ زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری ضرور آئے گی۔

جواب میں عمر رسیدہ ڈاکٹر دیر تک چپ رہا پھر اس نے ایک نوجوان ڈاکٹر سے کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کے پاس جا کے ساری صورت حال بتاؤ ورنہ پھر انہیں ڈاکٹر سمیت کے پاس بھیجنے کا انتظام کرو۔“

ڈاکٹر سمیت اس اسپتال میں نہیں آئیں گے۔ ان کے گھر بنی جانا ہوگا۔ وہ ایک مہربان آدمی ہے لیکن پہلے ڈاکٹر رائے کو دیکھو، شاید وہ..... وہ..... وہ شائے اچکا کے بولا۔

”وہ جیسی آئیں گے جناب! آپ کو معلوم ہے، انہوں نے حتیٰ سے تاکید کی ہے۔ پہلے بھی.....“ نوجوان ڈاکٹر کی آواز نیچھی ہوئی تھی۔

”اچھا ہے، ایک بار انہیں دیکھ لو۔“ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا لہجہ نیم حکمیہ تھا۔ ”بعد کو کوئی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔“

”آپ کہیں تو میں ساتھ چتا ہوں۔“ میں کہنا چاہتا تھا، شاید میری التجا سے ڈاکٹر رائے متاثر ہو جائے۔

”نہیں۔“ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔ ”آپ یہی ٹھہریں اور انتظار کریں۔ سردست ہم مریض کو کچھ دوا میں دیتے ہیں۔“

اس سے اب کوئی اور بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ اس کی ہدایت پر کمرے میں پہلے سے تعینات ڈاکٹر نے ٹھہل کے بازو میں سوئی ٹھوپ دی اور چند گولیاں بھی کھلائیں۔ اس کے اور عمر رسیدہ ڈاکٹر کے سوا باقی ڈاکٹر چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، ہیٹ ٹاک سی خاموشی۔ پھر عمر رسیدہ ڈاکٹر..... نے کرسی پر بیٹھ کے پائپ سلگایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”یہ آپ کے کون ہیں؟“

”کیا بتاؤں۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میرے سب کچھ ہیں، میرے بھائی، دوست میرے بزرگ، میرے دشمن.....“

”آپ کا ان سے کوئی غوثی رشتہ نہیں ہے؟“ ”تمام انسانوں کا ایک دوسرے سے غوثی رشتہ ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ کچھ بے قرار ہوا اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بلکہ آپ نے بڑی جچی

بات کہی ہے۔“ پھر پوچھنے لگا۔ ”آپ لوگوں کا کیا مشغلہ ہے؟“

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ چپکتی آنکھوں سے منتظر تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہماری زمینیں ہیں۔“ زمینوں کا سن کے عموماً دوسرے سوالات نہیں کیے جاتے۔

”آپ زمین دار ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ ”فیض آباد میں آپ کی زمینیں ہیں؟“

”اور کبھی کبھی جگہ.....“ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

اس نے قومی انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔ ”آپ تو خوب تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔“

”انگریزی گولی سے مراد علم یا حکمت نہیں ہے۔“ ”ہاں ہاں۔“ اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”لیکن سمجھا سمجھا ایسا ہی جاتا ہے۔“

”حکمرانوں کے لالچ و لٹکڑ میں ان کی تہذیب بھی ہوتی ہے۔ گوروں کو تو یہاں حکم رانی کرتے ہوئے زمانہ گزر گیا۔“

”بے شک، بے شک، اور یہ بھی تو سچ ہے کہ اب وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کا وقت ہے، کیوں کہ ان کے پاس علم ہے۔“ اس وقت ان باتوں کا کوئی عمل نہیں تھا۔ حکیم ڈاکٹر کو علاج معالجے کے علاوہ کچھ اور بھی جانتا چاہیے۔ اس کی مزید سوالوں سے بچنے کے لیے میں کرسی سے اٹھ گیا اور میں نے ٹھہل کے بستر پر جا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”ٹھیک ہے کچھ؟“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نکھر گئی اور اس نے لمبے بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ”بس اب ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔“ میں نے اس کا شاید چپ تھپاتے ہوئے کہا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ میں نے ٹکے ہاتھ سے اس کے بھرے بال درست کیے اور ڈاکٹر کے پاس

آ کے بیٹھ گیا۔
 ۴ میں آپ کی بے چینی سمجھ رہا ہوں۔ کبھی

مریضوں سے زیادہ ہمیں تہہ داروں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ مشکل یہ ہے، انہیں پرسکون رہنے کی دوائی نہیں دے سکتے۔“ عمر رسیدہ ڈاکٹر مجھے تسلی دینے لگا۔ ”اطمینان رکھیے، آپ صحیح جگہ آ گئے ہیں۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ اسے کیا اندازہ ہو سکتا تھا، مجھ پر یہ دقت کیسے گزر رہا ہے۔ میں تو لمحے گن رہا ہوں۔ کمرے کی دیواری گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا گھنٹا بجایا تو ڈاکٹر نے اپنے بند گچے کے کوٹ سے جیبی گھڑی نکال کے وقت کی تصدیق کی اور نو جوان ڈاکٹر سے بولا۔ ”ہریش کو گئے دیر ہوئی۔ اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے۔“

”ڈاکٹر رائے کا گھر کتنی دور ہے؟“ میں نے تنہی سے پوچھا۔
 ”ایسا دور نہیں، قریب ہی ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں بے چینی بھی تھی، پشیمانی بھی۔ ”کچھ دیر اور دیکھتے ہیں۔“

کچھ دیر اور گزر گئی۔ میری نگاہیں کبھی دروازے کی طرف اٹھتی تھیں کبھی ٹھکل کی طرف۔ اگر ڈاکٹر رائے آمادہ نہ ہوا؟ ٹھکل کی حالت مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس وقت اس اجنبی شہر میں، میں کہاں کہاں، کس کس دروازے پر دستک دوں گا۔ یہ سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا حال یقیناً مجھ جیسا نہیں ہوگا لیکن وہ بھی اب خاصا متفکر معلوم ہوتا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ کمرے میں ٹھلنے لگا، ٹھکل کے پاس بھی گیا اور اسے ایک نظر دیکھ کے پلٹ آیا۔ میں اس سے منت کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر رائے کا مزید انتظار کرنے کے بجائے وہ کوئی اور تدبیر کرے۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے ہمت استوار کی تھی کہ اسی دم کمرے کے باہر سے تیز قدموں کی چاچیں

آئیں۔ نو جوان ڈاکٹر نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”اگر واقعی وہی ہیں تو حیرت ہے؟“ یہ کہتا ہوا وہ ایک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر اس کے باہر کھٹنے سے پہلے ستر سال کے لگ بھگ عمر، اوسط قد کا، بھورے رنگ کی پتلون پر آدھی آستینوں کی پھول دار قمیض پہنے، ٹھٹکی ہوئی سرمئی رنگت کا ایک صحت مند شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے عقب میں نو جوان ڈاکٹر ہریش کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا۔ ”کیا ہوا؟“ ڈاکٹر رائے نے گھردری آواز میں پوچھا۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر نے انگریزی میں مختصر ٹھکل کے مرض کی نوعیت سے آگاہ کیا اور ٹھکل کے بستر کی طرف انگلی اٹھائی۔ ڈاکٹر رائے نے خود بھی مڑ کے دیکھ لیا تھا۔ ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اپنے سر ہانے سرسراٹی آنکھوں پر ٹھکل نے آنکھیں پھول دیں۔

”ڈاکٹر کو کھلے! تم کہہ رہے تھے، تم نے اسے... دی ہے۔“ ڈاکٹر رائے نے کسی دوا کا نام لیا تھا۔ میں پوری طرح نہ سن سکا۔ ”کتنی دیر ہوئی؟“

پہلی بار مجھے علم ہوا کہ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا نام گو کھلے ہے۔ اس نے تنہی سے جواب دیا۔ ”دیر ہوگئی جناب! شاید گھنٹا بھر پہلے۔“

”ایک گھنٹا!“ ڈاکٹر رائے کی تیوری چڑھ گئی۔ ”مگر یہ تو جاگ رہا ہے۔“

”جی، میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر ہم نے اسے پوری خوراک دی تھی۔ یا تو درد شدید ہے یا یہ آدمی اعصاب کا مضبوط ہے۔ یہ اسنے پیروں سے چل کے یہاں آیا تھا جناب!“ ڈاکٹر کو کھلے کی عمر ڈاکٹر رائے کے برابر ہوگئی، ممکن ہے، کچھ زیادہ ہی۔ وہ ڈاکٹر رائے کی جناب میں نہایت مودب تھا اور یہی

حال دوسرے ڈاکٹروں کا تھا۔ وہ تقریباً ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان سب کی نظروں میں ڈاکٹر رائے کی اس قدر منزلت سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ وہ کوئی بڑا ہی ڈاکٹر ہوگا۔ ہر صاحب کمال کے اپنے تیور ہوتے ہیں۔ وہ بھی کچھ الگ قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رائے، بھٹل کے جسم پر جھک گیا اور مختلف زاویوں سے تادیق اس کا سر دبا رہا۔ بھٹل کا چہرہ کھینچا اور کھلتا رہا۔ اس کی کوئی آہ یا کراہ بلند نہیں ہوئی۔ ”کتنا درد ہے؟“ ڈاکٹر نے ہندوستانی میں پوچھا۔

میں رک رک کے کہا۔

ڈاکٹر اس کے سر پہ ٹھونکیں مارنے لگا اور اس نے اپنا کان سر کے قریب کر لیا۔ ”جدھر جاسکتی ہوتا ہے، مجھ کو بولو۔“ ڈاکٹر رائے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا اور پوچھنے لگا۔ ”ابھی پورا سننے میں آتا ہے، میں کسا بولتا ہوں؟“

بھلنے کے چہرے پر ہنسیاں گہری ہوتی تھیں۔
 پہلے ہلکے ہلکے پھر رفتہ رفتہ زور و زور سے۔
 ڈاکٹر نے پورے سر پر ٹھونکیں مارنے کا عمل
 مکمل نے آہستہ سے سر ہلاتا۔

”بولو، کس جگہ یہ زیادہ دکھتا ہے؟“

دیا۔ ”سارا چھتا ہے۔“ ڈاکٹر رائے نے اس کے سر سے ہاتھ ہٹالیا اور آلہ لگنے کے جسم کے مختلف حصوں کا مزہ لیا، بغض و تکلیف، ہونے اٹھا کے دیکھے اور بازو پر پٹی باندھ کے خون کے دوران کا معائنہ کر رہا۔ ”اس کے ساتھ کون ہے؟“ اس نے ادھر ادھر نظر س دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

ایک طرف ہٹ کے مجھے سامنے کیا اور مود بانہ کہا۔
”تو جوان اس کے ساتھ ہے۔“

ڈاکٹر رائے نے مرتایا مجھے گھور کے دیکھا۔
 ”اوہ..... تم؟ تم مریض کا کیا لگتا ہے؟“

وہی سوال! اس کے جواب سے مجھے حقیقت سنا
ہونے لگا تھا۔ میں کسی کو کیا جواب دوں۔ جو رشتے
ناموں اور درجوں سے سوا ہوتے ہیں، کوئی ان کی
تشریح کیا کرے۔ مجھے متذبذب دیکھ کے ڈاکٹر
گوگلے نے میری مشکل آسان کی۔ ”یہ دونوں
بھائی ہیں جناب!“

ڈاکٹر رائے کے ہونٹ پھیل گئے۔ بھل کے سر پہ ہنسی رہتا ہوا وہ کمرے کے وسط میں رکھی میز کی طرف آ گیا۔ میری نظر میں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے یا یہ میرا وہم تھا۔ میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ مجھے تو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ”ہم اس کو ابھی ادھر روکتا ہے۔“ مجھے! ایک رات یہ آہز رویشن میں رہیگا۔ سویرے اس کو پھر دیکھ لیگا۔ مجھ کو ابھی سارا رات بولو۔“ ڈاکٹر رائے نے دو نوک انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے اپنا حلق تر کیا اور شکستہ آواز میں گزشتہ رات کی رو داد سنا کر شروع کی تو ڈاکٹر گھوٹلے نے دھل دیا کہ بہتر ہے، میں ڈاکٹر رائے کو انگریزی میں تفصیل بتاؤں۔ ڈاکٹر رائے بھی میری انگریزی کی دانی پر متعجب ہوا تھا مگر اس نے گھوٹلے کی طرح مجھ سے سوال جواب نہیں کیے۔ میں نے اسے ڈپے میں ڈاکٹر سسکینہ کی آمد، اس کے معائنے، اس کے لکھے ہوئے نسخے اور دوا کے بارے میں بتایا۔ میں کہا کہ نسخے کی دوا میں خریدنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ گولیوں کی تین خوراکیں دے چکا ہوں اور کوئی افاقہ نہیں ہوا ہے۔ جیب سے گولیوں کی پڑیا اور نسخہ نکال کے میں نے اسے پیش کر دیا۔ اس نے غور سے نسخہ پڑھا، گولیاں دیکھیں اور دونوں چیزیں سمجھ لوٹا دیں۔

”دیکھو نو جوان!“ اس نے میرے کندھے

ہاتھ رکھ کے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ کہنے لگا۔
 ”ہم ابھی کچھ نہیں سکتے۔ یہ اندرونی چوٹ ہے۔
 ہمیں بہتری کی امید کرنی چاہیے۔ رات کے لیے ہم
 ایسی دوا میں دے رہے ہیں جو درد بھی کم کر دے گی
 اور مریض کو نیند بھی آجائے گی۔ صبح تک انتظار کرو۔
 ہو سکتا ہے، کچھ دن تمہیں یہاں ٹھہرنا پڑ جائے۔ کیا
 تمہارا لیے یہ ممکن ہے؟“

”میری سب سے بڑی ترجیح ان کا علاج ہے۔“ میری آواز بھرا گئی۔

”ٹھیک ہے۔ یہ لوگ مریض کو ایک آرام دہ کمرے میں منتقل کر دیں گے۔ تم بھی وہیں رہ سکتے ہو۔ رات بھر دقتے دقتے سے ڈاکٹر آتا رہے گا اور مریض پر نگاہ رکھے گا۔ کوئی ایسی دسی بات ہو، درد زیادہ اٹھنے لگے تو تم ڈاکٹر طلب کر سکتے ہو۔ نرس بھی دیکھ بھال کرنی رہے گی۔“

”مناسب ہے جناب!“ میری آواز دھڑک رہی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب!“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”کوئی ایسی بات تو نہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”صبح ہم اور معائنے کریں گے۔ خون کے علاوہ اور کئی ٹیسٹ، ایس رے بھی لیں گے۔ ضرورت پڑی تو دوسرے ڈاکٹروں کو بھی مشورے کے لئے بلایا جاسکتا ہے۔“

”خدا کے لیے کچھ بھیجے ڈاکٹر صاحب!“ میں نے عاجزی کی۔ ”جو بھی، جس طرح کا علاج ہو، اگلے فکرمات بھیجے۔“

”مجھے بتا دیا گیا ہے کہ تمہارے پاس بہت سونا چاندی ہے۔“

”یہ میں نے روپے لیے کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ علاج میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔“ میں نے معذرت کی۔ ”اس کا مطلب سمجھو اور نہیں تھا، اور پھر پھر کس لیے ہوتا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ وہ مسکراتے لگا۔ ”پیسہ بھی کام آتا ہے مگر ہر موقع پر نہیں۔“
 ”بس آپ میری بانی کیجئے جناب!“
 ”ہم اپنی کوشش کریں گے، ہم یہاں اسی لیے ہیں۔“

”مجھے احساس ہے، میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی پھر وہی پیسے کا ذکر آجائے گا لیکن وقت کا کوئی تو مول ہوتا ہے۔ آپ کچھ خیال مت کیجیے۔“

”بعد کو دیکھیں گے۔“ ڈاکٹر رائے آنکھیں چمکاتا ہوا۔

”تم بھی کمرے میں جا کے آرام کرو، ادھر دوسرا بستر بھی ہے اور غصہ نہ کرو۔ تم سے اب صحیح بات ہوگی۔ شب بخیر۔“ اس نے میری طرف سے مڑ کے ڈاکٹر کو کھلے کمرہ گویا نہ لہجے میں کچھ ہدایات دیں اور سیدھا دروازے کی جانب چل پڑا۔

آدھ گھنٹے کے اندر ایک کھلے ہوئے، صاف
مستقرے، ہوا دار اور آراستہ و بیہ راستہ کمرے میں وہ
ہمیں لے آئے۔ ڈاکٹر گو کھلے کے ساتھ دونو جوان
ڈاکٹر بھی آئے تھے۔ انہوں نے مٹھل کو ایک اور
سوئی لگائی اور مختلف قسم کی دوا میں دیں۔ بڑی عمر کی
ایک فربہ اندام، چاق و چوبند نرس ان کی مدد کرتی
رہی۔ کمرے میں کچڑی کے پاس صوفہ لگا ہوا تھا،
کرسیاں بھی تھیں اور مرئیوں سے متعلق ضرورت کی
ہر چیز موجود تھی۔

”قرب بھی ادھر دریا ہے۔“ اپنے کام سے نمٹ کے ڈاکٹر گوگلے میرے شانے پر ہاتھ رکھے مجھے صوفے پر لے آیا اور پوچھنے لگا۔ ”کہئے، کیا سے کہہ کر؟“

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”آپ کی بڑی بہن بانی۔“

”مہربانی میری نہیں، ذاکثر رائے کی ہے۔“ وہ مجھے کمرے کے اوصاف تفصیل سے گنوانے لگا کہ روگرد کے خاص الخاص لوگوں کے لیے یہ کمرے

خصوص ہیں۔ گورے مریشوں کو بھی یہیں ضمیر پایا جاتا ہے۔ یہ خالی رہتے ہیں تو بھی ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ذیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کے لیے لازم ہے کہ ان کمروں میں زیر علاج مریشوں پر خصوصی توجہ دیں۔ یہاں ماہر نرسوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ دریا رخ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑی نرم و لطیف ہوا آتی ہے وغیرہ۔ اسے تعجب تھا کہ ڈاکٹر رائے سے تو میری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے کیا جادو کر دیا کہ اس نے از خود اس کمرے میں ہمیں قیام کی اجازت دے دی ورنہ وہ تو بہت محتاط ہے۔ ڈاکٹر گوٹھلے کو لفظ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ غالباً یہ کہنا اور جتنا چاہتا تھا کہ مریشوں کا حسب نسب، ان کے زور و اثر سے مطمئن ہونے کے بعد ہی انہیں یہاں علاج کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔

میں چپ چاپ سنتا رہا۔ کہنے والے کو کچھ تو احساس ہونا چاہیے کہ سننے والا کتنا تن رہا ہے یا کتنا متوجہ ہے۔ بے موقع کلام بھی یاد ہو گئی ہے اور یادہ گوئی ایک عارضہ ہے اور یہ عارضہ بہت عام ہے۔ لوگ ہر جہ کا حساب رکھتے ہیں۔ یہ حساب کوئی نہیں لگاتا کہ زندگی کا کتنا وقت بے موقع اور غیر ضروری باتوں میں گزر جاتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر گوٹھلے کی باتوں سے جڑ ہو رہی تھی۔ میں ہتھل کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ اسے بستر یہ بے سدھ بڑا دلچسپ کے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا، جسم کی جان جیسے چٹنی جالی ہو۔ مجھے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں ڈاکٹر گوٹھلے کا منہ کس طرح بند کر سکتا تھا۔ میری بے توجہی سے وہ تاراض بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ اگر ساتھ نہ دیتا تو اس وقت ڈاکٹر رائے کی آمد قطعی نا ممکن تھی۔ شاید وہ میری توجہ دینے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سننے والے کی آمادگی کے بغیر شریں بھی فضول ہو گئی ہے۔ اس نے پھر پائپ سگایا۔ لگتا تھا اسے

کوئی کام نہیں ہے۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ میرن آنکھیں تو ہتھل کے بستر پر تکی ہوئی تھیں۔ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اس نے بار بار پائپ سگایا اور جب پائپ کا تمباکو راکھ ہو گیا تو اسے کچھ بے چینی ہوئی۔ مزید تمباکو نوشی کے لیے وہ جیبوں میں پاؤنج ٹول رہا تھا اسے خیال آیا کہ وہ تو پچھلے کمرے میں چھوڑ آیا ہے مجھے بہت کئی دلا سے دے کے کہیں وہ رخصت ہوا اور میں نے دانستہ ہتھل کے بارے میں اس کا قیاس جاننے سے اجتناب کیا کہ اس کے منہ سے بے سوچے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ میں نے اسے کمرے کے باہر تک رخصت کیا۔

اس وقت ایک بج رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی نرس نے آکے کمرے کی روشنی دہی کر دی۔ ہتھل بالکل غافل تھا۔ اس کی سانسوں کا توازن معمول کے مطابق تھا۔ باقی رات میں تین بار نرس آئی اور دو مرتبہ ڈاکٹر نے چکر لگایا۔ انہیں میرے جاگتے رہنے سے کیا پریشانی تھی جو ہر بار آکے وہ مجھے اس طرح سمجھاتے تھے جیسے میں کوئی باگن ہوں یا بچہ ہوں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے نرم گتار نرس نے ہتھل کا معائنہ کر کے مجھ سے مشتاقانہ لہجے میں کچھ دیر کمر ٹکا لینے کو کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کرسی سے اٹھا دیا۔ پھر مجھ سے منع نہ کیا جا سکا۔

میں بستر پہ آکے لیٹ گیا اور اس وقت مجھے محسوس ہوا، میرا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اپنا آپا ہی مجھ سے نہیں ہتھل رہا۔ میں نے جان کے آنکھیں بند کیں کیں کہ کہیں کسی لمحے ہتھل کو میری ضرورت نہ پڑ جائے۔

صبح آٹھ بجے سے منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑوں کی ٹٹلیں درست کر کے میں تیار بیٹھا تھا۔ نرس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے وقت کا بڑا پابند ہے۔ تھک آٹھ بجے اسپتال آ جاتا ہے۔ میرے کپڑے خاصے میلے ہو گئے تھے لیکن سامان ہوٹل میں رکھا ہوا تھا اور وہاں جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

غریب اندام نرس رات کی ذیوٹی سے فارغ ہونے سے پہلے میرے لیے ہلکا ناشتا خود لائی تھی اور سامنے بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے توس پر مکھن لگا کے مجھے پیش کیا تو مجھے زہر مار کا پڑا۔ وہ کم بولتی تھی اور اس کے انداز میں ایسا شفقت آمیز حکم تھا کہ انکار آسان نہیں تھا۔ میں نے چند گھنٹوں میں چائے بھی شتم کر لی۔ نرس کا نام۔۔۔

ایک ٹٹلیں تھکی نام اس نے خود بتایا اور مجھے شرم سار کیا۔ رات سے وہ متعدد بار کمرے میں آچکی تھی اور میں نے نہ اپنا تعارف کرایا نہ اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے ہتھل کی دیکھ بھال میں مستعد رہنے کے لیے مجھے اپنی حالت درست کرنے کی نصیحت کی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اپنے آپ کو باندھے رکھے بغیر میں مریش، (ہتھل) کے کس کس کام آسکتا ہوں۔ وہ مجھ سے اس طرح پیش آرہی تھی جیسے ایک زمانے سے واقف ہو یا جیسے ہتھل کے بجائے میں بیمار ہوں۔ گھر کے کپڑے پہن کے وہ مجھے وداعی سلام کرنے آئی اور ہتھل اور میرے لیے چند دوائی دعا یہ جیلے کہہ کر رخصت ہوئی۔ پھر دروازے سے وہ پلٹی اور کہنے لگی کہ اس کی جگہ دن بھر کے لیے اب نرس سیورین کی ذیوٹی ہے۔ اس نے سیورین کو تاکید کر دی ہے کہ وہ اس کمرے کا خاص خیال رکھے۔ کوئی بھی کام ہو، بے ہتھک اس سے کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک معاون لڑکی ہے۔

نرس ایکی کو گئے ابھی چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ گندمی رنگت، کچھ نقش و نگار، متناسب قد کی دلی تپتی ایک نو عمر نرس نکلتی چھٹکتی کمرے میں آئی اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں صبح بخیر کہا اور مناشی سے ہتھل کے بستر کی ٹٹلیں درست کرنے اور چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ صوفے کے ساتھ والی کھڑکی کا پردہ بھی اس نے کھول دیا۔ کمر روشن ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رائے اب آ رہا ہے

چاہتے ہیں۔ میں ہڑبوا کے کرسی سے اٹھ گیا۔ سیورین نے وہ کرسی بھی دیوار کے ساتھ لگا دی اور جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے واپس چلی گئی۔

میں کمرے میں دے قدموں ٹٹلتا رہا۔ ٹھیک نو بجے ڈاکٹر رائے دو اور ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ان کے پیچھے نرس سیورین بھی تھی اور اسپتال کے مخصوص لباس میں ایک اور شخص بھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے سرسری دیکھا، سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ ہتھل کے پاس جا کے ٹھہر گیا اور ان سب نے ہتھل کا بستر گھیر لیا۔ بائینٹی پر لگی ہوئی رپورٹ دیکھ کے ڈاکٹر رائے نے ہتھل کا شانہ ہلایا۔ اس نے بے مشکل آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے حال پوچھنا چاہا۔ ہتھل دیدے گھما کے رہ گیا۔ اس پر غصہ کی کا شدید غلبہ تھا۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر ایک ڈاکٹر نے ہتھل کی کلائی سے خون کھینچنے کے لیے سوئی پیوست کر دی اور حاصل کیا ہوا خون تیشی میں ہتھل کر دیا۔ اس نے خون کی پھر ایک اور تیشی بھری۔ میں ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر رائے کو اپنے درمیان میری موجودی سے جانے کیا خلل پڑ رہا تھا کہ اس نے مجھے دور صوفے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں نے مجبوراً ہتھل کی۔ وہ سارے ہتھل کے گرد جمع رہے۔ میں اپنے آپ کو جکڑے ہوئے دور بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ میں نے ان کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی لیکن کچھ پلے نہیں پڑا۔ مجھے تو پکڑا رہے تھے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر رائے میری طرف آ گیا اور مجھ سے گزشتہ رات ہتھل کی کیفیت کے متعلق پوچھنے لگا۔ میری آواز ڈول رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ساری رات وہ بے خبر رہا ہے۔ دو ایک بار مجھے اس کی کراہ کا گمان ہوا اور میں نے اٹھ کے اس سے پوچھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھا کیا۔ اس کی آنکھیں سکڑنی اور چمکتی رہیں او

وہ کچھ کہے بغیر نیند میں ڈوب گیا۔

ڈاکٹر رائے سوچنا رہا، پھر اکڑی ہوئی آواز میں بولا: ”ہم اسے امیں رے کے لیے لے جائیں گے۔ وہاں کچھ اور ٹیسٹ بھی لیں گے۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے ناتواابی سے پوچھا۔

”ٹیسٹ کے نتائج کے بعد ہی یقین سے کچھ کہا جاسکتا ہے اور ان کی رپورٹ آنے میں دو دن لگ سکتے ہیں۔“

”ان رپورٹوں میں جلدی نہیں ہو سکتی؟“ بعض کے نتائج فوراً سامنے آجائیں گے لیکن تمام میں دیر ہو سکتی ہے۔“ اس کے سچے میں ڈاکٹر ایک لگ نہیں تھی۔

”میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا۔“

”وہ دن میں صورتحال واضح ہو جائے گی۔“ مجھے گرم سم دیکھ کے وہ کہنے لگا۔ ”تمہیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے اور یہ یقین بھی کہ تم ایک بہتر جا۔ پر ہو۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ میں نے ہمت جمع کر کے کہا۔ ”یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ باقی چیزیں تو ثانوی ہیں، جان ہے زیادہ۔“

ڈاکٹر نے میری بات قطع کر دی۔ ”ہم اپنی کوشش کر رہے ہیں، اپنے امکان بھر۔“

”لیکن میں اپنے امکان سے سوا جاسکتا ہوں اور میرے امکانات محدود نہیں ہیں۔“

لیکن مرے لیے اپنی جگہ ہیں اور ان کے لیے برداشت چاہیے کسی اور چیز سے زیادہ۔“ ڈاکٹر رائے کے سچے کی نفی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! مجھے معلوم نہیں، آپ سے یہ کہنا مناسب ہے یا نہیں مگر ازراہ گرم، اس سے بہتر کوئی صورت، کوئی اور جگہ ہو تو مجھے بتائیے۔ اس شہر میں یا کہیں اور نکلتے، پہنچی، ولی، میں کہیں بھی

جاسکتا ہوں، ہندوستان سے باہر بھی۔“

”اب اس کا وقت نہیں ہے۔ اس سے بہتر جگہیں بنیاد بنے شمار ہیں لیکن مریض کی حالت فی الحال اصرار سے اصرار منتقل کرنے کی نہیں۔“ وہ کسی قدر بے اعتنائی سے بولا۔ ”بہر حال، تم جو چاہو، فیصلہ کر سکتے ہو۔ ذمے داری، ظاہر ہے، تمہاری ہوگی۔“

”میرا مطلب غلط نہ سمجھو۔ میرا مقصد مریض سے اپنے تعلق کا اظہار ہے۔ میری جان، میں جانتا ہوں، کسی کام کی نہیں لیکن ثانوی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں اور بہت سے لوگ تو انہیں جان سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ میرے لیے میرا مریض ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ آپ بڑے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کے مشوروں کے بغیر میں کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا بلکہ اس وقت تو مجھ میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میرا حال سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے آگے۔“

”دیکھو تو جوان! اب ہم پر پھوڑ دو، جہاں جاؤ گے، یہی کچھ ہوگا۔ انہی مسئلوں سے گزار کے کوئی رائے قائم کی جائے گی۔ ایلو پیتھی طلب کا اپنا ایک منظم طریق کار ہے۔“

میں چپ ہو گیا۔ اتنی دیر میں ٹھنڈ کا ہسٹر گھیرے ہوئے ڈاکٹر رائے کے ماتحت اس کے پاس سے ہٹ چکے تھے۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بازو چڑ کے مجھے حوصلے اور اعتماد کی یقین کی اور کمرے سے چلا گیا۔

باہر اسے رخصت کر کے نرس سیورین کمرے میں واپس آگئی اور اس نے مجھے ٹھنڈ کی بیبیوں میں رکھی ہوئی چیزیں تھیل میں لینے کی تاکید کی۔ ٹھنڈ کو امیں رے کے لیے لے جانے سے قبل انہیں اسے اسپتال کا رسمی لباس پہنانا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی پھول رہے تھے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ نرس یہ کام خود کرے لیکن مجھے

خیال آیا کہ ٹھنڈ کی جیب میں چاقو بھی ہوگا۔ اسے کرتے کے نیچے بنیان کی جگہ ہلکی بندھی پہننے کی عادت ہے۔ ہو سکتا ہے، کوئی اور ہتھیار بھی اس کے پاس ہو۔ سیورین کو جلدی تھی مگر وہ سامنے کھڑی نہیں آ سکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں مجھے جامد تلاش کا یہ اذیت ناک ٹریڈ انجم دینا چاہیے تھا۔ میں نے ناوقت سہی مگر چائے کی خواہش ظاہر کی تو وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ ٹھنڈ کے ہسٹر پہ پہنچ کے اس کی بیبیوں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے میں نے اسے آہستہ سے پکارا۔ اس کے پیٹوں میں کھلبلاہٹ ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بے ربطی سے اسے بتایا کہ مجھے اس کی بیبیوں خالی کرنی ہیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ہو پیدا ہوئے۔ معلوم نہیں، اس نے کچھ سمجھا کہ نہیں۔ سیورین کسی لمحے واپس آ سکتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی باہر سے کپڑے ٹنول کے پہلے چاقو نکالنا چاہا۔ چاقو کرتے کی جیب ہی میں تھا۔ میں نے اسے واسکٹ کی جیب میں محفوظ کیا اور گریبان کے بن کھول کے بندھی دیکھیں۔ بندھی کی دونوں بیبیوں میں ٹنولوں کی دو گڈیاں تھیں۔ کوئی اور ہتھیار کسی جیب میں نہیں تھا۔ کپڑوں میں اور جیبیں بھی تھیں لیکن مختلف مالیات کے ٹنولوں کے علاوہ مجھے کچھ اور نہیں ملا۔ کرتے کی جیب میں چاقو کے ساتھ چند سکے بھی پڑے ہوئے تھے۔ سیورین کو باہر گئے صحت دومنت ہوئے ہوں گے کہ واپس آگئی اور اس نے نیچے کے نیچے رکھی ہوئی واسکٹ نکال کے مجھے دی۔ اپنی بدحواسی میں مجھے اس واسکٹ کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ رات کس وقت نرس ایکی یا کسی اور نے یہ واسکٹ اتاری تھی۔ حالاں کہ میں تو رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ اس سے پہلے والے کمرے میں ڈاکٹروں نے ٹھنڈ کے جسم کا معائنہ کرتے ہوئے

واسکٹ کے دونوں پہن کھول دے تھے۔ اسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے شاید، انہی مجھے واسکٹ کے بارے میں بتانا بھول گئی۔

سیورین سے واسکٹ لے کے میں صوفے پر آ گیا۔ اس کی مختلف بیبیوں میں بھی سوٹ کیس کی چابیوں کے علاوہ خاصے بیسے تھے۔ بیسے کے حصے کی اندرونی بیبیوں اندرونی بن سے بند تھیں۔ وائس طرف کی جیب کا بن کھولنے پر میری انگلی میں ریشمی ڈوری آگئی۔ ڈوری کا ایک حصہ بن سے لپٹا ہوا تھا، اسے کھینچنے پر دوسرے حصے سے ٹھنڈی بان کے بڑے کی شکل کی مختصر سی عموالی ٹکلی تھیلیا برآمد ہوئی۔ تھیلیا کے سکرے ہوئے مشہرہ رزوری سے گرہ لگی ہوئی تھی اور آسانی سے نہیں کھل سکتی تھی۔ اس احتیاط سے ظاہر تھا کہ اندر کوئی قیمتی چیز موجود ہے۔ وہ بہرے ہی ہو سکتے تھے۔ نٹو لے سے کچھ بیبی اندازہ ہوتا تھا۔ تھیلیا میں روٹی بھری تھی۔ روٹی کی تہوں میں بہرے پیچھے ہوئے گمے جواہیوں پر ان کی طرح کی تختی محسوس نہیں ہوتی تھی اور تھیلیا گر جانے پر بیوروں کے ٹونے کا امکان رہا تھا۔ بن سے لپٹی ڈوری گھمانے پر تھیلیا آڑو رہ گئی۔ میں نے اسے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

نرس سیورین کے پیچھے اسپتال کے دو کارکن بھی کمرے میں آگئے تھے۔ سیورین نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں نے بیبیوں کی اچھی طرح تلاش لی ہے۔ نرسیتا بلند آواز کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میرے اقرار کے رد آدی گواہ رہیں۔ دونوں کارکنوں نے اسپتال کا لباس پہنانے کے لیے ٹھنڈ کے جسم پر لمبی چادر ڈال دی۔ نرس سیورین باہر چلی گئی۔ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سیورین کے پیچھے میں بھی باہر نکل آیا۔ کارکن، ٹھنڈ کا پہیوں والا پلنگ باہر لے آئے تو میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ ان کی رفتار معتدل تھی لیکن میری ناہمیں ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ وہ زیادہ

میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔
”بھائیوں میں ایسی بیگانگت دیکھ کے خوشی ہوتی ہے۔ میری دعا ہے، خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کرے۔“ اس کے منہ میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

نرس ایبی صحیح کہہ رہی تھی۔ سیورین ایک شہادت، جھگڑت اور غم گسار لڑکی تھی۔ وہ نرس تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ خوش صورتی یہ خوش سیرتی متراود خوبی ہے۔ اس کی انگریزی گوئی میں نفاست، سلاست اور روانی تھی۔ دیکھی آواز میں کام کرنے کے باوجود آواز ہلکتی تھی، کہنے لگی۔ ”آپ کوتاہی کی ضرورت ہے تو میں کمرے کے باہر سرائبان میں بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ یہاں آرام کیجئے۔“

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

مصنف: ایم۔ اے۔ راحت
5 سے زائد

اس انسان کی کہانی جو صحت یاب ہو رہی ہے
اور شاید آج بھی کہیں موجود ہو

قیمت سیٹ - 330 روپے

مشقی خیرہ ماہانہ لکھنؤ کے ہر خانہ میں ملے گی

کتابیات پبلکیشنز
فون: 021-5804300
74200 کراچی
http://www.kitabiat.com

”انہوں نے مسلسل مریض پر نگاہ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔“
”آپ، آپ کیا سمجھتی ہیں؟“
”میں صرف ایک نرس ہوں۔“ وہ افسار سے بولی۔
”ہاں۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”مگر آپ کا تجربہ بھی ہو گا۔“

”میرا کیا تجربہ؟“ وہ شرماسی گئی اور کہنے لگی۔ ”ڈاکٹر رائے مریض کے معالج ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار اور پاکمال ڈاکٹر ہیں۔ دور دور سے بیمار انہیں دکھانے آتے ہیں۔“

”مگر انہوں نے.....“ میں نے اپنی زبان سے کہا۔ ”آپ کو انہوں نے مستطاف یہاں معین کیا ہے تو کوئی، کوئی بات تو ضرور.....“ میری آواز گھٹے میں رہ گئی۔

”نہیں نہیں، ایسا مت سوچیے۔“ اس نے بہ شدت تردید کی۔ ”ان کمروں میں مستقل طور پر نرسیں مقرر کر دی جاتی ہیں اگر مریض اور اس کے پرمان حال درخواست کریں۔ کیا آپ نے ڈاکٹر رائے سے خصوصی نگہ داری کی درخواست کی تھی؟“
”جی، جی ہاں۔“ مجھے اس کی صراحت سے طمانیت ہوئی۔ ”میں نے کئی بار ان سے یہ التجا کی ہے۔“

سیورین کے چہرے سے بھی محکد دور ہوا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں۔“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”دقیض آباد سے۔“ میں نے مختصر آواز سے اکبر پور کے امین کے حادثے کے بارے میں بتایا۔
”یہ آپ کے کون ہیں؟“

مجھے اس سوال کی توقع تھی۔ میں نے کسی توقف کے بغیر کہا۔ ”یہ میرے بھائی ہیں۔“ اس کے چہرے پر چمک سی پیدا ہوئی۔ ”اور، اور آپ ان سے بہت قریب ہیں۔“ وہ پتلیں بچہ کا کے بولی۔

ہوں۔
آدھ گھنٹا گزرا یا اس سے زیادہ۔ ایکس رے کے کمرے کا دروازہ کھلنے کے انتظار میں میری آنکھیں پتھرائے گئی تھیں، دروازہ کھلا تو چند قدموں کا فاصلہ میں نے بھاگ کے طے کیا۔ ابھی وہ باہر نہیں نکلے تھے کہ میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے پوچھا۔ ”کیا ہے، سب ٹھیک تو ہے؟“

اسپتال کا کارندہ مسکراتے لگا اور ہم دروازہ کھچے میں بولا۔ ”ابھی کیا بولیں بھیا صاحب! دھیر دھیر رکھو۔ پہلے رپورٹ سنے گا پھر ڈاکٹر دیکھنے گا۔ وہی ٹھیک سے بتائے گا۔“ اس نے مجھے سانسے سے ہٹ جانے کو کہا۔

وہ ٹھکل کو داہیں کمرے میں لے گئے اور یہاں والی جگہ پر لوہے کا پلنگ پھیلا کر دو جانے لگے تو میں نے جب سے چند نوٹ نکال کے ان کی نذر کرنا چاہیے۔ وہ تو اپنے گھبرائے جیسے میرے ہاتھ میں نوٹ نہ ہوں، پچھو ہوں۔ دونوں نے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر کہنے لگے، ہاں جب مریض صحت مند ہو کے یہاں سے رخصت ہونے مضامین کھانا دست بھولے گا۔

ٹھکل کے جسم پر چادر ڈھکی ہوئی تھی اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ جانے انہوں نے کون سی دوا لی تھی کہ وہ اب تک بے خود بڑا ہوا تھا۔ میں کرسی صبح کے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں سیورین آگئی۔ وہ کچھ فراغت میں نظر آتی تھی۔ میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور شعلی سے بولی۔ ”سنو ایکی بتا رہی تھی۔ آپ رات بھر ایک بلے کے لیے نہیں سو پائے ہیں۔ بہتر ہو گا، اب آپ آرام کر لیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔ ڈاکٹر رائے نے میری ڈیوٹی صرف اسی کمرے تک محدود کر دی ہے۔“

”آپ کی کچھ بات ہوئی ڈاکٹر صاحب سے؟“ میں نے اضطرابی آواز میں پوچھا۔ ”کہہ دیتے تھے؟“

دور نہیں گئے اسپتال کی خاص عمارت میں داخلے کے دروازے کے قریب ہی ان کی منزل تھی۔ انہوں نے مجھے دروازے پر روک دیا۔ میں نے ان سے جھٹ کی کہ یہ آپریشن کا کمرہ تو نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایکس رے کے کمرے میں بھی مریض کے لیے حاضر باش شخص کا داخلہ ممنوع ہے۔ ناچار مجھے باہر ہی رہنا پڑا۔ ٹھکل کو اندر لے جا کے انہوں نے دروازہ بھی بند کر لیا۔

اسپتال میں مریضوں اور ان کے متعلقین کی تعداد اس وقت ابھی خاصی تھی۔ مجھ سے ٹھیک طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہیں دیوار کے پاس تھی ہوئی کرسیوں میں ایک کرسی خالی ہوئی تو میں نے جلدی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دیر کے لیے میں آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا۔ دماغ میں چالے پڑے ہوئے تھے مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں اور کیا کر سکتا ہوں؟ میری استطلاعات میں اور کہا ہے؟ مجھ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی؟ جانے ڈاکٹر کیا فیصلہ صادر کرے۔ اب سب کچھ اسی پر ہے۔

ہم دونوں اسی کے ٹھکنے میں ہیں۔ اگر اس نے زیادہ دن رکھنے کو کہا تو میں اکیلا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یہی بہتر ہے کہ مجھے کسی کو بلا لینا چاہیے۔ ابا جان کو تاروں یا جاسو کو مطلع کروں یا زریں کو بلا لوں۔ جیسے ہی تار ملے گا، وہ پہلی گاڑی سے آ جائے گی۔ ٹھکل کی صبح نگہداشت وہی کر سکتی ہے۔ اس کے آنے سے مجھے بھی آسرا ہو جائے گا۔ اس میں وہ برداشت اور حوصلہ ہے، ڈاکٹر رائے جس کی تعلیم مجھے دے رہا تھا۔ ٹھکل بھی زریں کو پاس دیکھ کے بہت مطمئن ہو گا۔ اچھے بیمار دار بھی علاج میں کارگر ہوتے ہیں۔ میرا تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں یوں بھی ایک ناکارہ آدمی ہوں۔ ایسے وقت میرے مناس تو منتشر ہو جاتے ہیں۔ مجھے کچھ دکھائی سمجھائی نہیں دیتا۔ میں اکیلا کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا

”مجھے بند نہیں آ رہی۔“ میں نے پشمرنگی سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے ٹھیک ڈیزہ بجے گھر جاتے ہیں۔ ایک بجے کے قریب شاید وہ یہاں آ جائیں۔“ بھر شام کو پانچ سے سات تک اسپتال میں رہتے ہیں۔ ابھی ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ ایک بجتے ہیں پورے ڈھائی گھنٹے ہیں۔ اس دوران گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آپ آرام کر لیں تو مناسب ہوگا۔“

”میرے تو مجھے یہ لباس تبدیل کرنا چاہیے۔“ میں نے شش و پنج سے کہا۔ ”مجھے کچھ تاریکی دینے ہیں۔“

”آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟“

میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات اسپیشن سے ہم گرائڈ ہوئے میں کمر محفوظ کرانے گئے تھے۔ سامان رکھ کے فوراً یہاں آ گئے۔ پھر ہوئے واپس جانا ممکن نہ ہو سکا۔ ہوئے والے بھی کیا کہتے ہوں گے۔ ”گرائڈ ہوئے ایسا دور نہیں ہے۔“ اس نے جتنی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کے آنے تک آپ واپس آ سکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے لیکن.....“ میں کہنا چاہتا تھا کہ میرا دل نہیں چاہتا۔

”لیکن کیا.....؟“ وہ جیس سے بولی۔ مجھ سے جواب نہ دیا جاسکا۔

”شاید آپ کا دل نہیں مانتا لیکن آپ اتنی دیر میں اپنا کچھ کام بھی کر لیں گے۔ آپ کے ذہن پر کم از کم یہ باتیں رہے گا۔ میں یہاں ہوں۔“ اس نے کسی حد تک انتہائی انداز میں مشورہ دیا۔

”میں کتنی دیر میں واپس آ سکتا ہوں؟“

”ڈیزہ دو گھنٹے میں آپ اطمینان سے واپس آ سکتے ہیں۔ اسپتال کے باہر آپ کو سواری مل جائے گی۔ اسے ساتھ ہی رکھیے۔“

ٹھٹھل کے سر ہانے جا کے میں نے ایک نظر

اسے دیکھا۔ اس کی غفلت جاری تھی۔ کچھ دیر اس کش کش میں گزر گئی۔ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ سیورین کے چہرے پر چھایا ہوا ثبات دیکھ کے میں نے غم کر لیا۔ لاؤنج عبور کر کے میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ سیورین کی آواز آئی۔ اس نے کاغذ کا ایک بڑا ٹھیکسایرے حوالے کیا۔ میں نے کھول کے دیکھا، اس میں اتارے ہوئے ٹھٹھل کے کپڑے رکھے تھے۔ اسپتال کے باہر ہی مجھے ٹانگا مل گیا۔ دن پوری طرح جاگ چکا تھا۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ ٹانگے کی رفتار بھیڑی کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی۔ کئی بار جی میں آئی کہ واپس چلوں لیکن ٹانگا ہوئے کا فاصلہ کم کرتا رہا اور جلد ہی ہوئے پہنچا دیا۔ رات کا عملہ بدل چکا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی طلب کی تو کابینہ پر کھڑے خوش پوش، خوش اطوار نو جوان نے جنس نظروں سے مجھے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ میں نے اسے سرسری بتایا کہ میرے ساتھی کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے سامان ہوئے میں رکھ کے ہمیں اسپتال جانا پڑا۔ رات وہیں گزری۔ اس نے تاسف کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اب ساتھی کا کیا حال ہے؟ میں نے بتایا کہ انہیں اسپتال میں روک لیا گیا ہے۔ جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دے، ہم وہیں رہیں گے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے اور میں صرف لباس تبدیل کرنے آیا ہوں۔ وہ فکر مند ہونے لگا کہ یہ ہوئے خاصا مہنگا ہے۔ اس طرح تو مجھ پر بے جا مصارف کا بوجھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ اسپتال میں کوئی شناسا نہیں ہے۔ اب جو بھی ہو۔ وہ ایک شریف انٹنس نو جوان تھا۔ میرے متح کرنے کے باوجود مجھے ہوئے کے پختہ کار لیکن چست و مستعد فیر کے پاس لے گیا اور اسے ساری روداد سنائی۔ فیر بھی خاصا معقول آدمی تھا۔ پہلے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے پیش کش کی کہ مجھے کوئی عارضہ نہ ہو تو ایک دو روز کے لیے وہ میرا سامان محفوظ کرنے کا بندوبست کر سکتا ہے۔ جب

بھی ضرورت پڑے، میں ہوئے آ کے اپنا سامان کھول سکتا ہوں۔ اسپتال میں خدا نہ کرے، زیادہ دن ٹھہرنے کی صورت میں کسی اور تدبیر پر غور کریں گے۔ میں اس کے شہر اور اس کے ہوئے میں مہمان ہوں اور مجھ پر اچانک یہ افتاد آ پڑی ہے۔ سو وہ اپنی بساط بھر مجھ سے یہی سلوک کر سکتا ہے۔ اسپتال کیے بغیر کمرے کا گراں کر ایدہ ادا کرنا کہاں تک درست ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میرے جواب سے وہ جزبہ بھی ہوا، متعجب بھی۔ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ زیادہ تسلی کی بات ہوگی کہ میں کمرہ اپنے پاس ہی رکھوں۔ ڈاکٹر بھی مرض کی نوعیت جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو ایک دن میں ساری صورت حال واضح ہو جائے گی۔ فیر مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ میری عدم موجودگی میں انہیں ڈاکٹر نہ آ جائے۔ وہ خاموش ہو گیا اور اس نے کرسی سے اٹھ کے مجھے رخصت کیا۔ ٹھٹھل کی صحت پانی کے لیے دعا کی اور کہا کہ ہوئے کے علاوہ بھی کوئی کام ہو تو میں بے تکلف اس سے کہہ سکتا ہوں۔ میں نے گزارش کی کہ میں اپنے اعزاء کو تازہ بخیر رہا ہوں اور ہوئے کا پتا دے رہا ہوں۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے اس نے پرتاک انداز میں یقین دلایا کہ جیسے ہی میرا کوئی خط یا موصول ہوا، وہ کسی تاخیر کے بغیر اسپتال پہنچا دے گا۔

کمرے میں سامان اسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں رات میں نے چھوڑا تھا۔ بیک کھولنے پر توشہ دان نظر آیا۔ کھانا اب تو خراب ہو چکا ہوگا۔ خدمت گار کو بلا کے میں نے توشہ دان اس کے سپرد کیا کہ اسے خالی کر کے واپس کمرے میں رکھ دے۔ دس روپے کی بخشش پر اس نے جھک کر سلام کیا اور کوئی اور خدمت بخالانے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ وہ چلا گیا تو ایک بیک خالی کر کے میں نے اس میں ٹھٹھل

کچھ سیٹھی ریزر، صابن، برش، پھنکری کی ڈلی، منجن، کچھ سیٹھی، آئینہ، رمال اور اپنا بھی کچھ یہی سامان اور اپنا اور ٹھٹھل کا ایک ایک جوڑا رکھا۔ ہوئے میں کپڑوں کی دھلائی اور استری کا اہتمام تھا لیکن استری میں دیر لگتی۔ کپڑوں پر ایسی ٹکائیں بھی نہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اسپتال میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی مکمل موجود تھا۔ میں نے اپنا ٹھٹھل بھی رکھ لیا اور حفظ ماتقدم کے طور پر بھینگی کے بینک میں جمع کرنا بھی کی عطیہ رقم کی چیک بک بھی بینک میں ڈال دی۔ منہ ہاتھ دھو کے کپڑے بدلنے کا ارادہ تھا۔ ٹھٹھل خانے میں آ کے چپ چپاٹ کا احساس ہوا۔ نہانا کیا، بس جسم بھگایا اور خشک کر لیا اور خاصی تازہ دمی محسوس ہوئی۔ ملے کپڑوں کی جیبیں خالی کرتے ہوئے اپنی واسکٹ کی چمکی جیب میں چری ہو ا دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ بڑا بہت نرم و بھوس تراش خراش کا اور بالکل نیا تھا اور نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سفر میں کئی بار جیب بھاری بھاری لگی تھی لیکن اس یقین سے میں نے ایسی توجہ نہیں دی تھی کہ زریں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہ اسی طرح چونکا کئی اور اپنی قدر و منزلت فزوں کرتی ہے، اسی نے کوئی چیز رنجی ہوگی، کسی جگہ ٹھہرنے پر اطمینان سے دیکھوں گا۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ نوٹوں سے بھرا ہوا ہوا ہو سکتا ہے۔ میری واسکٹ میں، ٹھٹھل کی واسکٹ سے نکالی ہوئی نوٹوں کی دو گڈیاں بھی تھیں، انہیں سوٹ کیس میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا تھا اور اتنی رقم مستقل ساتھ رکھنی بھی حماقت معلوم ہوتی تھی۔ بہروں کی تھیلیاں... کا تو کوئی وزن ہی نہیں تھا۔ غلت کے خیال سے نہ میں نے اس کی گرہ کھولی نہ اپنے پاس موجود رقم گننے اور مالیت کا اندازہ لگانے میں وقت ضائع کیا جس طرح بیرونی کی ٹھلی تھیلیاں اور روپے پرانی واسکٹ کی جیبوں میں رکھے ہوئے تھے، اسی ترتیب سے نئی واسکٹ کی جیبوں میں رکھ لیے۔ ٹھٹھل کا چاقو اس

کے میں نے خود سے دور کیا اور دروازے کی جانب
دوڑ لگی۔ دوسرا عمارت سے نکلے کے دائیں طرف
مڑ گیا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کا پیچھا کیا۔
کاش میں اس پر لعنت بھیج کے تعاقب چھوڑ دیتا۔ وہ
بے تحاشا ہمتا ہوا پہلی گلی میں مڑ گیا اور اس سے
پہلے کہ میں اس کے سر پر پہنچوں، اسے جیب سے
چاقو نکالنے اور چشم زدنی میں کھولنے کا موقع مل گیا۔
میرا دماغ الٹ گیا تھا میں اندھا ہو گیا تھا۔
مجھے فی الفور وہاں سے واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ اس
کی پھسکی سے خون کھولنے لگا۔ میں نے بھی پھر اپنی
رفتار درست کی اور پھیر گیا۔ وہ چاقو کھاتا رہا۔ آہستہ
قدموں سے میں نے اس کے قریب ہوتا شروع
کیا۔ مجھے نہتا اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے اسے
ہراساں نہیں تو متوجس ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ چکا تھا،
ایک نظر میں اس کا تھپتھپ ہونا تھا کہ چاقو سے اس کی
نسبت کس قدر ہے اور وہ کتنی دیر کھلے والا ہے۔
بند رہنے اپنی جانب میری پیش قدمی سے غیر ارادی
طور پر وہ پیچھے ہٹا۔ کئی میں اتنی تنگنا نہیں تھی۔ یقیناً
اپنے پاس چاقو کی موجودگی سے برتری کا کوئی
احساس اس پر غالب ہوا۔ وہ ہچکچاہٹ دیتا ہوا میری
طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ چاقو مارنے کے
بجائے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے گا۔
میں نے ایک قدم بڑھ کے فاصلہ دور کم کیا۔ چاقو والا
ہاتھ بڑھانے میں اس کا داخل وتر دو لازم تھا۔ میں
اس کے خاصا قریب ہو چکا تھا اور اسے میرے
دماغی توازن پر شبہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں
اختیار کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے ہچکچاتے
ہوئے پھر چاقو بڑھایا۔ میں تیزی سے دائیں پہلو
ہوا پھر بائیں۔ تین چار بار اس عمل کی تکرار سے
اسے متذہب کرنا مقصود تھا۔ وہ ابھی اس طرف
ہاتھ بڑھاتا بھی اس طرف۔ میں نے اسے مزید
آزمائش سے دوچار نہیں کیا، ایک بار مجھے دائیں
طرف ہوتا دیکھ کے اس نے اسی جانب ہاتھ بڑھایا

تھا کہ میں بیک دم پیچھ گیا اور اسی لمحے اٹھا تو اس کے
چاقو والے ہاتھ کی کھالی میرے پیچھے میں تھی۔ یہ
خرابہ میں نے پہلے بھی کسی جگہ اعتبار کیا تھا اور نتیجہ
اچھا ہی نکلا تھا۔ ساتھ ہی میں نے دوسرے ہاتھ
سے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ وہ بہت زور سے
چینا اور ہلبلہانے لگا۔ چاقو اس کی انگلیوں کی گرفت
میں قائم نہ رہ سکا۔ اسے پھر میں نے پھٹکنے کی فرصت
نہیں دی۔ اس کی گردن اور پسلیوں پر پے در پے
ضربیں لگائیں۔ وہ دہرا ہوا گیا اور ادھ مواہو کے
پیٹ پکڑے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اب مزاحمت
کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے آسانی سے
اس کے کرتے کی جیب سے اپنا ہوا نکال لیا۔ میری
جیب میں کھلے روپے بھی تھے وہ بھی میرے ہاتھ
میں آ گئے۔ میرا وزنی چاقو جیب کی جہ میں پڑا ہوا
تھا اس لیے انگلیاں چاقو تک نہ پہنچ سکیں اور اسے
میری جیب میں چاقو ہونے کا گمان بھی نہ ہوگا۔
اس سے ششے میں چند منٹ ہی لگے ہوں گے۔
تین چار زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ اس دوران
ان کی میں کئی راہ گیر جمع ہو چکے تھے۔ جیب کترے
کی چیخوں اور کراہوں سے آنے سانسے کے
مکانات کے دروازوں کی آڑ اور کھڑکیوں سے
عورتیں اور بچے بھی جھانکنے لگے تھے اور شور گونجنے
لگا تھا۔ کوئی راہ گیر قریب نہیں آیا۔ انہوں نے
درمیان میں پڑا چاقو دیکھ لیا تھا۔
میں نے شکستہ حال نو جوان کا چاقو زمین سے
نہیں اٹھایا۔ اس سے ششے میں گوساری توجہ مرکوز
رہی تھی لیکن میں اس کے دوسرے ساٹھی سے بھی
غافل نہیں رہا تھا۔ ڈاک خانے میں نار فام پر
کراسے کے لیے مجھ سے انتظار کرنے والا پہلا شخص
یقیناً اسی کا ساٹھی تھا۔ جیب کترے عموماً تنہا نہیں
ہوتے، یہی ہوا۔ میں جلد سے جلد کئی سے نکل جانا
چاہتا تھا۔ ابھی میں مزے مزے ہوئے نو جوان کو
ٹھوکر مار کے پلٹا ہی تھا کہ ڈاک خانے کی سڑک

سے دو آدمی دیوانہ وار گلی میں نمودار ہوئے۔ دونوں
نیچے تھے۔ کئی میں داخل ہوتے ہی انہوں نے مجھے
آنے دیکھا تو ٹھٹھک کے رک گئے۔ راہ گیر اور
حاشائی، کھن گھناتا شور اور کچھ فاصلے پر اپنے ساٹھی
کے حال سے سارا ماجر انہیں کچھ جانا چاہیے تھا۔
سامنے کھلا چاقو بھی پڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک
دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ صیویں میں
ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیے اور زبردستی ہونے
بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ایک کی توقع کر رہا تھا۔ وہ
دو تھے۔ ان کی آمد میں اتنی دیر کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی
تھی۔ یا تو انہیں اپنے ساٹھی کے فرار کی سمت کا علم
نہیں تھا یا پھر تیسرے ساٹھی کو اطلاع دینے اور اسے
ساتھ لانے میں کچھ دقت صرف ہوا۔ میرے لیے
مفر کی ایک بھی صورت تھی کہ سڑک پر جانے کے
بجائے میں کئی میں مخالف سمت بھاگنے کوں مگر آگے
کئی کی طول عرض کا بھی مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے
اب وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنا ہے،
دقت تیزی سے گزر رہا ہے اور وہ مجھے اس طرح
جانے نہیں دیں گے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں ان
سے بات کرنے کی ایک کوشش کروں۔ وہ مان
چائیں تو ٹھیک ہے۔ میں ہوا ان کے حوالے
کروں گا یا پھر ان سے مذہبیز۔ انہوں نے مجھے
زنج ہو جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چاقو لہراتے، چیخ
پکار کرتے ہوئے میری طرف بڑھ چکے تھے۔ ان
میں ایک تیس سال کے قریب تھا، دوسرے کی عمر تیس
بائیس سال ہوگی۔ یہ وہی نو جوان تھا جس نے
ڈاک خانے میں مجھے پہلے روکا تھا۔
میں اپنی جلد پھیر گیا اور میں نے دونوں ہاتھ
اٹھا دیے اور باند آواز سے کہا "بھیرو، بھیرو، میری
بات سنو۔" میری صدا کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ وہ پھیر
کے تو میں نے مفاہمتا لہجے میں کہا۔ "میری بات
دھیان سے سن لو۔ میں دہراؤں گا نہیں۔ میں
تمہارے شہر میں اچھی ہوں میرا ایک عزیز اسپتال

میں ہے۔ مجھے جلد اس کے پاس پہنچنا ہے۔ تم
لوگوں سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہارے
ساتھی نے مجھ سے زیادتی کی تھی اسی لیے مجھے اس
کے پیچھے بھاگنا پڑا، اس نے چاقو نکال لیا۔ مجھے
اسے بتانا پڑا کہ کئی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہتھیار
ایسے ہی ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ کوئی اور دقت ہوتا تو
میں تمہیں بھی دیکھ لینا لیکن میں نے تم سے کہا ہے،
میرے پاس دقت نہیں ہے۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے
وہ ہوا میں تمہارے حوالے کر دوں گا جو تمہارے
ساتھی نے میری جیب سے نکالا تھا۔ تم لوگ میرے
راستے سے ہٹ جاؤ، کچھ غلط مت سمجھنا۔ تم ایک
ساتھی کو دیکھ رہے ہو۔ چاقو کا کھیل اچھا نہیں ہوتا۔
کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں
ہوگی۔ تمہیں پیسا چاہیے۔ وہ میں تمہیں دے دیتا
ہوں۔ مجھے فوراً جواب دو۔"
"پورا ای کا بڑ بڑ کرتے ہیں۔" جواب میں
زیادہ عمر کے آدمی نے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے
نخوت سے کہا۔ اس نے چاقو ہوا میں اچھالا اور
مہارت سے اسے اچک لیا۔ ہوا نکالنے کے لیے
میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ وہ تیزی سے
میری طرف چھپتا۔ میں ہوا نکال چکا تھا لیکن اس
کے تیزاچھے نہیں تھے۔ بشرے ہی سے وہ ایک شورہ
پشت آدمی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے کی جلد کھردری،
چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ٹھک
پیشانی، تیل میں چمکتے بال اور جھج میں مانگ لگی
ہوئی، دانتوں پر پالوں کی جہ، ناک، ہونٹ اور
دائیں طرف کے گال پر چاقو کے نشانات، دبا ہوا
قد، کھٹا ہوا صہ، بکیر والی مونچھ۔ اپنا ہاتھ کھلا رکھنے
کے لیے مجھے ہوا دو بارہ جیب میں ڈالنا پڑا۔
دونوں مجھ سے چند منٹ کے فاصلے پر آ کے رک گئے
اور ہاتھ پھیلائے، جسم منکارتے پتھر کاتے ہوئے وار
کرنے کا تاثر دیتے رہے۔ "ہم کا، کا کچھ ہو ہوا!
ہم، ہم کا بھیک منگا دکھائی پڑت ہے؟" زیادہ عمر

والے نے دھککارنے والے انداز میں کہا۔

میرے منہ پہ آیا، کہوں کے چوری سے اچھی بھیک ہوتی ہے۔ میں خاموش رہا۔ بخت میں وقت اور ضائع ہوتا۔ بڑے کی چاقو پر دست رس معلوم ہوتی تھی، چھوٹا تو آموز نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی آواز دہیسی رکھی۔ ”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم ہمارے (آدی) بچے کا ہے ہاتھ اٹھائے؟“ اس کو مارا ہو، ہاں! وہ گرنے کے بولا۔

”اور اس نے کچھ نہیں کیا؟“ اس کی ذہنائی پر میرا سر جھٹکنے لگا۔

”کیسی ٹھوڑے میدان استاد راج کرت ہیں۔ دوسرا کوئی حکم نہ تھا ہے۔ ہم تم کا ہٹائے دے کہ جو اس سر میدان استاد کا آدی ہے ہاتھ اٹھائے تو سمجھو، وہ اس دھڑی پٹائی ہے۔“

”دیکھو استاد!“ میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایسا ہے تو میں پھر آ جاؤں گا۔ تم سے وعدہ ہے۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ میں تمہارے میدان استاد کے پاس بھی آ جاؤں گا۔ مجھ سے اس وقت مت الجھو مجھے کیوں نہیں۔“

”ہم سارا بھت ہیں۔ تم کا لوکا پٹھا کھائی بڑت ہیں ہم؟ تم کا ایسا نہیں چھوڑ دوں۔ ابھی سبک بڑھائے دیت ہیں۔“ میری خاموشی پر وہ زہریلی آواز میں بولا۔ ”تم کا چپ کا ہے گی ہے؟“ ”تم مجھے آدی نہیں لگتے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ اس کے چہرے پر کسی نقش تھے۔ جی میں آتا تھا، زندگی بھر یاد رہ جائے والا کوئی نقش میں بھی خبیث کردوں۔ آئینے کی طرف بھی منہ نہ کر پائے۔

”ابھی تم سول آٹھک بھت ہو۔ ہم اپنا میدان استاد کا نمبر ایک پالتو ہے۔ سمجھا کہ نہیں۔ اس کا پنا اپنی گردن میں ہے۔“ وہ جو منہ میں آیا، بکھتا رہا۔ کوئی بات کہہ کہ وہ ارد گرد کھڑے تماشا بینوں کی طرف راو طلب نظروں سے دیکھتا جیسے انہیں کچھ جتنا چاہتا ہو۔ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن

اب ان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری ہر اسد عا ہے اثر ہے گی۔ ان سے ایسے جھکا نہیں لے گا لیکن مجھے پہل کر کے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری خاموشی نے بڑی عمر والے کا اضطراب اور ہمبہز کیا۔ اس نے اپنے کم عمر ساتھی کو کوئی اشارہ کیا اور کچا پانی آواز میں بولا۔ ”ابھی تم کا مچا بڑائے کے استاد کا دربار میں لیے جاہت ہیں۔ اس کے آگے ماتھا گڑنا اور دکھنا بھی دینا۔“ دونوں نے ہاتھ پھیلائے دو قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔

میں نے اپنی جگہ سے جھپٹ نہیں کی۔ وہ مجھ سے اور قریب ہو گئے۔ بڑی عمر والا چاقو بھی اس ہاتھ سے لپٹا بھی اس ہاتھ میں۔ مخالف پر اپنی ہنرمندی کی دھاک بٹھانے کے لیے یہ ایک عام اور سوڑ شیو کا اظہار ہے۔ اصل میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک چاقو پھینکنے میں ہاتھوں کے درمیان فاصلہ اور پھرتی پر بہت کچھ منحصر ہے، لکنا فاصلہ اور کیسی پھرتی۔ پھرتی سے مراد تکرار کی تیزی و تیز رفتاری ہے۔ بعض مشتاق کا ایک ہاتھ چاقو پھینکتا ہے تو دوسرا ہاتھ بے اختیار اسی سمت اٹھتا ہے اور نگاہ کا اس عمل میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہاتھ شین بن جاتے ہیں مگر صرف یہی ہنرمندی نہیں۔ یہ کوئی داؤ نہیں، ایک طرف کی بازی گری ہے۔ چاقو پر گرفت ایک خونی ہے، دوسری خونی چاقو اور نگاہ، چاقو اور داغ، چاقو اور بل کا ٹال میل یا توازن ہے۔ موقع مل کے اعتبار سے مہارت آزمائی جانی ہے۔ ضرورت پر مرحلہ در مرحلہ۔ پہلے ہی مرحلے پر اسے جوہریاں نہیں کر دیے جاتے۔ پھل تو نیت کی بھی بات کرنا ہے۔ اس کا کہنا ہے، نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اور کہنا ہے، چاقو بھی اٹھانا چاہیے جب ذہن صاف، آلودہ نہ ہو، کوئی مقصد ہو، بے مقصدی نہ ہو اور تب جب کوئی چارہ نہ ہو۔

میری جانب سے کوئی مزاحمت نہ کچھ کے بڑی

عمر والے کا گڑا ہوا چہرہ اور گڑ گیا۔ اپنے آئینہ اقدام کے بارے میں اسے کش کش سے دوچار ہو جانا چاہیے تھا۔ میں اسے بت کی طرح دیکھتا رہا۔ اس کا ساتھی اس سے بڑھ گڑ کی دوری پر تر جھا کھڑا تھا، پر تو لے ہوئے۔ زیادہ عمر کا آدی ایک قدم اور بڑھ آیا۔ میرا خیال تھا، وہ میری جیبوں میں ہاتھ ڈال سکتا ہے لیکن وہ سیٹا آدی تھا۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے کسی قدر جھپکاتے ہوئے اپنا خالی ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہمارے درمیان اب گڑ بھری دوری رہ گئی تھی۔ اس نے میری ٹھوڑی پکڑی، پہلے آہستہ، پھر تیز ٹھوڑی پر کس دیا اور ناخن گز دوپے اور چاقو بردار ہاتھ اٹھا کے چاقو کی دھار میری ناک پر پھیری، پھر کان پر اور گالوں پر۔ میں نے اپنا جسم بند کیے رکھا۔ مجھ پر لمحہ لمحہ پہاڑی طرح گراں تھا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ دور کر کے میرے منہ پر زور سے مکا مارا۔ دوسرا، پھر تیسرا۔

میں نے سوچا، اس میں کہیں بھی ہوئی غیرت دعیت اجاگر کرنے کی ایک کوشش کیوں نہ کروں۔ اس سے کہوں کہ وہ دو ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں چاقو ہیں۔ ایسے میں، میں کیا اپنا دفاع کر سکتا ہوں۔ بہت ممکن ہے، لوگ ارد گرد موجود ہیں، وہ کسی خیار یا غرے میں آجائے اور ہو سکتا ہے، اپنے ساتھی کو پیچھے ہٹا کے اس کا چاقو بھی میرے حوالے کر دے۔ یہ تیر طوالت انگیز ہو سکتی تھی۔ ان دونوں پر اعتماد بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کا تعلق اڈے سے واجبی معلوم ہوتا تھا۔ چاقو تو ہر کوئی چلانا سیکھ لیتا ہے مگر چاقو بازوں کے اپنے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ کم عمر جو ان سے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ اس جلد باز کے سر میں کس وقت کیا ساجائے اور میرے اس مطالبے میں دعوے کا پہلو دکھاتا تھا۔ میرے بارے میں ان کا لاطم رہنا ہی بہتر تھا حالانکہ ان کا ایک ساتھی ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا اس کی خست

حالی میری شد بد کی شہادت تھی۔ کسی شہدہ کاری ہی سے جلد نجات ممکن تھی۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد عواقب و نتائج پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ بڑی عمر والے کے کئے کی چوٹی ضرب بھی میں نے برداشت کر لی۔ میں بے حس و حرکت رہا۔ پھر جیسے ہی اس نے پانچویں کئے کے لیے ہاتھ اٹھایا، اس کی ضرب سے بچنے کے لیے میں مخالف سمت کسی قدر جھکتا ہوا مڑ گیا۔ چار مرتبہ کے تجربے کے بعد اسے یقین ہو گا کہ میں اسی طرح سہکتا کھڑا ہوں گا۔ جھک کے مڑتے ہوئے میں نے جی جی صدا بلند کی اور اچھل پڑا۔ یہ غیر متوقع جیج اسے مزید منتشر کرنے کے لیے تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا چکا تھا اور اس کی ساری توجہ پانچویں ضرب لگانے پر مرکوز تھی۔ آنا فنا بیک وقت میرے بھٹنے، مڑنے، اچھلنے اور جیج مارنے پر لا زار پانا اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹانے نہ ہٹانے میں اسے تذبذب و تردد ہوتا چاہیے تھا۔ مجھے ضرب کی پروا نہیں تھی کہ یہ چہرے کے بجائے جسم کے کسی حصے پر لگتی ہے۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بھی شعوری، غیر شعوری طور پر متحرک ہوا۔ میں نے بھی کچھ طے کر کے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔

مڑ جانے سے اس کا چاقو والا ہاتھ پوری طرح میری نظروں اور میرے وجود کی نظروں میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور میری ذرا سی چوک سے کہیں بھی پیوست ہو سکتا تھا۔ ادھر سے اضطراب کے عالم میں اس کا چاقو والا ہاتھ مجھے نشانہ لینے کے لیے قریب ہوا، ادھر میرے دونوں ہاتھ اسے روکنے کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ اس صورت میں اسے خود کو سنبھالنے یا سانس استوار کر کے کچھ سمجھنے کے لیے چاقو والا ہاتھ، بظہری طور پر پیچھے بھی کرنا چاہیے تھا۔ اس پر یہ بھان طاری نہ ہوتا تو بھی میں تو اپنے ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ پلک پھپکنے کی مدت میں میرے دونوں بچوں کی گرفت

میں اس کی کلائی تھی۔ مجھے اب فوراً دوبارہ اچھل کے اور ذرا سی ڈھیل دے کے اس کے ہاتھ کو بھڑکا دینا تھا۔ میں نے کوئی لمحہ صانع نہیں کیا۔ میرے اچھلنے اور بھڑکا دے کے جسم کا سارا وزن، سارا زور ڈالنے سے بازو اکھڑ جانا چاہیے تھا۔

یہی ہوا۔ اس کی کرب ناک چیخ دور تک گونگی ہوئی۔ چا تو پھر اس کے ہاتھ میں برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ پیر پٹنے لگا۔ میں اسے مزید بے قابو کرنے کے لیے کسی تاخیر کے بغیر ضربیں لگانا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا، اس کا کم عمر سا بچہ چا تو سیدھا کیے میری طرف بڑھ چکا ہے۔ وہ گھوم کے میری پشت پر دار کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس یہی راستہ تھا کہ جیسے تیسے میں اس کے پختہ کار سا بچے سے دست بردار ہو سکے اب اس سے بچنے کی راہ ڈھونڈوں۔

اس پر نوٹ پڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میرے پاس کھینچنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ نو جوان اپنی جھونک میں تیزی سے بڑھ چکا تھا۔ گو مجھے اس کے سا بچے کو چند ایک آزمودہ ضربوں سے بے حال کر کے اس کی طرف ہی پلٹنا پڑا اس کی دیوار بھی پٹنا تھی۔ ظاہر ہے، وہ ہاتھ پیر پیارے تماشا تو نہیں دیکھتا رہتا۔ اپنے سا بچے کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی طور تو اسے اختیار کرنا تھا اور جواب میں مجھے یہی کرنا تھا کہ اس کے سا بچے کو ڈھال بنائے رکھوں اور اس کی پس پانی تک مسلسل ضربیں لگاتا ہوں۔ نو جوان نے بڑی جلدی کی۔ اسے ابھی ہتھیار ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ پھسل کے بقول، گھوڑے کی طرح نو مشتقوں سے ہتھیار بدلتا رہتا ہے۔ میں نے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے سا بچے کو سامنے سے بٹانے کی پوری کوشش کی تھی۔ نو جوان چا تو بردار خود کو تھام نہ سکا۔ وہ اندھا دھند پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ اس کا چا تو اپنے سا بچے کی پہلی میں پوسٹ ہوا۔ پہلی کی رعایت بھی اس سبب سے ممکن ہوئی کہ میں اسے نشانے سے بٹانے میں کس حد تک

کام یاب رہا تھا اور نہ چا تو اس کے پیٹ میں کھب جاتا۔

راہ گیروں اور دروازوں، کھڑکیوں پر کھڑی عورتیں اور بچوں کی سہ کاریاں نکل گئیں۔ نو جوان اس ناگہانی، نادیدنی سے ہکا بکارہ گیا۔ میں اسے سکتے کی اس لٹائی کیفیت سے درچار چھوڑ کے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اور دیوانہ ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اسی حالت میں اس کے بال پکڑ کے اسے کئی ضربیں لگائی۔ وہ خود بھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہوگا۔ ایسے عمدے میں، آدمی کو اپنے خواں کھودینے، خود سے بے نیاز ہو جانے کی ایک طلب ہوئی ہے۔ اس نے کوئی مدافعت نہیں کی جیسے سڑک کے طور پر یہ ضربیں کھا رہا ہو۔ پھر وہ پکڑا کے زمین پر گر گیا۔

میں نے اپنے کپڑے بھاڑے اور ایک نظر لوگوں کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی میرے قریب نہیں پھٹکا بلکہ انہوں نے نظریں جھکا دیں۔ بھاگتا ہلے تھا۔ تیز قدموں سے میں نے سڑک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ دفعہ شورا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ راہ گیر زخمی نو جوان کو اس حالت میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ خون نے اسے سرخ کر دیا ہوگا۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ تعاقب کرنا تو آہٹ ضرور ہوتی۔ مگر سے نکل کے میں ڈاک خانے والی چوڑی سڑک پر آ گیا۔ کوچون ناگہانے لیے ڈاک خانے کی عمارت کے پہلو میں بہ حواس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگا کہ فریٹ تو ہے۔ میں ڈاک خانے سے اس آدمی کے پیچھے کیوں بھاگا تھا۔ کہنے لگا کہ تانگے میں میرا بیک رکھا ہوا تھا۔ وہ تانگا چھوڑ کے گلی میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اسے کیا کچھ بتاتا۔ میرا تو سرخ رہا تھا۔ میں نے اس سے جلد سے جلد اسپتال پہنچنے کی درخواست کی۔ جیسے ہی میں تانگے پر سوار ہوا، گلی سے چند آدمی بھاگتے ہوئے سڑک پر آتے دکھائی دیے۔ سڑک پہ

آکے انہوں نے خود کو روکا اور بولائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کسی کو نہ لگا نظر آگیا۔ اسی شخص نے میری جانب سب کو متوجہ کیا۔ کوچوان نے تاہنگ چلا دیا تھا۔ کوئی بھی تانگے کے پیچھے نہیں بھاگا۔ میں دیکھتا رہا۔ وہ انگلیاں اٹھا کے ایک دوسرے کو میری طرف اشارے کر رہے تھے۔ آگے کچھ فاصلے پر سڑک گھوم گئی اس لیے وہ سارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سڑک پر اب بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی۔ دھوپ میں بھی خاصی تیزی تھی۔ کچھ ایسا وقت نہیں گزرا تھا۔ زیادہ سے زیادہ چندرہ میں منٹ اوپر ہوئے ہوں گے۔ گھڑی یوں وقت کا مستند پیمانہ ہے لیکن کس پر کب کیا وقت گزرتا ہے، اس کا شمار کون کرے۔ وقت سب پر یکساں نہیں گزرتا سو ہر ایک کے لیے پیمانے بھی جدا ہوتے چاہئیں۔ اسپتال دور تھا اور بھیڑ کی وجہ سے تانگے کی رفتار متاثر ہو رہی تھی۔ اگر وہ تینوں واقعی اوڈے سے متعلق آدمی تھے تو اوڈے کے دیگر آدمیوں کو کسی وقت بھی خبر ہو سکتی تھی۔ بری خبر بے طرح پھیل گئی ہے۔ لوگوں کو اس کی جتنو بھی بہت ہوتی ہے۔ میں نے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ یہ ان کا شہر ہے۔ میری تلاش میں اوڈے کے آدمی شہر کا کوئی اسپتال نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اپنے سر سے تمام اندیشے جھٹکنے چاہے۔ بعد کی بات بعد کی ہے۔ اس وقت تو مجھے کسی طرح اسپتال پہنچنا چاہیے۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ اس برس سپورین کے کہنے پر اتنے کم وقت میں مجھے ہول کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہ جانے ٹھہل کا کیا حال ہو گا؟ ڈاکٹر رائے کمرے میں نہ آگیا ہو۔ مجھے وہاں نہ دیکھ کے کیا سوچے گا؟

میں بہتر نظر آتا تھا کہ تانگے سے اتر کر سڑک پر بھاگنا شروع کر دوں۔ اس طرح تانگے سے جلدی اسپتال پہنچ سکتا ہوں مگر لوگ ایک آدمی کو بھاگتا دیکھ کے پاگل ہی سمجھیں گے۔ سڑک پر بہت سے

سائیکل سوار تھے۔ کاش کوئی سائیکل ہی مل جاتی۔ بھیڑ میں سائیکل گزارنے کی جگہ جلد مل جاتی ہے۔ کیوں نہ تانگے سے اتر کے کسی سائیکل سوار سے اٹھا کر دوں کہ وہ مجھے کیر پر پہنھا کے اسپتال پہنچا دے یا کسی موٹر والے کو روکوں۔ یوں یوں کوئی سائیکل سوار بھی گزر رہی تھیں۔ شاید کوئی میرا ہاتھ پکڑے۔ میں اسے منہ مانگے معاوضے کی پیشکش کروں گا۔ معاوضے کا سن کے وہ تاراض تو ہو گا لیکن اس طرح اسے میری منت گزاری کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ کوچوان بھی میری پریشانی سمجھ رہا تھا۔ وہ بھی گھوڑے کو چابک مارا، اسی لگام کھینچتا، طرح طرح آوازیں نکالتا اور گالیاں بکاتا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے جتن کر رہا تھا۔ اس کا بس چلنا تو آگے چلنے والی گاڑیوں کے اوپر سے تانگہ گزار کے آگے لے جاتا۔

ڈاک خانے سے چلے چندرہ منٹ کے قریب ہوئے ہوں گے۔ تانگے نے ابھی بہت کم فاصلہ طے کیا تھا کہ مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا مگر سینوں کی گونج واضح تھی۔ پولیس کی سیٹی کی آواز الگ ہوتی ہے۔ میں نے مضطربانہ اپنی نشست سے اٹھل کے دیکھا اور میری آنکھیں دھندلانے لگیں۔ دور خاصے فاصلے پر سائیکلوں پر سوار کئی پولیس والے مجھے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ سادہ لباس میں چند لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں بھی تیز رفتاری سے سائیکلیں دوڑانے کے لیے راستہ صاف کیوں مل رہا تھا۔ مسلسل سیٹیاں بجانے کا مقصد رکاوٹ بننے والے راہ گیروں اور سوار یوں کو ایک طرف سٹ جانے اور راستہ ریتے کی تاکید کرنا ہی ہو گا۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ ویسے بھی کنارے ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی تنک بھٹک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خوش گمانی کی کہ شاید انہیں میری تلاش نہ ہو، مجھے خاطر جمع رہنی چاہیے اور اگر انہیں میری ہی تلاش ہے تو مجھے اپنے اوسان بجا رکھنے کی ضرورت ہے۔ میری

جگہ کوئی بھی ہونا تو یہی کچھ کرتا۔ مجھے ساری صورت حال ان کے گوش گزار کر دینی چاہیے کہ میں نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ میں نے ان سرکشوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی اور چاقو نکال لیے۔ میرے ہاتھ میں تو چاقو بھی نہیں تھا۔ اس نے دیکھا ہے کہ بڑی عمر کا نو جوان اپنے ساتھی کی ہادانی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن..... لیکن کوئی سنے بھی تو! وہ پولیس کے آدمی ہیں اور پولیس پہلے پولیس ہوتی ہے، بعد آدمی۔ میں تو یوں بھی شہر میں اچھی ہوں۔ وہ مجھے روک لیں گے۔ میں کئی ہی دہائیاں دوں، وہ تفتیش حال کے بغیر مجھے جانے نہیں دیں گے۔ انہیں خانہ پری کی عادت ہوئی ہے، اس کی روزی کھاتے ہیں۔ پھر وہ تھا نا، سوال و جواب، حوالات..... میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرے گواہ بہت سے ہیں لیکن صفائیاں اور گواہیاں پیش کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ سارے گواہ اسی شہر کے ہیں اور یہ استاد میدا کے زور و اثر کا علاقہ ہے۔ اس کے آدمیوں کے خلاف گواہی دینے کی جرأت کوئی کس طرح کر سکے گا۔ کئی میں بھی وہ سارے سہمے ہوئے کھڑے تھے اور انہی نے پولیس کو تانگے اور اس کی سمت کی نشان دہی کی ہوئی۔

طرح طرح کے سودے میرے سر میں منڈ لارہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف گھاس لکٹی تھیں۔ بس یہی کچھ میں آتا تھا کہ تانگے سے کسی گلی میں داخل ہو جاؤں۔ ممکن ہے، ابھی ان کی نظر تانگے پر نہ پڑی ہو۔ درمیان میں سوار یوں کی نفس و حرکت سے کئی بار وہ بھی میری نظروں سے گم ہو گئے تھے۔ شش دہچکا کا دقت نہیں تھا۔ مجھے جلد ہی کچھ طے کرنا تھا۔ میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کے اگلی نشست پر بیٹھے کوچوان کی طرف پھینکے۔ اس سے کچھ کہنے سننے میں دقت اور ضائع ہوتا۔

ابھی پولیس دور تھی اور سڑک کے مختصر گھاؤ سے تاہنگ پولیس سے اوجھل ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ ایک مناسب موقع تھا۔ بیک ہسپتال کے میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور واقع گلی میں داخل ہو گیا۔ دس بارہ قدم تک میری رفتار تیز تھی۔ مجھے جلد سے جلد خاص سڑک سے دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس خیال سے کھلی کے راہ گیر میری اس تیزی سے شہے میں پڑ سکتے ہیں، میں نے رفتار کم کی۔ کئی دور تک سیدھ میں جاتی تھی اور ایک پھولنے سے چوراہے سے دائیں بائیں گلیاں نکلتی تھیں۔ دائیں طرف کی گلی سے اسپتال کا فاصلہ کم ہونے کا امکان تھا۔ احتیاطاً میں نے مخالف گلی کا رخ کیا۔ ایک اور گلی میں مڑ جانے سے اب میں پولیس کو خاص سڑک سے لکھنے والی سیدھی گلی میں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

یہ مسلمانوں کا کوئی قدیم محلہ تھا۔ دونوں اطراف مسلمانوں کی خاص طرز تعمیر کے حامل اونچے نیچے، چھوٹے بڑے مکانات بنے ہوئے تھے، پیش تر پرانے۔ جہاں بھی موڑ آتا، میں اسی گلی میں مڑ جاتا۔ اندر دھڑ دھڑچ گیاں تھیں، کہیں ٹنگ، کہیں کشادہ۔ لگتا تھا، ایک دودن پہلے نالیاں صاف کی گئی ہیں۔ نالیوں سے نکالی ہوئی سیاہ مچڑ اور کوڑے کے ڈھیر جگہ جگہ بڑے ہوئے تھے اور ہر طرف کوئی پوی بسی ہوئی تھی، کھانا کھنے اور کوڑے کرکٹ سے اٹھتی ملی جلی ہو۔ سروس کے نیل کی بوان میں غالب تھی۔ اقامتی علاقوں کی گلیوں میں عموماً ایک دوسرے سے واقف لوگوں کی آمد و رفت راقی ہے۔ فقیر اور پھیری والے بھی شناسا ہوتے ہیں۔ گلیوں میں کھینٹے ہوئے نیچے، در پچوں اور دردناکوں سے چھانکتی عورتیں اور برا، کیر مجھے ہنس نظروں سے دیکھتے تھے۔ یوں منہ اٹھائے کئی کئی گھوٹنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے مجھے کسی جگہ بھیر کے کسی کا بتا دیا تھا۔ میں کس کا نام لیتا۔

میرے ہوش و حواس ہی ہلکا کئے نہیں تھے۔ ایک جگہ آگے جا کے کئی بند ہو گئی تھی۔ اتفاقی سے وہاں مسجد بنانا تھا۔ مجھے سر جھکانے والی آواز آئی۔ کسی نے مجھے نوک نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ سے بہت غفلت ہوئی۔ اندازاً میں خاص سڑک سے خاصی دور آ گیا تھا لیکن اب بھی متفوق نہیں تھا، متعدد راہ کیروں نے مجھے دیکھا تھا۔ پولیس اس کئی میں آگے جہاں اسے داخل ہوا تھا، کسی کو میرا حال ہیبتا کے میری سمت کے بارے میں معلومات کر سکتی تھی۔ مگر مجھے اپنی جیسی کوشش کرتے رہنا چاہیے تھا۔ میں ایک کئی سے دوسری کئی میں چکر کھاتا رہا۔

کئیوں میں لکڑی کی ٹالوں، چونے کے بھٹوں کے علاوہ پرچوں فروشوں اور دیگر گھریلو ضروریات کی چھوٹی موٹی دکانیں قائم تھیں۔ مجھے دیکھ کے دکھاندار اور خریدار کچھ کہتے نہیں تو چونکتے ضرور تھے اور ان کی نیکی بھی لگا ہیں مجھے اپنے جسم پر کانٹوں کی طرح چھتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک خالی دکان دار نے مجھے آواز دے کے روک لیا۔ میں سنی ان سنی کر کے نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہ اور مشکوک ہو جاتا۔ وہ پوچھنے لگا کہ تجھے کسی کی تلاش ہے اور میں کون ہوں۔ مجھے نام بتانے میں جھجک ہوئی پھر میری زبان پر بے اختیار مولوی صاحب کا نام آیا۔ اس نے جمرانی کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ وہ اس محلے کے ہر کہیں سے واقف ہے۔ کسی مولوی محمد شفیق کا نام اس نے آج تک نہیں سنا اور پوچھنے لگا کہ آخر کس نے تجھے اس محلے میں مولوی صاحب کے قیام کے بارے میں رو نمائی کی ہے۔ میں نے کہا کسی نے بھی نہیں، مجھے تو پینا شہر کے بارے میں کسی نے بتایا تھا۔ مجھے ٹھیک پتا نہیں معلوم، سو میں مسلمانوں کے محلوں میں جا بجا انہیں تلاش کر رہا ہوں۔ میرے جواب سے اس کی میری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی جزئیات نہیں، دوسروں کے معاملات میں ناگاہ اڑانے والا شخص تھا، سوال پر سوال کرنے لگا۔ میری بے ربطی پر اس نے مجھے خطا الحواس سمجھا یا کچھ اور۔ مجھے سمجھانے لگا کہ بہتر ہے، وقت ضائع کرنے کے بجائے میں کسی اور محلے کا رخ کروں۔ کئی میں آگے جانے کے بجائے میں اس کی ہدایت پر محل کا تاثر دیتا ہوا وہاں سے لوٹ آیا۔

میری ناکیں جواب دینے لگی تھیں۔ خاصا وقت گزر گیا تھا۔ اتنی دیر میں پولیس دور چلی گئی ہوگی۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ پولیس کے ہاتھ پڑ جانے کے بعد اپنی دست و پائی کا مجھے ابھی طرح احساس تھا۔ مجھے خیال آیا، ہول بھی ڈاک خانے سے قریب تھا۔ جس مقام سے میں کئی میں داخل ہوا تھا، وہاں سے اور قریب ہونا چاہیے۔ ہول کے منبر اور کاؤنٹر پر تعینات نو جوان نے مجھ سے بڑی ہم دردی کی تھی۔ شاید وہی اس وقت میری کچھ مدد کریں۔ پولیس ہول کی طرف نہیں جائے گی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ میں گراؤ ہوئی میں نصیرا ہوا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں شہدوں، انہجوں نے ہول سے نکلتے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا ہو اور ڈاک خانے میں چلایا ہو لیکن کچھ تو ہول میں جانے کا خطرہ تو مجھے مول لینا چاہیے۔ وہاں سے ضرور کوئی راہ نکلے گی۔ یہ سوچ کے میں نے واپس سڑک پر جانے کا قصد کیا اور واپسی کا راستہ کہیں کھو گیا۔ میں اندازے سے چلتا رہا اور طلتے چلتے ایک کھلی جگہ پر آ گیا۔ سامنے لوہے کے جھنگے کی فصیل کے اندر اونچے اونچے درختوں سے گھرا ہوا ایک بڑا باغیچہ تھا۔ باغیچے کے چاروں طرف بڑے مکانات کا سلسلہ تھا اور ایک جانب مسجد بنی ہوئی تھی۔ موزن ظہر کی اذان دے رہا تھا۔ گویا ایک بج رہا تھا۔ ڈاکٹر رائے کمرے میں آچکا ہوگا۔ ترس میو رین نے بتایا تھا کہ وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ مجھے نہ پا کے جانے اس نے کیا سمجھا ہو۔ وہ محل کے بارے میں مجھے کیا بتانا چاہتا ہو۔ میرے تو اب ہاتھ پیر نوٹے جاتے تھے۔ بس یہی جی کرتا تھا کہ وہیں ڈھیر

میں مٹی نمایاں ہو گئی تھی اور وہ بڑے ہوئے لگتے تھے۔ اطراف میں کنارے کنارے لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی بیٹھیں نصب تھیں۔ اندر خاصا سناٹا تھا۔ اب ایک قدم بھی چلنا دشوار ہو رہا تھا کچھ دیر خود کو استوار کرنے کے لیے میں ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور چند لمحوں بعد ہی اٹھ گیا کہ میں کسی طور اس غفلت کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ باغیچے کی دوسری جانب نکلنے ہوئے میں نے خود کو سرزنش کی کہ میں کب تک یوں بے سرو پا پھرتا رہوں گا۔ مجھے کوئی پروا کہے بغیر یا تو کسی سے راستہ پوچھ کے اسپتال کا رخ کرنا چاہیے یا پھر پولیس کے سامنے خود کو پیش کر دینا چاہیے اور اس سے بہتر ہے کہ مجھے نکلنے میں جامو کا ایک اور تار دینا چاہیے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائے۔ پہلے مجھے قریب ترین جگہ، گراؤ ہوئی بیٹھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے خود تار دینے کا موقع نہ مل سکا تو ہوئی والے یہ کام کر سکتے ہیں۔ یکا یک میرے دماغ میں شرارہ سا کوندا۔ کیوں نہ میں کسی راہ میرے استاد امیداکے اڈے کا پتا پوچھوں۔ یہی میں اس طرح کئی اڈے میرے قبضے میں آگئے تھے۔ میں براہ راست استاد امیداکے پاس جا کے اڈے کی چوکی کا دعو کر رہا ہوں۔ اڈوں کی روایت یہی ہے کہ چالو اور زور آزمائی سے دعوے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے، فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ اتنا تو مجھے خود پر اعتماد ہے۔ تحمل بھی مجھ پر یہ اعتماد کرتا ہے۔ استاد امیداکو اس کے اڈے سے میں نے بے دخل کر دیا تو سب کچھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔ اڈے سے وابستہ ہر آدمی نئے استاد کے زیر نگیں ہوگا۔ وہ بیٹوں بھی جو ڈاک خانے اور اس سے متعلق کئی میں میرے آڑے آگئے تھے۔ اس وقت اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ استاد امیداکا اڈا اب نہیں کہیں آس پاس ہوگا۔ میری رفتار غیر ارادی طور پر تیز ہو گئی اور پھر بہت سے دھندلے اندیشوں نے مجھ پر پوش کی۔ اگر نتیجہ مختلف ہوا! ساری چیزیں موافق ہوں تو بھی

بدنشہی اور ان ہونی کا ایک فی صد امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور محفوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں کے اذوں کے طور طریقے الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ استاد میدا کوئی بہت کمینہ اور سفلہ شخص بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر محلہ اسپتال میں پڑا ہے۔ مجھے پہلے تو اس کی فکر کرنی ہے۔ اس کے لیے خود محفوظ کرنا ہے۔ چاقو کے ساتھ کسی کے مقابل ہونے میں ایک سوئی شرط ہے۔ اور تاکامی کی صورت میں کچھ بھی ممکن ہے، ذرا سی چوک ہوگی تو تلافی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

مجھے کچھ اور سوچنے، کسی اور طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ باغیچے کے اس جانب سامنے پڑنے والی پہلی گلی کے پار کوئی بڑی سڑک تھی۔ وہاں راہ گیروں اور سواروں کی کثرت سے آمدورفت دکھائی دیتی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا، یہ وہ سڑک تو نہیں جہاں سے میں چلا تھا مگر دور، بہت دور پائی نظر آ رہا تھا۔ یہ لگتا نڈی ہی ہو سکتی تھی۔ باغیچے سے نکل کے میں سامنے والی گلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عجب سے بھن بھنا تا شور سنا دیا۔ پیچھے دیکھے بغیر میں ایک جانب ہو گیا پھر ایک درخت کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ دوسری جانب، باغیچے کے پار، مسجد سے نزدیک گلی کے دہانے پر کئی سائیکل سوار سپاہی سائیکلیں روک کے ادھر ادھر نظریں گھما رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ گلیوں کے لوگ ہی ہوں گے۔ تماشا ہونا چاہیے، تماشاخیوں کی کمی نہیں۔ مجھے یہی خدشہ تھا، گلیوں میں متعدد لوگوں نے مجھے گھومتے دیکھا تھا۔

میرے اور پولیس کے درمیان باغیچے کا فاصلہ اور باغیچے کے درختوں اور پتھروں پر چڑھی بیلوں کا پھیرا پر وہ حائل تھا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اپنے آپ کو پھپھاتا ہوا سامنے والی گلی تک پہنچ جاؤں۔ اس گلی میں بھی مکانات کا سلسلہ تھا۔ روپوش ہونے کی وجہ کوئی بہتر جگہ مل سکتی تھی۔

بھاگنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ باغیچے کے ساتھ گھومتی ہوئی نہہتا پوری سڑک پار کر کے میں تیز قدموں سے گلی میں آ گیا اور مجھے سیٹوں کی گونج سنائی دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا یا نہیں، مڑ کے دیکھنے کا مجھے پارانہیں تھا۔ گلی کے کٹواڑ پر کسی چھوٹی جوتی کی طرز کا ایک دو منزلہ پرانا مکان بنا ہوا تھا۔ گلی میں سیدھے چلے رہے سے نظر آ جانے کا امکان تھا۔ کٹروالے مکان کی دیوڑھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اسی میں داخل ہو گیا۔ اندر روشنی کم تھی۔ کسی کمرے کے بہ قدر اس ڈیوڑھی میں تین دروازے تھے، ایک سامنے اور دو دائیں اور بائیں۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ نزدیک تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے ایک کے بائیں طرف کا دروازہ کھٹکھٹایا اور احتیاطاً جیب سے چاقو نکال لیا۔ کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

میں نے پہلے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی اور دلی زبان سے کہا۔ ”دروازہ کھول لے۔“

”کون..... کون ہو میاں؟“ اندر سے وہی ہماری بھر کم آواز آئی۔

میری بات پوری سننے سے پہلے ہی اس شخص نے دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا اور مضطرب نظروں سے دیکھا گیا۔ کمرہ اونچائی پر تھا۔ ایک قدم کی میزھی پر پاؤں رکھ کر ہی اوپر جانا ممکن تھا۔ مجھے اسے کوئی وقت نہیں رہتا تھا۔ صورت حال سمجھنے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کا۔ یوں بھی آنے والے لمحے اس کے تصور سے بعید ہوں گے۔ منظر کی اس اچانک تبدیلی سے متوازن آدمی بھی ہے تو آواز ہو جاتا ہے۔ آنکھ نشینی جلد دیکھ لیتی ہے، ذہن اتنی جلد قبول نہیں کرتا۔ میں نے ایک چہرہ میزھی پر رکھا،

دوسرے لمحے اسے پیچھے دھکیلتا ہوا میں کمرے کے اندر تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا۔

وہ ترشی ہوئی داڑھی، سرخ و سپید رنگت، طویل قامت، بھاری بھر کم ہے، دیکھنے خال و خالی، لمبل کے مکلف کرتے اور پاچا پے میں بلوس پچاس سے مچپن کی عمر کا ایک وسیبہ شخص تھا۔ بشرے سے کوئی نواب لگتا تھا۔ کمرے میں خامسی روشنی تھی۔ میں نے طائرانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش کے وسط میں قالین بچھا ہوا تھا۔ ارد گرد کرسیاں رکھی اور دیواروں سے پیوستہ شیشے کی الماریوں میں کتابیں بھی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چوکی پر موجود افراد میں ایک کم عمر لڑکا تھا، بھگتی مسوں کا۔ دو جوان لڑکیاں تھیں اور ایک سن رسیدہ عورت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی چٹیں نکل گئیں پھر بدحواسی سے عورتوں نے دو بچوں سے پھرے پھیالے اور چوکی کے پاس گھر کے اندرونی حصے میں کھلے والے دروازے سے بھاگنا چاہا۔ میری دھمکتی آواز نے انہیں ساکت کر دیا۔ ”کوئی نہیں، کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ سب اسی کمرے میں رہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔“ دروازہ کھولنے والا شخص میرے چاقو کی زد پر تھا اور بڑی طرح بولکھلا گیا تھا ”کون، کون ہو تم؟ کیا..... کیا چاہتے ہو؟“ وہ ہچکاتی آواز میں بولا۔

میرا چاقو اس کی گردن کے نزدیک تھا اور میں نے اس کا دایاں بازو اپنے بازو میں جکڑ لیا تھا۔ سامنے چوکی پر بیٹھے گھر کے افراد کے آگے دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا رکھا تھا۔ میرا وجود ان کے لیے کسی بھیما تک خواب کے پابند ہوگا۔ گو میری حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ میں اندر ہی اندر پانپ سا رہا تھا۔ انہیں میری کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے خود کو جمع رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بہ ظاہر دھمکتی آواز میں

پوچھا۔ ”گھر میں اندر اور کون کون ہے؟“

”کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، صرف ایک ملازمہ ہے۔“ مرد نے بہ مشکل کہا۔ ”اور..... اور.....“

”اور کون؟“ میں نے اپنے لہجے میں سفاکی قائم رکھنے کی ڈھٹائی کی۔

”اور میری بیمار والدہ۔“ اس نے بہ غلٹ جواب دیا۔ ”وہ..... وہ چل پھر نہیں سکتیں۔“

”ملازمہ کو اندر بلاؤ۔“ میں نے سرد مہری سے کہا۔

اس نے پھٹی ہوئی آواز میں چوکی پر بیٹھے ہوئے نو خیز لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”زینی، زینی! جاؤ، جا کے راجہ سے کہو، وہ فوراً یہاں آجائے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے تیز اور شستہ انگیر بازی میں زینی کو واپس نہ آنے اور پردیسیوں کو مطلع کرنے کی ہدایت کی۔

زینی کے دیدے باہر نکلے ہوئے تھے اور نیچے کا سا عالم طاری تھا۔ اس کے پیلو سے ڈھکی ہوئی دہشت زدہ ادھیر عورت کے کہنی مارنے پر وہ ہڑبڑا گیا۔ وہ چوکی سے اٹھ پڑا تھا کہ میری آواز پر اس کا سراپا متلاطم ہوا اور وہ ہیں ڈھیر ہو گیا۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گے، اپنی جگہ سیدھے بیٹھے رہو گے۔“ میں نے سچ کر کہا۔ ”ملازمہ کو یہیں سے آواز دو۔“ میں بھی اسے انگیر بازی میں حکم دے سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ احتیاط کیا۔

زینی کے بجائے ادھیر عورت نے لفظانی انداز میں ”راجہ راجہ“ کی گردان شروع کر دی۔

”میں نے کہا یا تم سے، میری والدہ بیمار ہیں۔“ مرد نے سراپا سبکی سے کہا۔ ”ملازمہ انھی کے پاس ہوگی۔ وہاں تک شاید آواز۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مزید کیا کروں، کون سا حکم دوں۔ میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔

کھلی کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چوکی کے برابر گھر میں داخلے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا

اور کھلا ہوا تھا۔ دونوں نوجوان لڑکیاں، ادھیر عورت، غالباً اپنی ماں سے گائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دو بیٹوں سے چہرے ڈھانپ لیے تھے اور ان کے بدن کا نپ رہے تھے۔ کچلے دروازے سے ملازمہ کسی بھی وقت اندر آ سکتی تھی اور کوئی اور بھی۔۔۔۔۔ یہ ظاہر گھر میں کسی اور افراد کی موجودی کا امکان نہیں تھا اور نہ کھانے کے وقت بھی اس کمرے میں جمع ہوتے۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ کوئی اور آ بھی جائے تو کیا ہے۔ اسے بھی روکا جاسکتا ہے۔ جب تک میری گرفت میں گھر کا کوئی ایک فرد ہے، مجھے خاطر جمع رہنی چاہیے۔ یہ سارا بڑھا کھٹا، آسودہ حال گھرانہ معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال نسبت ہوش مند ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے اندیشے وسوسے ان کے ذہنوں میں نمود پاتے رہتے ہیں۔ جتنی دیر ان پر میری ہیبت رہے گی، یہ کسی نادانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اور میرا مقصد کسی کو زک پہنچانا بھی نہیں ہے۔ مجھ سے تو ان کی یہ حالت بھی دیکھی نہیں جاتی۔ میرے لیے اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ ہے تو انہیں بھی ایسی ناگہانی سے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ تاہم مجھے اپنی شقاوت کا تاثر انہیں دیتے رہنا چاہیے۔

چند منٹ کا وقفہ خیرستان کی سی خاموشی کا گزر گیا۔ میری نظریں کمرے میں چاروں طرف بٹکتی رہیں۔ مجھے احساس تھا کہ سکوت کے یہ لمحے ان پر عذاب کے مانند گزر رہے ہوں گے۔ اس طرح گھر میں داخل ہونے والا شاید ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا ہو، میری آمد کا مقصد اور میرے اگلے اقدام کے بارے میں جاننے کے لیے یہ بہت متوجش ہوں گے۔ سکوت کا یہ عرصہ میرے لیے ابھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ان میں جرات عود کر سکتی ہے۔ یہ مجھے کوئی پاگل دیوانہ نہ سمجھ رہے ہوں۔ یوں مجھے مذہب و متمدن دیکھ کے یہ میرے بارے میں اپنی رائے نہ بدل دیں۔ مجھے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے

رہنا چاہیے لیکن اور کیا؟ میں اور کیا کر سکتا ہوں؟ مناسب نہیں ہے کہ مجھے سب کچھ صاف صاف انہیں بتا دینا چاہیے۔ سب پر ایک عالم بھجان والہ طراب طاری ہے۔ زندگی بھر کے لیے اس وقت کی رشتہ ان پر نقش ہو سکتی ہے۔ آئندہ کوئی کسی نفسی پیچیدگی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا کچھ ہوا تو کیا میں خود کو معاف کر سکوں گا۔ لڑکیوں کا حال تو سب سے خراب ہے۔ ان کے چہروں پر بہت سادگی، شائستگی اور معصومیت ہے۔ یہ کسی سزا، کسی جرم کی سزا وہ بھگت رہی ہیں۔ کوئی بھی اوسان کھو سکتی ہے۔ ان کی استطاعت سے سوا مجھے ان کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ کسی اور طرح بھی میں ان سے پیش آ سکتا ہوں۔ چاہو تو بہر حال میرے ہاتھ میں ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ میری ساری توانائی میرا ہشت بھر بھجوا رہے۔ ایک جھنجھار بدست کے آگے سو آدمی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ مجھ پر یقین کریں یا نہ کریں۔ مجھے بقا وقت مطلوب ہے، وہ تو مل ہی جائے گا۔

میں نے عواقب پر غور کرنے کے بعد مرد کا جکڑا ہوا بازو آزاد کر دیا۔ وہ پلٹیں جھکے کانے لگا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ”آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔“ میں نے ظاہری رعونت سے کہا۔ ”اور خیال رہے، میرا ہاتھ خالی نہیں ہے اور نشانہ بھی برا نہیں۔ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ بہتر ہے، جیسا میں کہتا ہوں، ہر دست اس پر عمل کیجیے۔“

کرسی پر بیٹھ جانے کی رعایت پر اسے مزید حیرت ہوئی۔ اس نے جھکی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں غصہ بھی تھا، تجسس اور خوف بھی۔ وہ فوراً ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور جھکتے ہوئے کرتے کی آستین سے پیشانی کا پینہ پونچھا۔ میں اس کے قریب ہی رہا۔

”آپ، آپ، آپ کیا چاہتے ہیں میاں؟“ اس نے نکلت نکلت خورہ آواز میں بد وقت لب کشائی کی۔

”کچھ نہیں۔“ میرے منہ سے نکل گیا اور میں نے چاقو اچھال کے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اپنے اس اضطراب اور مشافی کے بے اختیار اظہار پر مجھے خود سے بیزاری ہوئی۔ ”میری بات دھیان سے سنیے اور اپنے ہوش و حواس قائم رکھیے۔“ کچھ تامل کے بعد میں نے وہی آواز میں کہا۔ ”میں پوری ذہنیت کے ارادے سے آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوا ہوں۔ مجھے یہاں سے کچھ کہیں چاہیے صرف تھوڑا سا وقت۔۔۔۔۔ مجھے انہوں نے کہا ہے کہ میں نے آپ کو ناقص ایسی بدترین آزمائش سے دوچار کیا ہے۔ یہ جبر، یہ دیدہ دلیری ایک ناقابل معافی جرم ہے بلکہ یہ تو کوئی گناہ ہے لیکن میری کچھ مجبوری ہے جو مجھے آپ کے ہاں اس طور سے چناہ لینی پڑی۔ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ لوگ خاموشی سے یہ مختصر اور مشکل وقت گزاریں تو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ لفظ ذہن میں منتشر ہو گئے۔ ممنونیت اور احسان کے لفظ بہت قریب تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہا جاسکا۔

”کیا، کیا بات ہے؟“ مرد کی آواز میں پہلی مرتبہ ٹھہراؤ آیا۔

میرے نرم اور ندامت زدہ لہجے سے چوکی پر بیٹھی خواتین اور زنجی بائی لڑکے کی بھی یقیناً کچھ تسکین ہوئی ہوگی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ”میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔“ میں نے اپنی بھری ہوئی آواز استوار کرنے کی کوشش کی۔ ”کل رات ہی میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ چنے آیا ہوں۔ ہماری منزل بردوان تھی۔ ہم فیض آباد سے ریل میں بیٹھے تھے کہ اکبر پور ریلنگھن راجن میں خرابی پیدا ہو گئی۔ ساری گاڑی بیک ایک جگہ کھانے لگی۔ رات کا وقت تھا اور مسافر ایسے بیدار نہیں تھے۔ کئی مر گئے، بہت سے زخمی ہوئے۔ کسی شدید جھٹکے سے میرے سونے ہوئے بھائی کا سر بھی ڈبے کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا

لیکن اس وقت ایسی کوئی فکر کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔ آگے راستے میں بھائی کے سر کی تکلیف بڑھتی گئی اور سرماتی کر کے ہم پٹا اتر گئے۔ گراڈ ہول میں کمرالے کے اور سامان رکھ کے ہم نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر مرض کی نوعیت نہ سمجھ پائے۔ وہ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے کو نا وقت زحمت دینے سے انکار کر رہے تھے۔ بڑی منتوں کے بعد آمادہ ہوئے۔ ڈاکٹر رائے نے مہربانی کی، اپنے اصول توڑ کے وہ اسپتال آگیا۔ بھائی کا توجہ سے معائنہ کیا مگر اندرونی چوٹ کی وجہ سے وہ بھی کتنی طور پر کچھ بتانے سے قاصر رہا۔ بہر حال اس نے کچھ دوا میں تجویز کیں۔ اس کی ہدایت پر ہمیں ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

”رات بھر بھائی پر غفلت طاری رہی۔ صبح ان کے کئی ایکس رے لیے گئے۔ ڈاکٹر رائے دوپہر ایک بجے دوسری بار معائنے کے لیے کمرے میں آنے والا تھا۔ دوپہر تک میرے پاس خاصا وقت تھا لیکن وہاں سے پہنچے کو دل نہیں مانتا تھا۔ کمرے میں تعینات مہربان اور مستعد نرس کی مستقل نگہداشت اور اس کی یقین دہانی پر کہ میں ہول جا کے ڈاکٹر رائے کی آمد سے پہلے واپس آسکتا ہوں، میں اسپتال سے نکل آیا۔ تانگے والے نے میری توفیق سے کم وقت میں مجھے ہول پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، ہول کا عملہ ہمارے بارے میں فکر مند تھا۔ گزشتہ رات سامان رکھ کے ہم وہاں سے چلے گئے تھے اور اسپتال میں ٹھہرے جانے کی وجہ سے واپسی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ہول میں لباس تبدیل کرنے اور نیچر کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اتنا وقت تھا کہ میں ڈاک خانے بھی ہواؤں۔ تانگا مجھے ڈاک خانے لے گیا۔ وہ ضروری تاروں کے میں وہاں سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ ایک نوجوان دیوار بن کے سامنے کھڑا ہو گیا اور تار فارم پر کسی عزیز کے

نام اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع کھوانے کے لیے عاجزی کرنے لگا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور صاف انکار بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ ایک اور نوجوان سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی تار فارم تھا۔ پہلے والے کی طرح وہ بھی میرے پیچھے بڑ گیا۔ وہ تو مجھ سے چٹ ہی گیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دونوں ساتھی ہیں اور تار فارم پر پیغام نویسی کے لیے اتنی محنت گزاری ایک جیل ہے، مقتصدان دونوں کا کچھ اور ہے۔ ان سے گلو خلاصی کی کش مکش کے دوران بعد کو آنے اور مجھ سے چٹ جانے والا نوجوان میری جبب سے بڑا نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں تھی یا گھبراہٹ میں ہاتھ اوچھاڑ گیا تھا کہ دوسرے لمحے مجھے اس دست درازی کا احساس ہو گیا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ چکا کہ ادھر پہلے والے نوجوان کی عاجزی میں شدت آگئی۔ اس نے میرا بازو جکڑ لیا تھا۔ اس سے بازو چھڑانے میں کچھ دیر لگی۔ اس اثنا میں جبب کترو نوجوان ڈاک خانے سے بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ بھاگتا ہوا ڈاک خانے سے نکل گئی میں داخل ہو گیا۔ غالباً یہ جان کے کہ میں اس کے تعاقب سے باز آنے والا نہیں ہوں، کئی میں کچھ اندر جا کے وہ ایک جگہ ٹھہر گیا اور اس نے چاقو نکال لیا۔

”کاش میں وہاں سے لوٹ آتا۔ اس کے ہاتھ میں کھلے چاقو اور مشتعل تیروں نے مجھے بھی اندھا کر دیا۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ چاقو کے معاملے میں مجھے بھی کوئی شدید ہوسکتی ہے۔ میں نے اسے جلد ہی پس پا کر دیا۔ اپنا ہوالے کے میں نے کئی سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ کچھ فاصلہ طے کر لیا تھا کہ نوجوان کے دو اور ساتھی چاقو چھماتے ہوئے ڈاک خانے کی سڑک سے کئی میں آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے میرے باہر نکلنے کا راستہ بند

کر دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ مجھے اپنے بیمار بھائی کے پاس اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ انہوں نے ایک نہیں سنی، مجھے دھکا دیا۔ میں نے ہوا واپس کرنے کی بھی پیش کش کی لیکن وہ تو کچھ طے کر کے آئے تھے اور چائے کس گمان میں تھے، بار بار میدان داری اپنے کسی استاد کا حوالہ دیتے تھے۔ ان میں ایک نسبتاً مشاق چاقو باز معلوم ہوتا تھا۔ دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ قریب ہی اپنے بے سدھ پڑے ساتھی کی شکستہ حالت نے انہیں اور غضب پر آمادہ کیا۔ میرے پاس ان سے منہ سے کچھ سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ کئی میں کھڑے لوگوں نے کوئی دھم اندازی نہیں کی۔ وہ تماشا دیکھتے رہے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے جبب ہی میں رہنے دیا۔ تفصیل سے کچھ حاصل نہیں مختصر یہ کہ میں نے پختہ کار آدمی کو کسی طرح زیر کر لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چاقو برقرار رکھ رکھا۔ نوجوان، نہ خود پر اپنا اختیار۔ اس غیر متوقع صورت سے اس کا نوجوان نو آموز ساتھی بے قابو ہو گیا اور چاقو کھولے کسی بائیل کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس پر تو جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ اپنی جھوک میں وہ اتنی تیزی سے بڑھا تھا کہ میرے لیے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے بے حال ساتھی کو بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، پہلے مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنا تھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ اس کا ساتھی بھی زبرد پر آسکتا ہے، کیوں کہ وہ میری گرفت میں ہے اور خود کو بچانے کے لیے میں اسے سامنے کر سکتا ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی دیوانگی سے میرے ساتھ اس کا ساتھی بھی محفوظ رہ سکے۔ میری کوشش بس اسی حد تک کارگر رہی کہ چاقو پیٹ میں ٹھہرنے کے بجائے پہلی میں پیوست ہوا۔ نوجوان اپنی نادانی کے اس انجام سے حواس کھو بیٹھا۔ اسے قابو میں کرنا پھر میرے لیے دشوار نہیں رہا۔ چند ضربوں میں وہ چکر کے زمین پر گر گیا۔ اس سانحے کے بعد کچھ وہ

خود بھی خبر ہو جانا چاہتا ہو گا۔
 ”دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کے میں نے دوبارہ وہابی کا ارادہ کیا، پھر کوئی میرے راستے میں مزاحم نہ ہوا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔“
 ”تاہم ذراک خانے کے باہر میرا منتظر تھا۔ بندہ ہمیں منٹ کا فاصلہ مانگنے کے لیے کہا ہو گا کہ پولیس کی سیٹیاں سنائی دیں۔ لوگوں نے مجھے تانگے میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اچھی نے تانگے کی سمت کا بھی اشارہ کیا ہو گا۔ کوئی اور وقت ہوتا اور کوئی جگہ ہوتی تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن پولیس کے طریق کار کا مجھے تصور ابہت علم ہے۔ وہ ایسے، میری رودادین کے اور میرا بیان لے کے مجھے واپس جانے نہیں دیتے۔ ان کے نرنگے میں آ جانے کے بعد میں وقت پر کسی طرح اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں میرا کوئی واقف کار نہیں۔ اگرچہ گلی کے کین اور راہ گیر سارے واقف کے شاہد ہیں لیکن صاف نظر آ رہا تھا، ان پر بھی استادمید کے زور و اثر کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ سڑک کے دونوں اطراف گلیاں نکلتی تھیں۔ بس یہی اس وقت دماغ میں آیا کہ تانگے سے اتر کے کسی گلی میں خود کو روپوش کر دوں۔ پولیس ابھی کچھ دور تھی، سڑک کے ایک موڑ پر میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور دامن جانب کی پہلی گلی میں داخل ہو گیا۔ ان گلیوں کے طول و عرض کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن ایسی بھول بھلیاں گلیاں ہر بڑے اور پرانے شہر میں ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا، ان بڑے درخت گلیوں میں پولیس کی دسترس سے نسبتاً محفوظ رہوں گا اور کہیں کسی جگہ اسپتال کی طرف جانے والا راستہ مل جائے گا۔ میں ایک گلی سے دوسری، دوسری سے تیسری میں ہلکتا رہا اور آپ کے گھر کے قریب مسجد اور باغیچہ تک چلا آیا۔ میں نے باغیچہ تقریباً عبور کر لیا تھا کہ دوسری جانب سے سائیکلوں پر سوار پولیس اور

لوگوں کا شور مچانا شروع دکھائی دیا۔ میرے اور ان کے درمیان باغیچے کا فاصلہ اور باغیچے کے درختوں اور شجے پر چڑھی بیلیوں کا چھپرہ پروردہ حائل تھا۔ ان کی نظروں سے چھپتا چھپاتا باغیچے سے پورے چوڑی سڑک عبور کر کے میں آپ کے گھر والی گلی میں آ گیا۔ گلی سیدھ میں ہے، آگے جانے میں دکھائی دیے جانے کا اندیشہ تھا۔ ناچار میں نے گلی کے کھڑے اس پہلے مکان، آپ کے مکان پر دستک دے دی۔
 میرا اگلا بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اب باقی ان پر تھا کہ وہ کیا اخذ کریں۔ شاید یہی کچھ جاننے کی غیر شعوری جستجو میں، میں نے نصیر کے چوکی پر بیٹھی خواتین اور لڑکے زینبی کو ایک نگاہ دیکھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ اپنی اپنی جگہوں پر ڈنگ سے گئے۔ لڑکیوں نے مضطربانہ سر جھکا لیے اور دو بڑے سروں پر اور بھیچ لے۔ اب وہ باہم ایسی سکڑی نکلتی ہوئی نہیں تھیں۔ زینبی کی آنکھیں بھی جبرتی انداز میں کھلی ہوئی تھیں اور اس کا جسم بھی تپا ہوا تھا۔ میرے مخاطب، کرسی پر بیٹھے گھر کے گھراں مرد کے چہرے پر چھائی زردی کے بجائے سرخی واپس آ گئی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ گھر نہ ہوتا تو کوئی اور گھر ہوتا اور کچھ اور لوگ ہوتے۔ میرے پاس انتخاب کا وقت نہیں تھا۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ مجھے تو ایک پناہ گاہ چاہیے تھی۔ دوسرا کوئی گھر ہوتا تو وہاں بھی مجھے کچھ اسی ناروا، ناز بنا سلوک کا سرکب ہونا پڑتا۔ میں آپ کو بتاؤں، یہ میرے لیے اتنا ہی جبر ہے جتنا آپ کے لیے۔“
 میں نے دوبارہ معافی مانگی۔ ”میری وجہ سے پردہ نشین خواتین کی بے پردگی ہوئی۔ آپ لوگ کھانے میں مصروف تھے اور کھانے کے بعد جانے آپ کے کیا معمولات ہوں، میں نے آپ کے سب درہم برہم

کر دیا۔ اطمینان رکھیے، کچھ دیر میں، مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ امکان یہی ہے، پولیس اس علاقے سے ناکام ہو کے کسی اور طرف نکل گئی ہوگی۔ مجھے بہر حال پولیس کے ہاتھ نہیں آتے، اسپتال پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر کے بارے میں فرس نے بتایا تھا، وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ وہ آگے کب کا چلا گیا ہو گا۔ کمرے میں میری نامور جودی پر اس نے جانے کیا سمجھا ہو۔ گزشتہ رات میں نے اس سے بڑی جھٹ کی تھی، سارا اسپتال سر پہ اٹھالیا تھا۔ وہی شخص جو کل رات اور آج صبح اپنے مریض کے لیے اتنا بے قرار تھا، وہی شخص..... میری آواز بھرا گئی۔ ”ڈاکٹر کیا کہتا ہو گا اور معلوم نہیں..... ان کا، بھٹل بھائی کا کیا حال ہو۔ ساری غلطی میری ہے۔ میں فرس کے کہنے میں آگے اسپتال سے نکلتا نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔“
 ”اب تو وقت گزر رہی چکا ہے۔“ بہت دیر بعد کرسی پر بیٹھے مرد نے زبان کھولی۔ ”مناسب نہیں تو آپ بھی بیٹھ جائیں میاں۔“
 مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا مگر یہ اسی کی آواز تھی، نرم اور مشفقانہ۔ مجھے ٹھنڈی ہوا کے کسی جھونکے کا احساس ہوا۔ یعنی میری صراحتیں رانگاں نہیں گئیں۔ مبہم و مبہوم سی مگر مجھے تو یقین تھی، ان کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ اپنا احوال سنا کے میری گراں باری کی قدر کم ہوئی تھی، اب مجھے اپنی گرہیں کچھ اور کھلی محسوس ہوئیں۔ تاہم اسی لمحے کوئی تند و تیز لہر میرے وجود میں درآئی کہ یہ تو میں جانتا ہوں، میرا بچ، کسی کچ کے طور پر کارگر ہونا چاہیے مگر یہ تو اس پر منحصر ہے کہ اپنے گھر میں میری غاصبانہ آمد اور میرے شروع کے سفاکانہ رویے سے یہ کتنا منقبض اور منتظر ہو چکا ہے۔ کچ کے پودے کی عدم ریزی کے لیے بھی نرم و نرم زمین چاہیے، اور شاید کچھ ایسا ہے کہ آدمی کچ پر اتنا قادر نہیں جتنا بھوت پر ہے۔ کچ بہت نایاب ہے، اس لیے اس

کی دست یابی پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ اور سماعت آلودہ ہو تو کچ بھی دھندلا جاتا ہے، نار سار ہوتا اور نامعتبر ٹھہرتا ہے۔ اس نے کسی اور تاثر، میری بابت کسی نئی تاثر میں وہ سب کچھ سنا ہے، جو میں نے کہا ہے تو زہر کی طرح اس کے کانوں میں سرایت ہونا چاہیے۔ مجھے صلہ دینے کا ہر جواز اس کے پاس ہے۔
 آدمی تو آدمی ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں عقلی تیزی سے آگ بھڑکتی ہے، اتنی تیزی سے جھٹ نہیں۔ مجھے اس کی افتاد طبع اور شخصی پیچیدگیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ آدمی چہرے مہرے، قامت و رنگ میں کتنے ہی مشابہ ہوں، ان کے باطنی خصائل بہت جدا جدا ہوتے ہیں۔ سولے بھر کی بدگمانی نے مجھے منتشر کر رکھا کہ اس کی خوش خلقی میں بدغولی کا کوئی پہلو تو مظہر نہیں۔ میں نے ایک اچھتی نظر سے یہ ہر زاویہ اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہیں تھی، وہ اب خاصا پر اعتماد لگ رہا تھا۔ اس اعتماد کا سبب بھی میں تھا۔ کرسی پر بیٹھ جانے کی اس کی خواہش کی قیبل میں مجھے ایک ذرا تردد ہوا تھا اور میں نے خود کو سرزنش کی کہ میرا اعتماد کیوں متزلزل ہے۔ یوں بھی مجھے کتنی دیر یہاں ٹھہرنا ہے اور ہتھیار تو اب بھی میری تحویل میں ہے۔ میں اس کے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے چائو کھلا رکھنا بھی ناگوار گزرا۔ میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔
 اس نے مجھ بھری سی لی اور گہری سانس بھر کے کرسی کے سرہانے سے سر نکال دیا۔ یقیناً اتنی کشاکش کے بعد دل و دماغ کی یک جانی کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوگی۔ چند تاپے اس کی یہی کیفیت رہی پھر پوک کے بولا۔ ”آپ نے شروع ہی میں یہ سارا کچھ بتا دیا ہوتا تو شاید.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ”بہر حال.....“ اس نے پھر آنکھیں میچ لیں۔

”کاش کہ یہی ہوتا مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ میں آپ کے لیے بالکل اچھی تھا۔ اتنی جلدی نہ میں اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا نہ آپ کو یقین آ سکتا تھا۔ پولیس بہت فریب تھی۔ بس یہی ایک صورت مجھے بھائی دی۔“

”تھانہ پولیس اس طرف نہیں آئی ورنہ سڑک کا شور یہاں ضرور مٹا دیتا۔ یا تو وہ لوٹتی یا کسی اور طرف جا لیتی۔“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں قیاس آرائی کی۔

”میں خاموش رہا۔ اسے جیسے کچھ یاد آیا۔“ مجھے اکبر علی خاں کہتے ہیں۔“ اس نے متانت سے کہا۔ ”میں ایک وکیل ہوں لیکن اب وکالت نہیں کرتا، لاکھ کالج میں پڑھاتا ہوں۔“

”میرا نام بابر زماں ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”آپ مجھے تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔“

”تمہارا بہت لکھا پڑھنا آتا ہے۔“ اس کے دونوں پرچھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے کوئی بات کہنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور شاید اسے لفظ مل گئے یا سرائل گیا، ادھر ادھر نظریں گھماتے اور پتھپتھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ خود کو آزاد سمجھیں؟“ اس نے چوکی پر موجود اپنے آپ میں بندھی جکڑی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا مطلب ہے۔“ اس نے بہ غلٹ وضاحت کی۔ ”اجازت ہو تو انہیں اندر جانے دیا جائے۔“ میں بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اس مرحلے کے بارے میں غور ہی نہیں کیا تھا۔ گھر کے افراد کے اندر چلے جانے سے مراد ہے، آنے والے لوگوں میں کوئی بھی ان ہونی صورت پذیر ہو سکتی ہے اور ادھر

میرے انکار سے بھی یہ ثابت اور موافق صورت حال قائم نہ رہے گی۔ مجھ میں اب انکار کی جرات نہیں تھی۔ میں نے اسے خود گنوا دیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا شاید کوئی اور جواب ہی نہ تھا۔ ”جی، جی، ہاں۔“ میں نے پہنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اجازت لے کے آپ مجھے اور شرم سار کر رہے ہیں۔“ ”میں نہیں، بخدا نہیں۔“ وہ ہاتھ بلند کر کے بے تابی سے بولا۔ ”میرا مقصد یہ ہے کہ اب ان کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ یہ گھر کے اپنے کام کاج دیکھیں۔“

”میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔“ میں نے اچھے کا ارادہ کیا۔ ”اطمینان رکھیے۔ میں انہیں کوئی اور مددایت نہیں دے رہا۔“ اس نے میری دھند دور کر دینی کوشش کی۔ ”یہ خود بھی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور انہوں نے بھی میری طرح سب کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ کو اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر کا وقت تو نکل ہی چکا ہے۔ سوچتے ہیں، آپ کس طرح یہ حفاظت اسپتال پہنچ سکتے ہیں۔“

”آپ بہت مہربان آدمی ہیں۔“ میرے اظہار ممنونیت میں تصنع کی آمیزش بھی مگر شاید اسے محسوس نہ ہوئی ہو۔

”یہ بتائیے، آپ کیا چاہیں گے؟ صبح سے آپ نے کہاں تک کچھ کھا یا پیا ہوگا۔“

”مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”ہاں، ایسی صورت میں بھوک پیاس کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔“

”آپ، آپ لوگوں کے کھانے میں میری آمد سے رخنہ پڑ گیا تھا۔ اچھا یہی ہوگا کہ میں اب چلوں، آپ اپنے معمولات جاری رکھیں۔“

”ہمارے معمولات کو جانے دیجیے۔ اب نہیں تو کچھ دیر بعد جاری ہو جائیں گے۔ صبح و شام کا یہ چکر تو چلتا رہے گا۔ اس وقت تو آپ کا مسئلہ اہم

ہے۔“ اس کے لہجے میں غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ ”دیکھیے، میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی، ہم سب کو خوشی ہوگی۔“ اس نے خواتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے بھی اہم لوگ اندر جا کے مہمان کی کچھ تو اشع وغیرہ کا بندوبست کر دو اور ہاں، نہ کوئی باہر جائے نہ آس پڑوس سے واسطہ رکھے۔ درمیان میں کوئی گھر آئے تو اسے یہاں، ہماری طرف نہ آنے دیا جائے۔“

ادھیڑ عورت اور دونوں لڑکیاں سٹ پٹاتی ہوئی چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے جیسے تیسے دوپٹوں سے اپنے بدن اور چہرے چھپا لیے اور ایک دوسرے کے پیچھے اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف لپک پڑیں۔ زینبی بھی اٹھ گیا۔ اکبر علی خاں نے اسے روک لیا اور حکم یہ انداز میں کہا۔ ”ذرا باہر جا کے دیکھو، ادھر کہیں آس پاس پولیس تو نہیں ہے۔ اور وہاں، کسی سے کچھ پوچھو گے نہ باہر کسی سے بات کرو گے۔ اور جلدی واپس آتا ہے۔“

زینبی تیزی سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں اہم دونوں رہ گئے۔ میں خود کو چھپایاں دیتا رہا۔ امکان تو نہیں ہے لیکن خوش گمانیوں میں احتیاط عین ہوش ہے۔ دروازہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور چاقو جیب میں محفوظ تھا اور میرے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں تو دیکھتا اور سناتا رہ گیا۔

زینبی کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے خوش اطواری سے پوچھا۔ ”کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔ ہاں، کیا شائغل ہیں آپ کے؟“

”کیا بتاؤں۔“ میں نے چہرہ مائی آواز میں کہا۔

”کچھ بتائیے نا۔ ملازمت تو آپ نہیں کرتے اور تجارت۔“ وہ تھکی لہجے میں بولا۔ ”یقیناً وہ بھی

نہیں۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“

”پھر وقت کیسے گزرتا ہے؟“

”سیر و سفر میں۔“

”سیر و سفر میں؟ پھر تو ضرور گھر کے نواب ہوں گے، زمینیں جاگیریں ہوں گی۔“ اس کی مسکراہٹ میں شائستگی تھی۔

”تمہاری بہت زمینیں ہیں۔“ میں نے اس کے بے موقع سوالوں سے بچنے کے لیے اقرار کیا۔ ”میں آباد میں؟“

”جی ہاں، وہیں۔“ میں نے سر جھکا کے کہا۔

”مریض آپ کے سنگے بھائی ہیں؟“

”جی۔“ میرے لہجے میں ترشی آ گئی۔ ”وہ سنگے ہیں، نہ سوتیلے۔ کوئی ٹوٹی رشتہ نہیں ہے میرا ان سے۔ کچھ رشتے بے نام ہوتے ہیں اور کچھ سارے رشتوں سے بلند ہوتے ہیں۔“

اس کی آنکھیں سکڑنی چلی گئی، وہ اور وہ سر ہلاتا رہا۔ ”کیا اسم شریف ہے ان کا یا یاد آتا ہے، کوئی نام لیا تو تھا آپ نے۔“

”نہیں۔“ اس نے تعجب سے دہرایا۔ ”صرف یہی نام۔“

”سب انہیں اسی نام سے جانتے ہیں۔ اب تو شاید خود انہیں بھی اپنا اصل نام یاد نہ ہوں۔“

”اچھا۔ اچھا۔“ اس نے متفانانہ لہجے میں کہا۔ وہ ایک نہایت ذہین اور حساس آدمی تھا، کہنے لگا۔ ”ہو سکتا ہے، آپ میرے ان بے در پے سوالوں سے مکدر ہو رہے ہوں۔ اصل میں میرا مقصد یہی نہیں کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ جاننے کی ہمت ہو، ایک قسم کی فطری جھنجھو۔ میری یہ بھی خواہش تھی اور ہے کہ کچھ اس طرح آپ کی توجہ بے لگن لگتا ہے، آپ کے دماغ پر بہت بوجھ ہے یا

آپ، آپ اپنے مخاطب کو اعتبار کے قائل نہیں

”نہیں نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ میرے محسن ہیں۔“ میں نے لاجپت سے کہا۔ ”کچھ ناگوار خاطر ہوا تو مجھے معاف کر دیجیے۔“ میں آپ سے پھر کہوں گا، ذرا غصہ کیجیے، دیکھیں، جلد بازی میں خدا خواست اور رکاوٹیں نہ کھڑی ہو جائیں۔ آپ نے استاد میدا کا نام لیا تھا نا؟ میں اسے جانتا ہوں۔“

”آپ جانتے ہیں اسے؟“ میں نے بے گلی سے پوچھا۔

”وکالت کے دوران کئی بار اسے کچھری میں دیکھا ہے۔ شہر میں تقریباً سبھی اسے جانتے ہیں۔ وہ ایک شورہ پشت، پرلے درجے کا شیطان آدمی ہے، ایک نمبر کا فنڈ، بہت کٹ کٹا اور خوں خوار۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اس کے گھر کے، ایک سے ایک منہ مار، ہتھ چھٹ شہر بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بس اس کے سر پر تاج نہیں ہے۔ من مانی، دھاندلی، ہٹ دھرمی۔ شہر میں بیش تر جرائم کے پیچھے وہ ہوتا ہے یا اس کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی اس کے آڑے نہیں آتا یا اسے نہیں چھیڑتا تو وہ بھی اس شخص پر ہاتھ نہیں ڈالتا، گویا یا تو اس سے کوئی سروکار نہ رکھے یا اس کے سامنے میں آجائے، پھر عافیت ہے۔ شہر میں عزت آبرو سے زندگی گزارنے کی یہی ایک بہتر تدبیر ہے۔ اور لوگ عموماً کسی پر عمل بجا ہیں اور لطف یہ کہ بعض ستم ظریف اس سرکش کی تائید بھی خوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، شہر میں ہونے والے جرائم ہمیں زیادہ ہوں اگر استاد میدا موجود نہ ہوا۔ مراد یہ ہے کہ شہر کا ایک طبقہ اسے اپنا محافظ بھی سمجھتا ہے۔ طرح طرح کے قصے کہانیاں اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور سنا ہے، اپنے دربار سے واپس لوگوں کا وہ بہت خیال رکھتا ہے۔ رکھنا بھی چاہیے کہ یہی تو اس

کے دست و بازو ہیں، انہی کی وجہ سے اس کی سرکار قائم ہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں زخمی ہو جانے والا نوجوان میدا کا آدمی تھا تو۔۔۔“ اکبر علی خاں کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں اور وہ کوئی شدید بات کہنے سے رک گیا۔

”تو کیا؟“ میں نے تکی سے پوچھا۔

”تو کچھ بھی ممکن ہے۔“ وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ بتائیے، جس آدمی کے چاقو پیوست ہوا تھا، اس کی حالت کیسی تھی؟“

”یقیناً سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ زخم گہرا ہے اور جلدی ہی مر رہی ہے نہ ہوئی اور خون زیادہ نکل گیا تو کچھ بھی ممکن ہے۔“

”یعنی وہ اپنی جان سے بھی جاسکتا ہے؟“ اکبر علی خاں نے بے زبانی سے پوچھا۔

”یہ بھی ممکن ہے۔“ میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ”اس کا چاقو بردار سامھی کوئی اچھا چاقو باز نہیں تھا۔ اسی نوشکی کی وجہ سے اس کا وارکاری بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے چاقو باز ہاتھ کھینچ کر رکھتے ہیں، چاقو کو لگام دے کے، اور وہ تو۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا، وہ تو مجھے چاقو مارنا چاہتا تھا۔“

”لیکن کون گواہی دے گا؟“

”میں جانتا ہوں، کوئی بھی نہیں دے گا لیکن استاد میدا کو تو اصل بات سے آگاہ ہی ہونی چاہیے۔ گلی کے لوگ اسے سچ کیوں نہیں بتائیں گے؟“

”آپ کا یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔“ اکبر علی خاں نے چپکٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

”استاد میدا کو اپنے طور پر بھی وائے کی نوعیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور واقعی گلی کے لوگ اس سے سچ کیوں چھپائیں گے۔“

”گلی سے لکھے ہوئے مجھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ پولیس نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اتنی جلدی استاد میدا کو خبر نہیں ہوئی چاہئے۔ یقیناً گلی کے لوگوں نے پولیس کی توجہ میری جانب مبذول کرائی

ہوگی مگر اب وقت خاصا گزر گیا ہے۔ اتنی دیر میں استاد میدا کو سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے۔“

”اور معلوم ہو جانے کے بعد اس کا رد عمل کیا ہوا ہوگا، کیا ہونا چاہیے؟“ اکبر علی خاں نے جیسے خود سے پوچھا۔

”وہ اڈے کا کوئی مستند استاد ہے تو اسے آدمیوں کی نادانی اور اچکے پن پر بہت برگشتہ ہوگا اور جیسا کہ آپ بتاتے ہیں، وہ کوئی خود سر، بر خود غلط اور طبعاً کمینہ آدمی ہے تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔“

میں نے دونوں کا انداز میں کہا۔

”اسے شہر میں اپنی دھاک، اپنے بھرم کی فکر ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتا ہے تو اس شرافت میں اس کی سکی کا پہلو نکلتا ہے۔ شہر میں کوئی انجینی اس کے تین آدمیوں پر حاوی آجائے، یہ حقیقت اس کا چین سکون غارت کر سکتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے اصول پسند نہیں ہوتے۔ اسے آپ کی تلاش ہونی چاہیے۔ پولیس بھی اسی کا ساتھ دے گی۔ ظاہر ہے، پولیس کے کتنے لوگ، اور اسے نیچے تک اس کے پروردہ ہوں گے۔“ اکبر علی خاں نے دیکلوں کی طرح نکتہ طرازی کی اور مایوسی سے بولا۔ ”استاد میدا جیسے آدمی سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میری آواز کی تپش اسے اپنے کانوں میں محسوس ہوئی ہوگی۔

”میں امکانات کی بات کر رہا ہوں۔“ پہلی بار اس کے لہجے میں برہمی شامل تھی۔

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے سنگتی آواز میں پوچھا۔ ”میرے پاس کون سا راستہ ہے۔ میں استاد میدا کے رحم و کرم پر رہوں اور ہاتھ پیر باندھے انتظار کرتا رہوں؟“

”مجبوری ہے۔ سامنے کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں، پیشہ ور مجرم ہے۔ یہی دیکھنا ہے کہ سر دست کون سا راستہ آپ کے لیے مناسب ہے اور اس کے لیے آپ کو صبر و ضبط کرنا پڑے گا۔ ذرا سی کوتاہی

تعمین رخ اختیار کر سکتی ہے۔“ اکبر علی خاں کے ننھے پھول گئے تھے اور ہونٹ کھڑک رہے تھے۔ ”آپ کہہ رہے تھے کہ گلی میں بعد کو آنے والے آدمیوں کو آپ نے بتایا تھا۔ آپ ان سے الجھنا نہیں چاہتے کیوں کہ آپ کا ایک عزیز اسپتال میں ہے اور آپ کو جلدی ہے۔ آپ نے انہیں بڑا دلچسپ کرنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ کیا آپ نے اسپتال کا نام بھی لیا تھا؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“

”یہ اچھا ہوا لیکن وہ شہر کے ہر اسپتال میں آپ کو تلاش کریں گے اور ان کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔ میدا کے پاس بد معاشوں کی ایک فوج ہے۔“

”انہی اندیشوں کی وجہ سے مجھے یہاں، آپ کے گھر میں چنا لیٹی پڑی اور آپ سب کو۔۔۔“

اس نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی۔

”ہماری بات جانے دیجئے، جو وقت گزر گیا، گزر گیا۔ اس پر گفتگو کا موقع بعد کو بھی آ سکتا ہے۔ بعد میں ذکر کریں گے اس کا۔“ اس نے ایک آہ سی بھری اور مدھم آواز میں بولا۔ ”اور خدشے تو اب بھی موجود ہیں جناب!“

”مجھے بہر حال اسپتال پہنچنا ہے اور جلدی سے جلد۔“ میرے منہم لہجے میں سرکشگی نمایاں تھی۔

”میں ٹھہل بجائی کو اس حالت میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”مگر برادر م کس طرح؟“

”کسی بھی صورت۔“

”وہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“

”میں نقل کے دیکھتا ہوں۔“

”اور راستے میں ان لوگوں سے مدد بھیجی ہوگی۔“

آپ سوچیں، یہ قطعی ممکن ہے۔ راستے میں آپ کو کسی نے پہچان لیا یا آپ پولیس کے ہاتھ لگ گئے؟“

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی

کہہ رہا تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی پتھر بن سکتا ہے۔ وہ پولیس ہوا مہیا کے آدمی۔ دونوں صورتوں میں اسپتال پہنچنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ ہا ہر آہٹ ہوئی تو بہ یک لمحہ اہم دونوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ وہ زہنی تھا۔ وہ بھری سے اندر آیا تھا۔ ”کیا خبر لائے؟“ اکبر علی خاں نے ہڑک کے پوچھا۔

”اس طرف کوئی نہیں۔“ زہنی کی آواز بھی اس کی عمر کی طرح بچی تھی۔

”تم نے کسی سے بات کی؟“

”آپ نے منع جو کیا تھا۔“ زہنی نے دبی زبان سے جواب دیا۔

”ہاں ہاں۔“ اکبر علی خاں کچھ خفیف ہوا۔ ”تم نے ٹھیک کیا، اور سنا انہم گھر ہی میں رہو گے۔ ٹیوشن کے لئے باسٹر خاں الدین آئیں تو آج کے لئے منع کر دو گے۔“ زہنی سر جھکائے واپسی کے لیے مڑ گیا تھا کہ اکبر علی خاں الجھ کے بولا۔ ”یہ لوگ اندر کیا کر رہی ہیں؟ ان سے کچھ کہا تھا میں نے..... جاؤ، اندر جا کے دیکھو۔“

زہنی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے سچت کی طرف دیکھا۔ ”شکر ہے، پولیس اس علاقے میں موجود نہیں ہے۔“

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

”دیکھیے۔“ اس نے ہنسنے کی آواز میں کہا۔

”ایک تو یہ صورت ہے کہ آپ خود کو.....“ اس نے جلدی سے توجیح کی۔ ”یہ ایک مفروضہ ہے۔ فرض کیجیے، آپ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں تو تو کیا ہوگا؟ کل صبح یا اس سے اگلے دن وہ آپ کو عدالت میں پیش کر دیں گے اور کوئی آپ کی ضمانت لے لے گا۔ فرض کیجیے، یہ ضمانت میں لے لیتا ہوں۔ پھر آپ کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گے اور نہ آپ کو اس وقت تک ٹھانے پکڑنے کی گروہ میں رہنا پڑے گا۔ یہ ایک معاملہ کسی گروہ نہ بیٹھ جائے۔ اگر ذہنی شخص خدا خواست زندگی بار بیٹھتا ہے

تو ضمانت بھی مشکل ہو جائے گی۔ اور یوں عدالت میں آپ کی بے گناہی ثابت کرنے، ثبوت و شواہد جمع کرنے اور چشم دید گواہوں کو حق گوئی پر آمادہ کرنے میں ایک مدت صرف ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کیوں نہ آپ اپنے پیار بھائی کی دیکھ بھال کے لیے اپنی کسی عزیز کو یہاں بلا لیں۔ تار کے ذریعے یہ اطلاع میں انہیں دے سکتا ہوں۔ فیض آباد سے دوسرے دن کوئی بھی یہاں پہنچ جائے گا اور آپ کو تسلی ہو جائے گی۔ جب تک کوئی فیض آباد سے آ نہیں جاتا، میں اسپتال جا کے آپ کے عزیز کی نگہداشت کر سکتا ہوں۔ اسپتال والوں سے بھی آپ کی غیر حاضری کا کوئی مقول عذر کیا جاسکتا ہے۔ اس دوران آپ کی قسم کا تردد کیے بغیر یہاں، اس گھر، میرے غریب خانے میں میرے مہربان کی حیثیت سے ٹھہر سکتے ہیں۔ مجھ پر کوئی بوجھ نہ ہوگا بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔ ہمارا خاندان مختصر ہے اور گھر ماشا اللہ بڑا ہے۔ اوپر کی منزل تقریباً خالی رہتی ہے۔ یہاں آپ کے قیام کے دوران میں کسی طرح چپ چپاتے آپ کی بے عافیت فیض آباد واپسی کی تدبیر کی جاسکتی ہے۔ آپ شہر میں نہیں رہیں گے تو یہ سب کچھ خود بہ خود بچ جائے گا۔ یعنی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی بھی حالت میں آپ کافی الحاح اسپتال جانا ممکن نہیں ہے۔ چونکہ ابھی معاملہ گرم ہے۔ ہو سکتا ہے، جلد ہی ختم پڑ جائے۔ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔“ وہ پرامید انداز میں بولا۔ امید سے زیادہ اس کے لہجے پر حسرت کا غلبہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ اور پہلوؤں پر اس جزر کی نگاہ کیوں نہیں گئی۔ میں سنتا رہا اور میں نے اس سے نہیں کہا کہ ڈاک خانے سے پہ آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے، میں نے کون کون سے مقامات پر تار دیے تھے۔ جس تار کے پر میں ڈاک خانے آیا تھا، اسے ڈھونڈ لینا ان کے لیے کیا دشوار ہوگا۔ تار کے والے سے انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ میں کون سے

اسپتال سے سوار ہوا تھا اور درمیان میں کہاں ٹھہرا تھا۔ اس تفتیش میں ہو سکتی ہیں۔ تار کے فارم پر میں نے پناہ شہر میں اپنے پتے کے طور پر گراں ہو سکتا نام لکھا ہے۔ ہو سکتے رہنمائی میں اپنی مستقل سکونت کے خانے میں فیض آباد کا پتہ لکھوایا ہے۔ سرا پکڑتے پکڑتے وہ فیض تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد اپنے آپ کو چھپاتا ہوا اسپتال پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاؤں تو بھی شام کو یارات کو باکل کسی وقت وہ اسپتال میں میرے سر پر آدھک سکتے ہیں۔ اس طرح فیض کے میں کیا کام آ سکتا ہوں۔ اکبر علی خاں کا یہ مشورہ ہی صاحب معلوم ہوتا ہے کہ کھلتے تار دے کے جامو کو بلا لیا جائے۔ تار میں یہ تاکید بھی ہو کہ وہ اکیلا نہ آئے، جامو، استاد مہیا اسے منٹے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ کہیں سے کسی کو بھی طلب کر سکتا ہے۔ کھلتے میں زور اور مرد بھی موجود ہیں۔ جامو کے ساتھ وہ بھی یہاں آجائیں تو اور اچھا ہو۔ مگر تار پٹنے اور کسی کے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تار کب پٹنے۔ ادھر فیض کے لیے سوچ سوچ کے تو میرے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔ کچھ خبر نہیں، ڈاکٹر رائے نے کیا تجویز کیا ہے، وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے، انیس ریز میں کیا آتا ہے۔ یہ اکبر علی خاں، ایک شریف انفس الجیبی، فیصل کی خبر گیری کرنے کی نوازش پر آمادہ ہے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اسپتال میں فیصل کو تباہ چھوڑ دینے سے بہتر ہے، کوئی انجینی ہی سہی، اس کی پریشانی کے لیے کوئی تو سر ہانے موجود ہے۔ اکبر علی خاں ڈاکٹروں سے عہد کی بات کر سکتا ہے۔ میں اپنے پاس محفوظ سازی رقم اس کے حوالے کر دوں گا کہ اسپتال کے اخراجات میں اس کا ہاتھ کھلا رہے لیکن یہ متبادل تجویز کس حد تک قابل عمل ہے، اکبر علی خاں نے اس طرف غور نہیں کیا۔ اگر مہیا کے آدمی کھون لگاتے لگاتے فیصل تک پہنچ گئے

اور انہیں اسپتال کے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ فیصل کو اسپتال لانے اور اس سے برادرانہ کراہت کا دعویٰ کرنے والا کوئی اور، یعنی میں تھا، اور میں ڈاک خانے سے ملحق کلی میں ہونے والے واقعے کے بعد اسپتال واپس نہیں آیا ہوں تو لازماً ان کی توجہ فیصل کے بیمار دار اکبر علی خاں پر مرکوز ہو جائے گی۔ اس کا گھرانہ کا ہدف بن جائے گا جہاں منہ چھپائے واقعہ میں موجود ہوں گا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ایک نہایت خلیق، اعلیٰ ظرف شخص، اپنے شخص کو کسی مصیبت سے دوچار کر دیا جائے۔ اکبر علی خاں کو تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ اسے استاد مہیا کے آدمیوں کی نظر میں نہیں آنا چاہیے۔

میرا سر پھٹا جا رہا تھا جتنا میں سوچتا، جدھر دیکھتا، اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا۔ اسپتال کے بستر پر بے سدھ پڑے فیصل کی تصویر میرے سینے، میری آنکھوں، میرے وجود میں سائی ہوئی تھی۔ بار بار ہڑک سی اٹھتی تھی کہ بس اکبر علی خاں سے رہی اجازت لے کے اس گھر سے نکل پڑوں۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا، اور ابھی مجھے یہ اندیشہ جسم جکڑ لیتا تھا کہ راستے بہت طویل نہ ہو جائے۔ راستوں کی طوالت، فاصلوں سے نہیں، راستوں کی نوعیت سے طے ہوتی رہے۔ راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہوئی تو اس کی بلندی کی انتہا کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اسی صلاح پر پات تمام ہو جانی ہے کہ مجھے اکبر علی خاں سے گزارش کرنی چاہیے، وہ ذی انور ڈاک خانے کے کھلتے میں جامو کو تار دینے کی زحمت کرے۔ جب تک جامو وغیرہ یہاں آنہ جائیں، مجھے اکبر علی خاں کے دولت کدے میں زندانی بن کے وقت کاٹنا ہے اور دیواروں سے سر پھوڑتے رہنا ہے۔ ادھر فیصل کا کچھ بھی حال ہو، مگر بہری حالت بھی اس سے کیا جدا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہے، میں بہ قائم ہوش و حواس یہاں بے دست و پا پڑا ہوں گا۔

پسند آئے۔ اس نے گلاس اٹھا کے میری جانب بڑھا دیا۔

انکار اب بدتمیزی کے زمرے میں آتا۔ میں نے گلاس لے لیا۔ ممکن ہے، جیسا کہ اکبر علی خاں دعویٰ کر رہا تھا، مشروب واقعی خوش ذائقہ ہو۔ ذائقے بھی غلب سے مشروط ہیں اور غلب جسم و جاں کی یک سوئی، بے حالی سے۔ میرا جسم جیسے کسی ٹکڑے میں کسا ہوا تھا، جیسے اندر سے کوئی ٹوٹتا ہو۔ مجھ میں ذائقہ شش کی خش ہی نہیں رہی تھی۔ پہلا گھونٹ ہی طلق کا فنا ہوا گزرا۔ مزید چند گھونٹ زہر مار کر کے میں نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”کیسا ہے؟“ اکبر علی خاں نے حسرتی انداز میں پوچھا۔ ”کچھ مرغوب ہوا؟“

”بہت عمدہ ہے۔“ شاید مجھے یہی کہنا چاہیے تھا اور وہ دونوں یہی سننا چاہتے تھے۔ داد و ستاد میں کے غلب کا روکوداد و ستاد میں ہی ممکن کرتی ہے۔ ”زہت اس کی ماہر ہیں۔ ذرا وقت تو لگتا ہے لیکن یہ اسے تمام اہتمام سے بنانی ہیں۔ یہ ان کا اپنا وضع کیا ہوا عطر مجموعی یا مشروب بے شمار آئینہ ہے۔“ وہ فیس کے بولا اور اسے خیال آیا۔ اس نے محنت ہوئے اپنی تنگیم سے پوچھا۔ ”یہ اپنی جوی اور یکتا کہاں رہ گئیں۔ ٹھیک تو ہیں وہ؟“

”آرام کر رہی ہیں۔ انہیں ابھی اندر ہی رہنے دیجئے۔“ زہت خانم نے دھمے لہجے میں کہا۔

”کیوں، کیوں، کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں، کوئی خاص نہیں۔“ زہت خانم ایک نظر مجھے دیکھ کے چمکتے ہوئے بولی۔ ”جہاں ہیں، ایڈجسٹ منٹ کے لیے کچھ وقت تو چاہیے۔“

”اوہ!“ اکبر علی خاں کی پلکیں پکڑ پکڑانے لگیں۔ ”اسی لیے تو میں انہیں یہاں بلانا چاہتا تھا۔“

”دیکھیے، کچھ دیر میں سکی۔“ زہت خانم نے یاسیت سے کہا۔

یہ سن کے مجھے جھٹکا سا لگا اور میرا سر جھک گیا۔ زہت خانم کے لہجے میں شکایت نہیں تھی۔ واقعی دونوں لڑکیوں کی عمریں اتنی پختہ نہیں تھیں۔ میں اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اب میرا یہاں سے بٹلے جانا ہی مناسب تھا۔ اس گھر میں میرا وجود انہیں مضطرب کیے رکھے گا۔ کہتے ہیں، پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے۔ بعض داغ مٹائے نہیں مٹتے۔ بعض لمبے نقش ہو جاتے ہیں، پتھروں پر کندہ کلیروں کی طرح۔

”یہ ہمارا گھر ہم دو مہیاں بیوی، دو بیٹیوں اور ایک بچے پر مشتمل ہے۔“ اکبر علی خاں نے اپنی آواز میں کہا۔ ”شاید یہ آپ کو عام گھروں سے الگ نظر آئے، اور ہے بھی کچھ بچے۔ ہم اپنی طرح سوچتے اور اپنے انداز کی زندگی گزارتے ہیں اور کسی دوسرے پر زور نہیں دیتے کہ ہماری روش ہی بہتر ہے۔ میں نے قانون کی تعلیم کے سلسلے میں تین سال انگلستان میں گزارے ہیں۔ زہت بھی دو سال وہاں رہ کے آئی ہیں۔ انگلستان کے علاوہ ہم نے یورپ کے دوسرے ملک بھی دیکھے ہیں اور مغرب سے۔ جیسا یہاں سمجھا جاتا ہے، وہاں ویسا بالکل نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو وہاں کے قمار خانے، سے خانے اور عشرت کدے ہی نظر آتے ہیں۔ وہاں علمی ادارے، کتب خانے اور تحقیقی مراکز بھی کثرت سے ہیں۔ وہاں کے علم و فضل، نظم و ضبط سے یہ لوگ فطری بے خبر ہیں۔ شائستگی اور اخلاق، کاروبار میں دیانت، معاملات میں صاف اور کھرے، وقت کے پابند، وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہم تو کہیں کم ہو گئے یا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے خود کو دریافت کر لیا ہے اور ان کا یہ عمل جاری ہے۔ ہم باسی میں زندہ رہتے ہیں، انہیں مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ وہ گھٹے ہوئے نہیں رہتے، زندگی ڈھونڈتے ہیں۔ روایت پر اصرار، سہل پسندی ہے۔ یہاں ہمارے آس پاس کی بود و باش بڑی روایتی ہے۔ سو یہ لوگ ہم سے قریب

ہونے میں کتراتے ہیں حالانکہ ہمیں معلوم ہے، انہیں بھی ہمارے طور طریقے پسند ہیں۔ معلوم نہیں، آپ کے کیا خیالات ہیں۔ آپ ہماری یہ روایت کھنی کس طرح دیکھیں مگر ایک گمان ہے۔ آپ بھی۔ قول آپ کے، جگہ جگہ گھومتے رہتے ہیں۔ سفر کرنے والے روایتوں کے معاملے میں اتنے شدید نہیں ہوتے۔ تعلق تو ہمارا بھی روایتی خاندانوں سے ہے لیکن ہم لہروں، نئی چیزوں کو مشکوک نظروں سے نہیں دیکھتے۔ جوا چھپا ہے، اس کے لیے دل کشادہ، جو غیر ضروری ہے، اسے ترک کر دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔“

اکبر علی خاں اپنی رو میں مغرب کی اوصاف بیانی میں رطب اللسان رہا۔ اسے کچھ خیال نہیں تھا کہ میں کتنا سن رہا ہوں اور مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ کسی نے بھی کہا تھا کہ ویل ہونے کی پہلی شرط شوق کلام ہے۔ زہت خانم بھی بے آرام سی لگی تھی۔ ہر چند اسے اپنے شوق کی خوش گفتاری کا عادی ہونا چاہیے تھا۔ اسی نے قطع کلامی کی اور اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

”ارے ہاں۔“ اکبر علی خاں کی جیسے کسی نے چٹکی بھری ہو، وہ چونک پڑا اور اس نے مجھ سے معذرت کی۔ ”کچھ احساس ہی نہیں رہا کہ بے موقع گفتگو، محض فضول گوئی ہے لیکن..... لیکن شاید ایک جواز بھی تھا۔ آپ یہاں قیام کریں تو آپ کو اس گھر اور گھر کے مکینوں سے ٹھوڑی بہت شناسائی ہو جائے، مابین کوئی اجنبیت نہ رہے۔“ اس نے خطر زہت خانم سے کہا۔ ”بابر میاں آج یہاں، ہمارے گھر مہمان رہیں گے۔ اوپر کی منزل پر انعام کرا دیجیے۔ ان حالات میں ان کا باہر نکلنا کسی صورت موزوں نہیں ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے، جلد واپسی ہو جائے گی۔ زہنی سے کہیے کہ وہ مہمان کا خیال رکھیں۔“

زہت خانم نے تجسس آنکھوں سے یہ ہدایتیں

سنیں اور نئی تلی آواز میں بولی۔ ”مناسب ہے۔ کوشش یہی ہوگی کہ مہمان کو کوئی شکایت نہ ہو۔“ پھر اس نے میری طرف نگاہ کی۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو ٹکف نہ بیگیے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف لوٹ گئی۔

”آپ یہاں بیٹھے، زہنی کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ میں بھی ذرا حلیہ ٹھیک کرنے کے لیے اندر جاتا ہوں۔“ تنگیم کے ادھم بھل ہو جانے کی دیر ہوئی کہ اکبر علی خاں ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز پر گیا اور کاغذ کلم اٹھا کے میرے پاس لے آیا۔ ”مار کے لیے آپ پیغام کا متن اور پتہ لکھ دیجیے۔ میں تیار ہو کے ابھی آتا ہوں۔“ اس جستی و مستندی سے وہ اپنی طول کلامی کی تلائی کرنا چاہتا ہوگا۔

”یہ، یہ میدا استاد کا ٹھکانا کہاں ہے؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ ”کیوں، کیوں صاحب؟“

”آپ جانتے ہیں؟“

”جی، جی ہاں، میں کیا، سارا شہر جانتا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں میاں؟“

”یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”زیادہ، زیادہ دور نہیں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”نہیں بچپن منٹ پیڈل کا راستہ ہوگا۔“

”میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا، کیا، کہاں جائیں گے آپ؟ کیا آیا ہے آپ کے دماغ میں؟“ اس کی آواز تعلق میں چنسن لگی۔ ”مید استاد کے ٹھکانے پر؟“

”جی ہاں۔“

”مید استاد کے سامنے آپ ہوش میں تو ہیں میاں؟ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کیسا جنگلی آدمی ہے۔ وہاں، بھڑوں کے پھپھے میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں آپ؟“

”میں آپ سے بالکل شفق نہیں، وہ بہت برے لوگ ہیں، بدترین لوگ۔ ان سے کسی بھلائی کی توقع فضول ہے۔“

”دیکھتے ہیں، ورنہ تو ویسے بھی۔“

”ویسے بھی کیا؟“ اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ ”یہ گھر آپ کے لیے بالکل محفوظ ہے۔ چار ملتے ہی آپ کے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔ ایک رات اور دن بھر کی بات ہے۔ حوصلہ رکھیے میاں! پینٹا میڈیکل کالج کا اسپتال علاج معالجے میں دور دور شہرت رکھتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر وہ وقت..... یہ ایک رات اور کل کا دن.....“ میری آواز ڈوبنے لگی اور میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس کے پاس جانا ہی ہوگا۔“

”معاف کیجیے، آپ بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ وہاں جا کے ان بے داد گروں کے سامنے آپ وافر بااد کریں گے کیا؟ ان لوگوں کے آگے جو رحم و کرم نام کی کسی شے سے واقف نہیں۔“

”غرور بھی آدمی ہیں۔“

”مگر کیسے آدمی، کیسے آدمی۔“ وہ بھڑکی آواز میں بولا۔ ”ان کے آدمی نے آپ کا بیٹا چاہا۔ چاتو نکال کے وہی آپ پر حملہ آور ہوئے۔ انہی کے ایک آدمی کی غلطی یا نادانی کی وجہ سے ان کا دوسرا آدمی زخمی ہوا، اور شتم یہ کہ پولیس آپ ہی کی تلاش میں ہے۔ دوا لیے لوگ ہیں۔“

”یہی کچھ اسے باور کرانا ہوگا۔“

”کسے؟ استاد میدا کو؟“ اکبر علی خاں کے لہجے میں درشتی آگئی۔ ”اور آپ کے خیال میں وہ مان جائے گا؟ اچھا ٹھیک ہے۔ اگر وہ نہیں مانا؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے راستہ بتائیے۔“ میں کرسی سے اٹھ گیا۔

”کیا، کیا آپ واقعی؟ نہیں نہیں میاں۔“

”مجھے جانے دیجیے۔ آپ کا بہت احسان ہے، آپ اور آپ کے گھر والوں نے جس اعلیٰ قدرتی کا سلوک کیا ہے، میں اسے کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ موقع ملا تو ایک بار ضرور آپ کے پاس، آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنے آؤں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آپ کو باہر جانے نہیں دوں گا۔“ اس نے عزم سے کہا۔

”ازراہ کرم مجھے اب مت روکیے۔“

”کیسے جانے دوں، میں آپ کو آگ کے حوالے کر دوں؟“

میں نے اپنا بیگ اٹھالیا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ منع کرتا اور میں کرتا رہا۔ انکار کی شرمندگی سے بچنے کے لیے مجھے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے لپک کے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے تقریباً چھینٹتا ہوا آیا اور ڈیوڑھی میں میرا بازو پکڑ لیا۔ ”یہ آپ کے سر میں کیا سودا لایا ہے؟ ایک تو وہاں تک آپ کا پینٹا ہی مشکل ہے۔ راستے میں پولیس کی نظروں میں آگئے یا اس بد بخت کے آدمیوں کی۔“

”وہ مجھے نہیں روکیں گے۔“ میں نے وثوق سے کہا۔ ”میں انہیں بتاؤں گا کہ میں میدا استاد کے پاس جا رہا ہوں تو وہ مجھے نہیں روکیں گے بلکہ میدا تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے۔ ان کی نظروں میں، میں میدا کا محرم ہوں۔ وہ تو اس عجب پر خوشی کا اظہار کریں گے کہ میں خود کو میدا کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ میدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس کے روپہ رو کر دینے کی انہیں بے چینی ہوگی۔“

”گویا آپ نے غے کر لیا ہے۔“ اس کے شانے لٹک گئے، آواز بھی۔

”میرا اسپتال جانا ضروری ہے۔ میں اپنے

بھائی کو ابے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”یعنی آپ کا مطلب ہے، اس طرح آپ کو اسپتال میں داخلے کی اجازت مل جائے گی؟ میں نے آپ سے کہا ہے میاں کہ میں آپ کے بھائی کی پریشانی کے لیے اسپتال چلا جاتا ہوں۔“

”کاش یہ ممکن ہوگا۔“

”یہ ممکن کیوں نہیں ہے؟“

”حیرت ہے، آپ کی نگاہ امکانی نتائج پر کیوں نہیں گئی؟“ نعل بھائی کے پاس آپ کے چلے جانے سے مراد ہے، اپنے گھر کی نشان دہی کرتا۔ وہ آسانی سے پھر آپ کے گھر پہنچ سکتے ہیں، جہاں میں روپوش ہوں گا۔“

”یہ کیسے؟“ مجھے سمجھائیے۔ ”وہ جڑ ہونے لگا اور میری کسی تفریح سے پہلے ہاتھ بلند کر کے بھائی اعزاز میں بولا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے، قطعی ممکن ہے۔ واقعی یہ پہلو میری نظر سے دور رہا مگر۔۔۔ مگر اس کے باوجود میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ استاد میدا کے ٹھکانے کا رخ کریں۔“

”میں نے ارادہ کر لیا ہے۔“ اپنے لہجے کی مغالطہ نے خود مجھے آزر دہ کیا۔

وہ میری شکل دیکھا کیا اور مایوسی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے میاں۔ آپ پر میرا کوئی غم تو نہیں چلتا۔“

”ایسا مت کہیے۔ میں نے آپ جیسے درد مند اور صاحب دل کم دیکھے ہیں۔“

”پھر بھی آپ میری بات نہیں مان رہے۔“

”مجھ سے اب کچھ مت کہیے۔ میری گزارش ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پھر تھیرے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

”آپ آپ میرے ساتھ چلیں گے؟“ میرا

سارا وجود سوٹ چلا گیا۔ ”نہیں نہیں۔“ میں نے شدت سے انکار کر دیا۔

”کیوں نہیں، میں آپ کو کیا ایسے چھوڑ دوں؟“

”وہاں آپ کا جانا مناسب نہیں ہے۔“

”جو میرے لیے مناسب نہیں ہے، آپ کے لیے بھی نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے ٹھان لی ہے تو مجھے بھی ساتھ رکھیے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اندر چلیے۔ میں جوتے پہن کر آتا ہوں۔“

”میری خاطر آپ کیوں جو حکم میں پڑتے ہیں۔ آپ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ آپ کو ان لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔“

”مجھے نہیں آنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں لیکن جب آپ امت کر سکتے ہیں تو میں بھی کچھ حوصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ چلیے، اندر چلیے، میں تیار ہو کے آتا ہوں۔“

مزید جھگڑا، تکرار، وضع و مدت کے منافی تھی۔ مروت بڑی زنجیر ہے۔ بادل خواست مجھے دوبارہ اندر آنا پڑا۔ وہ عجب قماش کے آدمی تھے۔ ان کا اصرار میری کجھ سے بالاتر تھا۔ آدمیوں کی بھی ہزار قسمیں ہوتی ہیں۔ مجھے کرسی پر بٹھا کے وہ فوراً ہی اندر چلے گئے۔ میرے پاس وقت تھا کہ میں چپکے سے نکل کھڑا ہوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اس طرح بھاگ جانا مجھے اچھا نہیں لگا اور وہ میری توقع سے کم وقت میں واپس آ گئے۔ ایسے طرح دار، صاحب وضع، ایسے بالکے شخص کی قدر منزلت مجھ پر کیا، کسی پر بھی واجب ہو جاتی۔

انہوں نے سلیٹی رنگ کی شیر وانی پہن لی تھی۔ مسٹر اد سلیم شاہی جوتی۔ سر پہ دوپٹی ٹوٹی تھی۔ اس وضع قطع میں وہ بالکل مختلف نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے ہوں۔ ممکن ہے، باہر جانے وقت ان کا یہی حلیہ ہوتا ہو۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس اہتمام کے معنی بھی

کسی قدر سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہر حال وہ ایک جامد زیب شخص تھے اور اس لباس میں تو ان کی شخصیت اور بر وقار ہو گئی تھی۔ ”چھٹے صاحب!“ ان کی آواز میں مضبوطی تھی، ایسی استواری جو ہر قسم کے ایثار پر آمادگی کے بعد ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

ہم ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے گلی میں آ گئے۔ ڈیوڑھی سے باہر آگے وہ ٹھہر گئے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں اپنا بیگ گھر میں چھوڑ دوں، اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے میری کمر پہ ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑے۔ گلی نسبت چوڑی تھی۔ راہ گیروں کی تعداد بھی کم تھی۔ جس سمت سے میں یہاں آیا تھا، اکبر علی خاں اس کی مخالف سمت جا رہے تھے۔ ان کی رفتار تیز تھی نہ جیسی۔ گلی میں ملنے والے اکا دکا راہ گیروں نے انہیں سلام کیا۔ وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے بڑھتے رہے۔ ان کے پہلو پہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنی حیثیت کسی معمول کی سی محسوس ہو گئی تھی۔ یوں بھی شاید راستوں میں راہ گیر کا تیور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ لمبی گلی پارک کے ہم ایک کشادہ سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے کنارے قطار سے چند تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کہے سے بغیر وہ پہلے تانگے پر بیٹھ گئے۔

استاد میدا کا چہ چہانے پر خستہ حال، عمر رسیدہ کوچوان کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے لیکن وہ بڑبڑا کے رہ گیا اور چابک بلند کر کے اونگھتا ہوا کھوڑا بیدار کیا۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے دونوں اطراف مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرف بھی زیادہ گئی۔ اکبر علی خاں نے دیر تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ میں بھی چپ رہا۔ خاصا راستہ خیریت سے گزر گیا لیکن کچھ اور آگے جا کے بائیں جانب جیسے ہی تانگہ ایک دوسری سڑک میں داخل ہوا، اس کی رفتار پہلے جیسی نہ رہی۔ تانگے والا چڑھانے لگا۔ اکبر علی خاں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ دو پہر

سے پولیس کسی مجرم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اکبر علی خاں نے بھی کیریڈ نہیں کی۔ ہم دونوں کچھل کچھلے فٹسٹ پر بیٹھے تھے اس لیے سرف گزرتا ہوا راستہ ہی نظر آتا تھا۔ تانگے نے کچھ اور فاصلے طے کیا تھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ میں نے ایک کے دیکھا اور ایک لمبے میں سارا منظر عیاں ہو گیا۔ آگے مختلف سواریوں کے پار پولیس تھی۔ وہ ہر سواری اور پیدل راہ گیر کا جائزہ لے کے آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ اکبر علی خاں کی معنی خیز نظریں مجھ پر مڑلانے لگیں اور میرے سکوت و سکون سے وہ مطمئن ہو گئے۔ ہم تانگے سے اتر کے پیدل داخل ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر کیا نہ میں نے۔ آنے والے وقت سے نبرد آزما بننے کے لیے میری طرح انہوں نے بھی خود کو جگڑ کے رکھا ہوگا۔

تا نگہ تقریباً کھسکتا ہوا پولیس کے قریب پہنچ گیا۔ دھوپ میں سرد پہر کی زردی شامل ہو چکی تھی۔ پولیس کے کئی اہل کار وہاں موجود تھے۔ انہوں نے معاندانہ انداز میں ہم دونوں کو نگاہوں میں توڑا اور کوئی سوال جواب کیے بغیر ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنا بیگ نشست کے نیچے حصے میں ڈال دیا تھا۔ تانگے کا یہ حصہ مختصر پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ بیگ بھی میری ایک نشانی تھا۔ اکبر علی خاں کے گھر میں پناہ حاصل کرنے سے پہلے ارد گرد کی گلیوں میں گھومنے ہوئے بہت سے راہ گیروں نے مجھے بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ پولیس اہل کار تھک گئے تھے یا ان کی توجہ اکبر علی خاں کی عمر انگیز شخصیت ہی پر مرکوز رہی یا انہیں میری شکل اور ہونے والے واقعات میں کوئی نسبت دکھائی نہیں دی۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، تا نگہ اس مرحلے سے خیر و خوبی گزر گیا۔

کچھ دور بعد تانگہ ایک گنجان علاقے میں داخل ہو گیا۔ قریب ہی چوراہا تھا۔ وہاں چاروں طرف دو

تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ فرشی منزلیں تمام کی تمام چھوٹی بڑی دکانوں، چائے خانوں، اشپائے خورد و نوش، بساٹیوں اور پان بیڑی کی دکانوں پر مشتمل تھیں۔ وہیں کسی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ ڈاک خانے کی گلی کا کوئی عینی شاہد ہی ہو سکتا تھا۔ اسی نے دوسرے، دوسرے نے تیسرے کو اشارہ کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی وحشت فزوں ہوئی گئی اور شور مچنے لگا۔ ان کے اشاروں کنایوں اور غل غباڑے سے اکبر علی خاں کو بھی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ میں پہچان لیا گیا ہوں اور بات کتنی آگے چاکی ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا سراپا کھنچا اور تانگہ والا خاصا سراسیمہ ہو چکا تھا، بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا، ابھی انہیں، ابھی نہیں۔ چوراہے سے چند قدم کی دوری پر تانگے کے پیچھے پیدل اور سائیکل سواروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ ہمیں نگاہوں میں رکھے تانگے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور شور مچاتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی قریب یا سامنے آنے اور ہم سے باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر با رہا تھا۔ ہمارے سکون نے شاید انہیں باندھے رکھا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس متوازن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک اور موڑ پر آکے تانگہ رک گیا۔ پختہ گندمی رنگت اور نیم پختہ عمر کے ایک پستہ قد، گراں ذیل شخص نے اچانک سامنے آکے دائیں جانب سے تانگے کا ہم پکڑ لیا۔ وہ ہم سے تقریباً جھول گیا تھا۔ موڑ کاٹنے کی وجہ سے تانگے کی رفتار بے حد سست تھی۔ تانگے نے کئی جھٹکے کھائے، کھوڑا جہنمانے، کوچوان چپٹے لگا۔ ”کدھر جی ہو؟“ تانگے کو روکنے والے شخص نے دباڑتے ہوئے پوچھا۔

کوچوان اور میرے بجائے اکبر علی خاں نے جلدی سے جواب دیا۔ ”استاد میدا کے پاس۔ ہمیں ان سے مانا ہے۔“ ان کی آواز سننا نہ ہی تھی۔ ”ای ہی ہیں او، ہیرو بھیا!“ تانگے کے پیچھے

بڑھتے ہوئے جھوم میں سے کسی نے ہانک لگی۔ ”ہم بھی کچھ لیت ہیں۔“ گینڈے جیسے جسم والے ہیر و نامی شخص نے غوث سے کہا۔ ”اچھا ہو پو، جو خود ہی ادھر آگیا۔“ یہ سنتے ہی تانگے سے چھلانگ لگا کے میں سڑک پر آ گیا۔

”ہالہ یہ میں ہی ہوں۔“ میں نے بلند آواز سے کہا تو مجمع پر سناٹا چھا گیا اور مجھے بحر میں بھجن بھناہٹ میں بدل دیا گیا۔ اس دم اکبر علی خاں نے تانگے سے اتر کے زور سے میرا بازو تھام لیا۔ ”یہ میں ہی ہوں، اچھی طرح دیکھ لو۔“ میں نے اپنی آواز قابو میں کی اور سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے استاد، چنا شہر کے راجا استاد میدا کو دیکھنے آیا ہوں۔“

”استاد میدا کو دو۔۔۔۔۔؟“ ہیر و خالص پوری لہجے میں کوا کو کھنچ کے اور پھر کے بولا۔ ”ہاں اسی کو۔ اسے میری تلاش ہے نا۔ تو میں خود اس کے پاس آ گیا ہوں۔ اسی سے ٹھوڑی بات کرنی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو یا اسے ادھر لے آؤ۔ فیصلہ نہیں بھی ہو سکتا ہے۔“ اکبر علی خاں نے مجھے جھنجھوڑا۔ ”میاں، میاں۔“ وہ ہدایتی انداز میں بولے۔ ”یہ آپ کیا پاگل بنا کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے، دیکھتے نہیں، ہم کہاں ہیں۔“

میں نے آنکھیں کھنچ کے انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی۔ ہیر و نامی شخص کی آنکھیں ابل پڑی تھیں، چہرے پر آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ وہ مجھ پر بھٹ پڑنا لیکن وہ ٹھہرا ہوا اور پھونکارتی آواز میں بولا۔ ”فیصلہ کرنا ہے؟ پہلے تو ہم تھرے آگے کھڑے ہیں۔“

”تم سے کیا بات کریں۔ تم سے اپنا کوئی پیر نہیں ہے اور تم ایسا چاہتے ہو تو گلی رکھو۔ تمہاری حسرت بھی نکال دیں گے۔ ادھر ڈاک خانے کی گلی

میں استاد کے تین آدمی دیکھے ہیں، تم کو بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے اپنے استاد سے پوچھ کے آؤ۔ بعد کو اسے کوئی شکایت نہ ہو۔" میں نے کہا۔

میں نے اچھی طرح بیرونی قسم کا تجربہ کر لیا تھا۔ وہ اڈے سے متعلق آدمی تھا لیکن کچھ لوگوں کی اڈے سے وابستگی اپنے تئیں وٹوش، استاد کی خدمت، مخبری کے کام وغیرہ سے بھی گہری ہوئی ہے۔ بیرونی لوگوں میں سے کوئی ایک تھا۔ چاقو بازی میں، ہو سکتا ہے، کبھی کوئی درک رکھتا ہو لیکن اس کا بھاری جیٹا چاقو بازی کے لیے لازم مستعدی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی دیر میں تین اور آدمی سامنے کھڑے اندرونی حصے سے لپکتے بلکہ بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ وہ صاف اڈے کے آدمی تھے۔ انہوں نے قریب آ کے ہمارا ٹانگا، تانگے کے پیچھے از دام اور اپنے ساتھی بیرونی کا غضب آلودہ چہرہ دیکھا تو جبران و پریشان ہوئے۔ بیرونی طرح بھنایا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں اُڑ رہیں اور گالیوں کے دوران اس نے ان تینوں کو میرے بارے میں بتایا۔ تینوں کو پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کی آنکھیں انکار ہونے لگیں لیکن انہوں نے بیرونی کے شانے قہقہے سے پر سکون رہے کا درس دیا۔ بیرونی جیسے لگے۔ ان میں سے ایک، زیادہ عمر کے آدمی نے بیرونی کا اوٹا نظر انداز کر کے خمارت سے مجھے مخاطب کیا "تو تم ہو او؟"

میں نے سر ہلانے پر انکشاف کی۔

"کاتم اپنے استاد سے ملو؟"

"ہاں۔" میں نے تندی سے کہا۔ "اسی لیے ادھر آیا ہوں۔"

"کا ہے کو؟" اس نے حاکمانہ لہجہ میں پوچھا۔

"اسی سے بات کرنی ہے۔"

"ہم کو تا پوچھو؟"

"تم اڈے کے مالک ہو کیا؟"

"اور استاد نا ہی مانو تو.....؟"

"مان لیں گے۔" میں نے یقین ظاہر کیا۔ "مان لیں گے۔ وہ اڈے کی چوکی پر بیٹھے ہیں، اور نہیں مانیں تو ہمیں آ کے جواب دو۔ پھر ہم دیکھیں گے۔"

"کا؟ کا دیکھو؟" وہ برہمی سے بولا۔

"نہیں کیا جاتا نہیں۔ اچھا ہے، تم جا کے استاد کو بتاؤ اور وقت برباد مت کرو۔" میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اڈے سے استفسار کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کو صورت حال سمجھنے، اپنے ساتھیوں اور شور مچانے والے لوگوں پر اپنا بھرم قائم رکھنے، مجھے پرکھنے اور خود اپنی تشفی کے لیے کچھ ہی نوعیت کی جھٹ کرنی چاہیے۔ وہ اڈے کا کوئی معتبر، معتد آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسے بھی بہر حال اپنے استاد کی خدمت میں مجھے پیش کرنے کی بے قراری ہوگی اور مجھ سے بات زیادہ بڑھ جانے کی صورت میں استاد کی ناراضی کا خدشہ الگ ہوگا لیکن یوں مجھے اچانک سامنے دیکھ کے اور میرا مطالبہ سن کے اسے فوراً ہی بھی نہیں بھرنی چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ساتھیوں کی نظر اندازی کے لیے پھڑک رہے تھے۔ بیرونی بھی سچ دہاں کھا رہا تھا۔ کسی وجہ سے وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھے اور وجہ ایک ہی ہو سکتی تھی کہ اپنے نسبتاً مہم ساسھی کا پاس خاطر ممانع تھا۔ مہم ساسھی، استاد میدا کا کوئی مقرب خاص ہوگا یا کوئی مشتاق، زور آور اور صاحب الرائے آدمی۔ اس میں کسی حد تک شبہ کی تھی۔

شبہ کی اور بردباری کی بھی اپنی ایک فضیلت ہے۔ میں نے استاد میدا کے سوا کسی اور سے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرا عزم، میرے لہجے کی پختگی سے غیاں تھا۔ اس نے مزید تکرار سے اجتناب کیا، ہنگامی بھر کے جلی ہوئی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جا کے مالک کو بولت ہیں۔ گے"

ہے، تمہارے کو سامنے دیکھ کے اوکو خوشی ہو دے گی۔" میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ اکبر علی خاں کے چہرے پر رنگ آ رہا ہے، رنگ چار ہے تھے۔ میرے اشارے پر وہ بدحواسی سے تانے پر سوار ہو گئے، پھر میں بھی۔ اگلی نشست پر ان میں سے دو آدمی کو چوان کے برابر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی تانگے نے حرکت کی، پیچھے ہجوم کا شور بڑھ گیا۔ وہ جو کہتے ہیں، کان پڑی آواز سنانی نہیں دیتی تھی۔ کئی میں کچھ دور جا کے مکانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور گنجائی بھی کم ہو گئی۔ کئی کا یہ حصہ کچھ چوڑا تھا۔ دونوں اطراف اونچے نیچے، کچے کے مکانات بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازوں، چھتوں اور کھڑکیوں پر لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ہمیں بہت آگے جانا نہیں پڑا۔ ادھر ادھر پھرتی ہوئی چھوٹی لال اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار کے کچ میں بنے لکڑی کے ایک بلند اور وسیع پھانک کے سامنے ناگ ٹھہر گیا۔ پھانک کے دونوں طرف کی دیواروں میں درمیانے سائز کی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیوار سے مل کر کمروں کی کھڑکیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشن دان تھے۔ اینٹوں کی بوسیدہ اوپری دیوار، قدیم طرز کی کھڑکیوں اور چھت کی منڈیروں کے نیچے روشن دانوں سے کسی ٹیل کا گمان ہوتا تھا۔ پھانک کے دائیں بائیں دیوار کے ساتھ کوئی سات آٹھ گز لمبے، گز، سوا گز چوڑے چھتروں پر اڈے کے آدمی منظر بانہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے تانگے کی آمد پر وہ چھتروں سے کود پڑے اور انہوں نے ناگ ٹھہرایا۔ زیادہ عمر کا آدمی تیزی سے تانگے سے اتر کے کسی سے کچھ کلام کے بغیر سیدھا پھانک کے کھلے بنگلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہجوم کچھ فاصلے پر آ کے ٹھہر گیا تھا اور اس کا شور بھی کم ہو گیا تھا۔ پھانک کے باہر موجود اڈے کے آدمی اصل معاملہ جاننے کے لیے وحشت زدہ ہوں گے۔ تانگے میں بیٹھا دوسرا آدمی بھی اتر گیا اور اس نے سرگوشیاں انداز

میں انہیں کچھ بتایا تو سب کی نگاہیں ہی پر مرکوز ہو گئیں۔

اکبر علی خاں اور میں تانگے میں بیٹھے رہے۔ یہ وقت مجھ پر تو جیسا گزر رہا تھا، مگر رہی رہا تھا۔ اکبر علی خاں شاید کچھ تار رہے ہوں کہ انہوں نے میری ہم رکابی پر کیوں اصرار کیا تھا۔ ہر طرف لوگ ہی کو گھور رہے تھے۔ یہ نگاہوں کا ٹھنڈ یا آنکھوں کا حصار بہت اذیت تاک ہوتا ہے۔ اڈے کے آدمیوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ شب اب محض شب نہیں رہا تھا کہ رخصی ہو جانے والے آدمی کی حالت یا تو زیادہ خراب ہے یا وہ ختم ہو گیا ہے۔ کوئی معمولی قسم کا زخم ہوتا تو ہجوم کی کیفیت ایسی اضطرابی نہ ہوتی۔ مہم آدمی کو وہاں ہی میں دیر لگ گئی۔ یہ تاخیر میرے لیے تشویش کا باعث ہوئی چاہیے تھی۔ اکبر علی خاں بھی بے دم سے بیٹھے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ مہم آدمی کے ساتھ میں بھی تانگے سے اتر کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ اس نے مجھ سے انتظار کرنے کو کہا بھی نہیں تھا، نہ اپنے ساتھ اندر چلنے کا کوئی عندیہ دیا تھا۔ میں خود ہی ٹھہر گیا تھا۔ اندر یا تو میدا سے اس کی ملاقات فوراً نہ ہوگی یا وہ میرے بارے میں اپنا رد یہ معین کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے باہم مشورت میں مصروف ہوں گے۔ انتظار کرانے کی یہ حکمت دانست بھی ہو سکتی تھی، اپنا اثر و تسلط قائم کرنے کی ایک کوشش، منظر شخص کے اعصاب اور حواس کی آزمائش اور یوں اسے نفسی طور پر پس پا کرنے کی تدبیر۔ تانگے سے اتر کے پھانک کے بنگلے دروازے سے سیدھے اندر چلے جانے کی جسارت اب قریب عقل نہیں تھی۔ جلد پانچ بج رہی تھی کہ بہر حال اندر سے آنا تھا اور مجھے انتظار کرتے رہنا تھا۔

چندہ منٹ گزر رہے ہوں گے یا نہیں۔ میرے لیے تو یہ وقت بہت طویل تھا۔ اندر سے وہی شخص

نمودار ہو اور اس نے قریب آنے کے بجائے پھانک کا دروازے پر کھڑے کھڑے جھڑکنے انداز میں ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ دعوت کیا، حکم دیا۔ میں نے اکبر علی خاں کو سوال طلب نظروں سے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ اندر چلنے کے لیے آمادہ ہیں یا تانگے میں بٹیرے رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی، وہ میرے ساتھ ہی تانگے سے اتر پڑے۔ میرے اندر چلے جانے کے بعد ان کا ہر ٹھیرے رہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ اسنے لوگوں کی موجودگی میں تنہائی اور کشائش ان پر بڑی گراں گزرتی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ پھانک کے اندر قدم رکھا۔

پھانک کا اندرونی حصہ کسی ڈیوڑھی کے مانند تھا۔ اندر یہ ڈیوڑھی پھانک کے طول و عرض سے کہیں زیادہ کشادہ تھی۔ دائیں بائیں دو کمرؤں کے مساوی چھت سے ڈھکی ہوئی جگہ بھی اس میں شامل ہوئی تھی۔ یہاں چار پائیاں بچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گھڑ دوڑی پر گھڑے رکھے ہوئے تھے اور پانی پینے کے لیے گھڑ پامنی کے آب خوردے۔ دیواروں میں جا بجا بنائی طاغوں میں طرح طرح کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ فرش صاف ستھرا تھا۔ پھانک کے سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا اور خاصی دور تک کچی زمین دکھائی دیتی تھی اور کہیں کہیں سبزہ بھی اگا ہوا تھا۔ تیز قدموں سے ہم نے عمر آدمی کی پے روی میں پھانک کا اندرونی حصہ عبور کیا اور اینٹوں سے استوار گزرگاہ پر آ گئے۔ گزرگاہ دائیں طرف مز جاتی تھی اور جس بچیں گز کے فاصلے پر قدیم طرز کی ایک چوکور عمارت پر تمام ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ میرا قیاس تھا، اندر بھی کے ساتھ انھی ہوئی دیوار سے پیوست کونٹیوں جیسے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ عمارت اور ان کمرؤں کے سامنے کھلی جگہ وافر تھی۔ اسے چھوٹا میدان بھی کہا جاسکتا ہے۔ میدان کے ایک گوشے میں رواجی اکھاڑا نظر آ رہا

تھا۔ اس کے ارد گرد گلدرو، ڈمبلو، وزن اٹھانے، مل کرنے، الزائیکے اور بازو بنانے کے ساز و سامان کچھ زمین میں نصب، کچھ ادھر ادھر پڑا ہوا تھا۔ کچی دیوار کے سوا چار دیواری کی... باقی تین اطراف کی دیواروں سے آگے قریب قریب بلند اور منجھان درخت ایستادہ تھے۔ یہ درخت بھی کسی فصیل کی طرح تھے۔ پھانک کے دائیں جانب واقع عمارت، چار دیواری کے رقبے کے اعتبار سے چھوٹی لیکن یوں بہت بڑی تھی۔ رنگ روغن پرانا ہو چکا تھا۔ چھت کے گنگوڑے آدھے سالم، آدھے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ساری عمارت اونچے اور موٹے موٹے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی اور کسی قدر اونچائی پر تھی۔ اندر خانہ ضرور ہو گا۔ ممکن ہے، کبھی کسی صاحب ثروت، کشادہ دل کی عیوبی رہی ہو اور اس نے اڈے کے کسی استاد کے کارنامے پر خوش ہونے کے دان کردی ہو اور اڈے کے آدمی بعد میں اپنی ضرورت کے مطابق اکھاڑ پھینچا کر رہے ہوں۔ میں نے اڈے کی کوئی ایسی عمارت بھی نہیں دیکھی تھی۔

گزرگاہ ختم ہونے پر چند قدم کا زینہ طے کر کے عمارت کا منتقل، سال خوردہ چوٹی دروازہ تھا۔ دروازے پر لوہے کے کڑے نصب تھے اور ڈھلی ہوئی نوکیں۔ شاید عرصے سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ گھڑی خاک و حول میں الٹی، فرش میں دھنسی ہوئی تھی۔ دروازہ ایک چوڑی اور روشن راہ داری میں کھلتا تھا۔ ایک نظر میں سارا نقشہ سمجھ میں آ گیا۔ آٹے سامنے اور دائیں بائیں چلتی ہوئی راہ داری چار حصوں میں عمارت تقسیم کر دیتی تھی۔ چاروں طرف بھی اسی طرح کے دروازے ہوں گے عمارت کے دوسرے سرے پر سامنے کا دروازہ تو نظر آتی ہی تھا۔ وہ بھی چھوٹا کھلا ہوا تھا۔ کچھ دور بعد راہ داری، ایک بڑے صحن میں ختم ہو کے، صحن کے بائیں اسی سیدھ میں دوبارہ شروع ہو جاتی تھی اور مقام

دروازے تک جاتی تھی۔ صحن میں پہلی دھوپ کی روشنی افراط سے تھی۔ اس کے اطراف عراب وار والائوں کا سلسلہ تھا۔ ان کے پیچھے کمرے تھے۔ ستونوں اور محرابوں سے بنیں لکڑی ہوئی گھنٹیں، انہیں تراشا نہیں جاتا تھا اس لیے خود پر بار لگتی تھیں اور چھت پر چڑھ گئی تھیں۔ عمارت اندر سے اتنی شکستہ نہیں تھی جتنی باہر سے دکھائی دیتی تھی۔ اندر زندگی رواں دواں تھی۔ اڈے کے کئی آدمیوں سے پہلے تو گزرگاہ ہی میں سامنا ہوا تھا، پھر راہ داری میں بہت سے بے تابانہ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں اندر کی جانب بڑھتا دیکھ کے سنبھلے گئے۔ گلی سے بھی کچھ لوگ ہمارے ساتھ بھاٹک میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے اور اکبر علی خاں نے پیچھے مڑ کے ان کی تعداد جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی چاپوں اور سرگوشیوں سے ایک اندازہ ہی کیا جاسکتا تھا۔

راہ داری سے گزرتے ہوئے لگ رہا تھا جیسے ہم اڈے کے استاد کے سامنے نہیں، کسی سردار کے دربار میں جا رہے ہوں۔ راہ داری سے صحن اور صحن کے بارسیدھے ساتھ کی جانب والان کے پاس آکے صحرآدی پلٹ گیا اور اس نے ہاتھ اٹھا کے عقب میں آئے والے آدمیوں کو روکا اور قریباً سہ گز کی چوڑے والان سے گزرنے کے پہلے چڑنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

عمارت کتنی ہی مختلف ہو مگر یہ جگہ کسی اڈے کی جھنک ہی تھی، کسی وسیع ہال کے مانند وسیع و عریض کمرہ ہر طرف رنگ برنگے شیشوں کی کھڑکیاں، دیواریں گھل بونوں سے مریض۔ نقاشی و بنا کاری زوال آمادہ ہوں تو دید باز کا جسم اٹھنے لگتا ہے۔ دیواروں پر کدہ گل بوٹوں کی بھی ایک آب پادی چاہیے۔ کسی وقت یہ کمرہ شیش محل چلیا کوئی دیوان خانہ ہوگا۔ ستاروں کی طرح چھت اور دیواروں پر جڑے ٹیش تراشیدہ پارے اپنی جگہیں ترک کر چکے تھے۔ درمیان کی کشادہ جگہ کے بعد، دروازے کے صحن

مقابل، دیوار کے وسط میں ایک کم قامت مگر بڑی چوکی پر چند آدمیوں کے ساتھ گاؤٹیکے سے کمر کائے جو کھس سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا، وہی استاد میدا ہو سکتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو اطراف بھی دیواروں سے پیوست، چوڑائی میں مختصر چوکیوں اور درمیانی فرش کے کھلے حصے پر پہلے سے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ سب کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔ ان کے چہروں پر جھپٹا اضطراب درون خانہ کیفیات کا غماز تھا۔ سرگوشیوں کی ایک گونج کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے فرش پر بیٹھے لوگ ادھر ادھر سمٹنے لگے۔ سامنے کی بڑی چوکی سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ہم بصر لگے۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے آدمی نے ہمارے اتنے قریب آ جانے اور بصر جانے پر پہلو بدل کے

خفے کی نے منہ سے لہائی۔ ایک اضطرابی نظر آس پاس موجود لوگوں پر ڈالی اور خاموش رہا۔ اس کا تہ متوازن، جسم ٹھکا اور کھٹا ہوا تھا، تاہم طبی رنگت، گول چہرہ، نقش و نگار بھرے ہوئے، سر کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی کی آمیزش، گھٹے اور گھٹکھ پالے، رومن آلود اور سلیقے سے چھپے کی طرف کڑھے ہوئے، تنگ پیشانی، اتنی تنگ بھی نہیں۔ شمالی رنگت کے باریک تنگی کرتے اور چھوٹی مہری کے سفید پاجامے میں لمبوں۔ باریک کرتے سے اندر پہنی سفید ہنڈی جھٹک رہی تھی۔ گلے میں تنگ کے دانوں سے مشابہ نیلے پتھروں کی مالا، دائیں کھائی میں چاندی کی مختصر دریا، چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں، گہری، کسی قدر اندر دھنسی ہوئیں اور یہ حد چمک دار۔ ریدے سے متحرک تھے۔ خوب جاتی چوبند، چالیس پینتالیس عمر ہوگی۔ اپنی ظاہری وضع قطع سے وہ اڈے کے دادا کے بجائے کوئی مستعد، اپنے ماکہ دور سے بھانپ لینے والا دکان دار معلوم ہوتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ پاس کا کوئی حاشیہ بردار کسی سرگوشی کی ابتدا کرے، میں نے ہاتھ اٹھا کے اس کی طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ ”تنبہی استاد میدا ہو؟“ ادھر کے دادا؟“

اس کے جسم میں موج سا نمودار ہوا اور چٹکیلی آنکھوں سے مجھے سر ہٹا دیکھا کیا اور چپ رہا۔ اس کے پہلو شیش ایک پختہ کار آدمی نے زبان کھولی۔ ”ایسی کابا ہے؟“

”تم استاد میدا ہو؟“ میں نے ناگواری سے پوچھا۔

مجھ سے مخاطب آدمی کسمسا گیا، پیشانی پر ٹھکنوں کا حال بڑھ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ بے اختیار اس کی نظریں بچ میں بیٹھے شخص پر اٹھیں۔ ”ہمیں صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔“ میں نے اپنی آواز تھاہے رہی اور کئی انداز میں کہا۔

”ایسی کابا ہے؟ ہم کو بولو بھیا۔“ صحر رسیدہ آدمی مصمتی غوت سے بولا۔

”تم کو بولانا، اپنے کو صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔“ میں نے غی سے کہا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ چوکی پر سب سے نمایاں شخص ہی استاد میدا تھا۔ اکبر علی خاں، استاد میدا کو پہچانتے تھے۔ وہ بھی مجھے اشارہ کر سکتے تھے، اچھا ہی ہوا، انہوں نے دخل نہیں دیا۔ ان کے لیے یہ جگہ بڑی اجنبی ہوگی۔ اپنے حواس کی بحالی کے لیے لازماً انہیں کچھ وقت چاہیے تھا یا انہوں نے مصطفیٰ خاموشی شعار کی۔

استاد میدا کے آزمودہ کار ساتھی کے چہرے پر براہی ہو یہ اچھی تھی۔ وہ اشتعال میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد میدا نے اسے روک دیا اور پہنچی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ ”ہم میدا ہیں۔“

”تنبہی ادھر کے استاد ہو؟“ میرے لہجے میں تجسس شامل تھا، طرز بھی۔ ”پنشا شہر کے راجا؟“ ”کام کی بات بولو۔“ میدا اکھڑی ہوئی آواز

میں بولا اور گاؤٹیکے پر کمر سیدھی کر لی۔ ”کام کی بات ہی بولتے ہیں اور قہل رکھو، ہم کو زیادہ بات بھی نہیں کرنا۔“ میں نے اوپنی آواز میں کہا۔ ”میدا استاد، ادھر اڈے پر بیٹھنے سے تو نہیں گھٹتے۔ تھوڑا بہت تم کو اڈے کا رہی رواج بھی معلوم ہوگا۔“

اس کا منہ بن گیا اور بے چینی سے بولا۔ ”گھٹائی پھرانی کے کاہی بات کرت ہو؟“ صاف صاف بولو۔“

”ہم ادھر پینا شہر میں آگئے ہیں۔ تمہارا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ اڈے کی ریت ہے، اڈا اس کے پاس رہتا ہے جو اس کا بل رکھتا ہو۔ تم یہ ریت بھول گئے ہو تو ادھر بہت سے تمہارے پالتوم کو یاد دلادیں گے۔ اڈا راج پات نہیں ہوتا، راجا مرے تو راج گارنتت پر بیٹھ جائے۔“

میدا کی دھنسی ہوئی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ارد گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے بھڑکنے لگے۔ صحر ساتھی کچھ زیادہ ہی تنگ خوار، وفا شعار تھا کہ اس کا جسم بل کھانے لگا۔ اوروں کا بھی یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ اسی لیے اکبر علی خاں نے آہستہ سے مجھے اپنی ماری اور ایک آن کے لیے سہی، زیر دہر کر دیا۔ یہ موقع انہیں سرکش کرنے کا نہیں تھا۔ میں تو انہیں ساتھ آنے سے منع کر رہا تھا۔ اب یہاں سے ان کے داہیں چلے جانے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے اور جو کچھ ہے، مجھے اپنے آپ نسنے اور بھٹکنے کی درخواست کرنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔

یہ حدشہ برہمچہ موجود تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی بات، منت گزاری وغیرہ نہ کرنے لگیں۔ مجھی سے غلط ہوئی۔ انہیں ساتھ رکھنے کی کوئی تنگ نہ تھی۔ وہ کتنا ہی مصر ہوتے، مجھے صاف انکار کر دینا چاہیے تھا۔

چند لمبے توقف کے بعد میدا کی ٹھہری ہوئی آواز گونگی۔ ”جانت ہیں، اپنے کو سب پتا ہے مہا

راج اسارے ریتی رواج کا، جو نہیں جانے ہیں،
ان کو جوتانے تم ادھر آئی گیو ہو۔“

مجھے حیرت ہوئی، اس نے خلاف توقع خود کو
تیابو میں رکھا تھا۔ ٹھٹھل کہا تھا، اڈے کے استاد کا یہ
ٹھٹھل دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا تو وہ
صورت حال کی نزاکت بھانپ گیا ہے، اپنے
مقابل کی بے باکی اور طنز آمیز طور کا اسیر ہو گیا ہے
یا اسے خود پر حدود بے اعتدال ہے۔ سوا گلا قدم
اٹھانے سے پہلے استاد کے سادہ و سفید کتھن، اس
کی پیمائش کر لینا بہتر رہتا ہے مگر شاید کسی نظر پانی کا
مرطبانہ نام ہو چکا تھا۔

”چاقو نکالو استاد! تم کو بولانا، اپنے پاس وقت
کم ہے۔“ میں نے جھڑکنے لگے میں کہا اور اسی دم
جیب سے چاقو نکال کے تیزی سے کھولا اور خاصی
بلندی پر اچھال کے چابک زنی سے دوبارہ ہاتھ میں
اچک لیا۔ اتنی بلندی پر چاقو اچھال کے دوبارہ
گرفت میں لینے کے لیے نگاہ جمائے رکھی پڑتی
ہے۔ ٹھٹھل کے بقول، منتظر ہاتھ کو نگاہ کا باندھ کر دینا
چاہیے۔ اس توازن سے کسی بچھڑانے کا امکان کم
سے کم رہ جاتا ہے۔ میں نے بہر حال ہر ممکن احتیاط
کی تھی۔ میرے چاقو نکالنے پر بھی بے قرار ہو گئے
تھے، جو بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ساتھ
بہت سے چاقو کھٹکنے کی آواز آئی۔ وہ میدا کے
اشارے کے منتظر تھے۔ میدا کا سکون سکوت دیکھ
کے شاید انہیں مایوسی ہوئی۔ ایک اور وجہ بھی ان کے
ٹھٹھل جانے کی ہو سکتی ہے۔ میں نے چاقو واپس
اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”تم اپنے کو یہاں سے باہر کر دینا چاہت
ہو؟“ میدا نے ہلکا ہلکا ہندی سے کہا۔ ”ٹھٹھک ہے
ساب بہادر! لگت ہے، تمہارے پاس سے بہت کچھ
ہے پر ابھی تیری عمر باریک بینی سے؟“
”ہماری جانے دو استاد، اپنے لیے سوچو۔“
میں نے درستی سے کہا ”تمہاری سخی رہ گئی ہے،

تمہارے دن ضرور پورے ہو گئے ہیں۔“

اس نے سر جھکا دیا اور لمبے بھر بعد اٹھا یا تو اس کی
آنکھیں بھی ہوئی تھیں، پھر اسے جھرجھری سی آئی
جتنے کا ایک کس نے کچھ ٹھٹھکا۔ آمیز انداز میں بولا۔ ”پر
ایک بات پوچھت ہیں جو اسباب..... تم کو ادھر راج
ٹھٹھکان سے ہٹا دینے چاہیے کیوں پڑت ہو۔“ یہ
کہتے کہتے اس کا لہجہ ٹھٹھکی ہو گیا۔ ”کیوں اپنی جان
کے پیری ہو ہو۔ الٹ گیتو سارا۔ تم خود ہی بولت
ہو، ہم بھی کسی بوتے پر ادھر راج گلدی سنبھالے
بیٹھت ہیں۔“

”جانتے ہیں اچھی طرح..... ایسے ہی کسی نے
تھالی میں رکھ کے اڈے کی گلدی تمہارے آگے نہیں
کردی ہوگی۔ بل کا تو زہل ہی ہوتا ہے۔ دوسرے
میں دم ہے تو پہلے کو جانا پڑتا ہے۔ اڈوں پر بھی
الٹ پھیر رہتا ہے۔ ایک جاتا تو دوسرا آ جاتا ہے۔“
میں نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اپنے کو کم سے
بیر نہیں پر اپنے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تم نے۔“
”ہاں میں! ہم ایسا کاکیت ہیں؟“ اس نے
تشنہ انداز لہجے پر کمرے میں موجود ہجوم کی ٹہنی چھوٹ
گئی۔ میدا نے انہیں ڈانٹا اور پلٹیں بھپکاتے ہوئے
بولا۔ ”تمہاری ماں نے تو کوئی سکایت نہیں لگائی
میری؟“

”میں تم سے زیادہ بولنا آتا ہے استاد۔“ میں
نے ضبط کیا اور سخی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا ہے،
زبان بچنے کے رکھو۔ ہاتھ پاؤں اور چاقو کا بل بھی
نہیں، اڈے کے استاد کے اور بھی بل ہوتے ہیں۔
وہ تم کو بعد میں بتا دیں گے۔ پہلے تو چاقو نکالو اور
کرو گے تو تمہارے پیر پٹھو، تمہاری طرف دیکھنے والے
کیا سوچیں گے۔“

دھرج دھکو بلما! یہ اپنے کو آگے پیچھے سے پورا
جانت ہیں۔ ”میداسر جھک کے بولا۔ ”ٹھٹھوڑی جو
کئی رہ گئی ہے، آج جان جاویں گے۔“
میداکے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار

آئی۔ گردن گھما کے اس نے چوکی پر بیٹھے اپنے
ساتھیوں کو دیکھا اور کسی قدر ہچکچاتے ہوئے
بولا۔ ”تمرا کھیال آوت ہے، آدمی دیکھ کے ہی ہم
چاکو کھولت ہیں۔ ادھر بہت سے تمہاری جوڑی کے
ہیں۔ پہلے ان کو ٹھٹھک لیاؤ، بعد کو ہم، سامنے آ جاویں
گے۔ جلدورت پڑی تب.....“

”ٹھٹھک ہے۔“ میں نے جھڑکنی آواز میں کہا۔
”ٹھٹھک ہے، ایسا نہیں نہیں ہوتا۔ پر تم سامنے آنے
سے بھڑکتے ہو یا تمہاری کمر میں موج آگئی ہے تو
اپنے کسی سورا کو آگے کر دو جس پر تم کو اپنے سے
زیادہ بھروسہ ہو..... اور ایک بات جان لو! استاد خود
سامنے آئے یا بدلے میں اپنے کسی رستم کو آگے
کر دے۔ رستم کے الٹا ہو جانے پر چوکی سے پھر
استاد ہی کو نیچے آنا پڑتا ہے۔“

”جانت ہیں، جانت ہیں۔“ میدا کی آواز
مجھ سے گئی۔ ”پر اتنا آگے کا کیوں سوچت ہو۔“
”آگے کا ہم کو معلوم ہے۔ اس لیے ایسا بولتے
ہیں۔“ اس ٹہنی لہجے سے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار
منصوب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور بھڑکتا، میں نے
کہا۔ ”اور ایک بات بولیں استاد!“
وہ پلٹیں پٹ پٹانے لگا۔ اس کے نتھنے بھول
گئے۔

”اچھا ہوگا، تم خود ہی چوکی سے ہٹ جاؤ۔
ایسے استاد کو چوکی چھوڑ دینا چاہیے جسے اپنے بل پر
بھروسہ ہی نہ رہا ہو۔ تمہارے اڑنے کے بعد
تمہارے کسی ہڈ حرام کو لاج آئی، کوئی بھی اپنی جان
کا دشمن اٹھا تو فیصلہ ہمارے ہی ہو جائے گا، ایک
ایک کر کے آخری آدمی تک اڈے کے استاد کے
سر پہ تھوڑی دھتی ہے۔ باہر کا نہیں، اڈے کے اندر
بھی تمہارے کسی سر پہرے کو مستی سوچھ سکتی ہے۔ یہ
تمہارے آمنے سامنے بیٹھے، تمہاری مالا چٹنے والا
میں کسی کا بھی سر کسی وقت لوٹ سکتا ہے، سمجھتے ہو
تمہاری بات؟“

اتنی دیر میں ترانیاں سن کے اڈے کے استاد کا
کوئی بھی شیدائی بے لگام ہو سکتا تھا۔ ٹھٹھکے اڈے
پر ٹھٹھل کے سامنے کوئی اس طرح دعوائی نہ کرتا تو
ایک نہیں، ٹھٹھل کے کئی پروردہ بے قابو ہو جاتے۔

اکبر علی خاں نے کبھی مار کے ایک بار بھر مجھے
منتشر کیا۔ ان کی موجودی کسی بوجھ کی طرح مجھ پر
مسلط تھی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ان کا
چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان کی دگرگوں
حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

میرے ساتھ آنے پر اب شاید انہیں بچھڑاوا
ہو رہا ہو۔

بے ٹھٹھک ہم چاروں طرف سے اڈے کے
سرکش اور ٹھٹھل آدمیوں کے نرٹے میں تھے۔ اب
تک نہیں تو کچھ بعید نہ تھا کہ دوسرے لمبے استاد میدا
کے کسی بہت دیوانے کے دماغ میں اپنے استاد کے
سامنے کچھ کرکڑ رجانے کا سودا ہو جائے۔ اڈے پر
موجود ہر شخص اس سرخ روئی کے لیے بے تاب
ہو گیا۔ اکبر علی خاں ایک ذہن، ہنست کار، معاملہ فہم اور
اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ ولایت میں دکالت کی تعلیم
حاصل کی تھی۔ ایک دنیا دہی تھی۔ جلد یا بدیر انہیں
یہ نتیجہ اخذ کر لینا چاہیے تھا کہ میری یادہ کوئی بے حس
ہے کہ بے سبب۔ چاقو پر میری دست دس کا انہیں علم
نہ تھا لیکن شناسائی کی اس مختصر مدت میں انہیں اچھی
طرح میرے ہوش و حواس کی درستی کا اندازہ ہو جانا
چاہیے تھا۔

اصل تو یہی ہوش و حواس کا توازن، ان کی
درستی ہے۔ کسی غیر ارادی، ناگہان لغزش کا امکان تو
بروقت رہتا ہے۔ یہ اڈا، یہاں کے لوگ، سبھی کچھ
چھپے لیے اجنبی تھا۔ میدا اور اس کے آدمیوں کی
ٹھٹھکی سے میرا ارادہ، آئندہ اقدام شرط تھا اور
ایک نہیں، بیک وقت کئی سمتوں اور پہلوؤں پر نظر
رکھنی لازم تھی۔ اڈے کے استاد اور اس کے حاشیہ
برداروں کو اڈے کی وضع اور طور طریقوں کی تلقین،

ان پر مسلسل اثر اندازی، ایسی دلیلوں کی پورش جو ساختہ اور بے وزن نہ ہوں اور حاصل یہ کہ کسی تاخیر کے بغیر اپنے مقصد کا حصول۔ ٹھیک کہنا تھا کہ دلیل کی کاٹ جانے سے تیز ہوتی ہے اور شخص جھٹ پر مبنی ہونو کنہ چھلنے کا کام بھی نہیں کر پاتی۔ وہ کہنا تھا، دلیل کو دہانی نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ان کا دوازیہا شدید ہو کہ مخاطب بدحواس ہو جائے یا ہو جائیں، عقل و ہوش سے عاری۔

میدانہ ظاہر اتنا مضطرب نہیں لگ رہا تھا جتنا اس صورت حال میں اور میری لاف زنی سے ہوتا چاہیے تھا۔ اس کا حال کچھ عجیب تھا۔ بھی چہرہ ٹھنڈا جانا، آنکھیں سرخ ہو جائیں اور بھی ایسا لگتا جسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور سنا ہے تو اعتبار کے لائق نہیں سمجھا۔ بیش تر وہ مطمئن اور مستعد نظر آتا رہا تھا۔ یقیناً زور کے علاوہ اپنے دوسرے اوصاف کی وجہ سے وہ اتنے بہت سے لوگوں اور پٹنا ایسے خاصے بڑے شہر میں ممتاز ہوا ہوگا۔ کسی قدر وقت کے بعد وہ ٹیکے لگے میں بولا۔ ”پوری طرح سمجھ میں آوت ہے سب! ساتھ تیار مان بھی دیکھتے ہیں۔“

”نہیں ہوتا تو اس طرح منہ اٹھائے، سینہ پھلائے سامنے نہیں آجاتے۔“

”سمجھو جتنی دیر تم کو ادھر گدی پر راج کرنا تھا، اتنی دیر ہم کو بھی لگتی تھی۔ ابھی تم کو بولانا تم نے یہی ایک راستہ لھلا چھوڑا تھا، نکلنے دوسرے بھی تھے لیکن اپنے پاس وقت نہیں ہے۔“

”ابھی بھی کا جلدی؟ تم تو ادھر چوکی پر راجا بن واسطے آؤ ہو۔“

”اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا ادھر آنے کا، تمہاری چوکی، راج گدی سے اپنا کیا ہیر، پر اور راستے اسی

طرح کھلیں گے۔“ میں نے ایک چابیے سانس لی اور جھکے میں کہا۔ ”اور ویسے بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تم جیسے استاد کو شہر کے اڈے کی چوکی پر نہیں ہوتا چاہیے۔ اڈوں کے لوگ چوراہے، اٹھالی کیرے نہیں ہوتے۔ علی کے کٹوں کی طرح انہیں بھونکنے کاٹنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا جاتا، گلوں میں پٹا ڈالا جاتا ہے۔ اپنا بھی تھوڑا بہت اڈا کیروں سے ساتھ رہا ہے۔“

”دوسری جگہ یہ پکا ہو رہے ہے؟“ میدانے آنکھیں پھاڑ کے پوچھا۔ میری رخ کھائی کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

”دوسری جگہوں پر ایسا اندھیر نہیں ہوتا۔“

”رستہ کھلا رکھتے پھر تھرے لیے؟ ہاں بھیا جدھر تھرا من کرے، کل پڑو۔ تم ادھر دن کے اجالے میں اپنے تین آدمی پر ہاتھ اٹھاؤ، دو کو آدھا کر دو، تیسرے کو ٹوکھانے لگائے دیو۔ ہاں۔“

”اور اب چوتھے کی باری ہے۔“ میں نے دہکتی آواز میں کہا۔

میدان کا ٹھیرا مصنوعی تھا۔ اس کے جسم میں لہریں اٹھیں۔ قریب بیٹھے سا بھی بھی اپنی جگہوں پر سنے اور بندھے نہ رہ سکے۔

”میں..... میں..... مجھے کچھ بولنے کی اجازت ہے؟“ کا ایک اکبر علی خاں نے ایک قدم آگے آگے چھلنے ہوئے کہا۔ سبھی چونک پڑے۔ اکبر علی خاں کا لہجہ مفاہانہ اور ہاتھ احتجاجی اور کسی قدر فریادی انداز میں اٹھا ہوا تھا۔

اکبر علی خاں نے میدان کو مخاطب کیا تھا۔ میدان کی آنکھوں میں چمک ہو پیدا ہوئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے سختی سے اکبر علی خاں کو متنبہ کیا۔ ”آپ کچھ نہیں بولیں گے۔“

”بولو وکیل ساب!“ میدان فیا ضا نہ تیور سے بولا۔ ”کا، کا بات ہے؟“

”نہ کریں۔ یہ اس لائق ہی نہیں۔“ میں نے اکبر علی خاں کو دوبارہ منع کیا۔

”بولو وکیل ساب! بولو۔“ میدان بے چینی سے بولا۔

اکبر علی خاں کی حالت اضطرابی ہوئی، بے چارگی سے میری طرف دیکھا کیے، بھی میدان کی طرف۔

”یہ عدالت نہیں ہے جناب، ان لوگوں کو آپ کی زبان نہیں آتی۔ آپ اپنا کا ضائع کریں گے۔“ میں نے تلقینی لہجے میں کہا۔

”میں صرف، صرف حقائق بتانا چاہتا ہوں۔“ اکبر علی خاں سختی سے آواز میں بولے۔

”مگر کس سے؟“ یہ شخص اندھا بہرا ہے کیا؟ سبھی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اسے آنکھوں دیکھا نہیں بتایا ہوگا کیا؟“

اکبر علی خاں کا جسم بل کھانے لگا۔ میدان غور سے سن رہا تھا۔ ”آپ کا اس اونچا سر والے ہوا ساب سے کوئی رشتہ نانا لاگت ہے کا، وکیل ساب؟“

”نہیں میدان بھائی، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اکبر علی خاں نے نپا تلا جواب دیا۔

”اوہی تو ہم بھی سوچیں ہیں، آپ ان کے بات کیسے چڑھ گئے۔ ای، اکبر علی خاں کو باج، بل بھر میں جمیں آسان تل پت کر دیوں۔ آپ کچھری عدالت کے بندھو، کھا نہائی بھلے ماس، سہر میں آپ کے نام کا ڈکارت ہے۔“ میدان کا طنز مضحکہ آمیز تھا اور کچھ ایسا کاری نہیں تھا۔ اس نے بد ظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ”پھر کا ہے؟“

اکبر علی خاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے میدان سے کہا۔ ”سارا رشتہ نانا ابھی صاف کر دیں گے۔ پہلے چاؤ کا کوا استاد!“

میدان نے میری برہمی پر توجہ نہیں دی اور اکبر علی خاں سے بولا۔ ”ہاں وکیل ساب، ہم آپ سے کچھ

پوچھتے ہیں۔ کب سے جانت ہو آپ اپنے سیر ہر خاں کو دوبارہ منع کیا۔

”زیادہ دیر سے نہیں۔“ اکبر علی خاں نے ممانعت سے جواب دیا۔ ”ابھی دوپہر سے۔“

”ابھی اسی دوپہر باسے سے؟“ میدان بلیکس جھپکنے لگا۔ ”اور علی میں آپ بھی تھے کا؟“ ”نہیں صاحب، میں وہاں نہیں تھا۔“ اکبر علی خاں نے مضطربانہ سر ہلایا۔

”پھر آپ..... آپ؟“ میدان کے چہرے پر کش مکش نمودار ہوئی اور چپکارتی آواز میں بولا۔ ”بولانا وکیل ساب! ہم کا سب، سب کھل بتا دو۔“

”بھترے آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ میں نے برکتی سے کہا۔ ”اور زمینان رکھیں، میں اس منہ زور، اس بن ماس کو دکھ لوں گا۔ یقین کیجیے، اس کا وقت آگیا ہے۔ اس کے سامنے کسی وضاحت اور دلیل و جھٹ سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ دوسری طرح کا آدمی ہے۔“

”خدا کے لیے مجھے کچھ بات کرنے دیجیے۔“ اکبر علی خاں نے شکستہ لہجے میں مجھ سے منت کی۔ ان کی عاجزی اور رنجیدگی یہ ناراضی غالب تھی۔ مجھے میری بدگمانی اور سخت زبانی سے باز رکھنے کے لیے بس ان کا ہاتھ جوڑنا ہی رہ گیا تھا۔ کسی آخر کوشش کے طور پر انہوں نے حتی انداز میں سرگوٹی کی ”بعد کو آپ کو اختیار ہے۔ آپ کہتے ہیں تو چلا بھی جاؤں گا میں۔“

”کا، کا ہے؟ ہم سے بولو وکیل ساب، بے ہتھر ہوئی کے ہم کا بولو۔“ میدان بے قراری سے بولا۔

میرے لیے اب خاموش ہو جانا ہی مناسب تھا۔

”میرا ان صاحب، اس نوجوان سے کوئی تعلق نہیں ہے میدان بھائی۔“ اکبر علی خاں نے میری خاموشی پر گہری سانس بھری اور دونوں لہجے میں

مقبول ترین مصنف **محی الدین** جن کی کہانیاں آنکھوں سے نہیں لوں سے پڑھی جاتی ہیں

8 بہترین کہانیوں کا مجموعہ

کچرا گھر

کانیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

خوبصورت

گیٹ اپ

قیمت 100 روپے

بالغ 25 روپے

کمپیوٹرائزڈ

کتابت

محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ "ایمان کا سفر" بھی دستیاب ہے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 021-5804300 ای میل: kitabiat1970@yahoo.com

C-63 فیروز ٹیکسٹائٹیشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (آخر کا لوہی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

کہا۔ "میں آپ کو جانتا ہوں، میں اور یہی بچے گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ انہوں نے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ یہ اس شہر میں اچھی ہیں اور بہت پریشانی میں ہیں۔ پیچھے پوچھیں۔ ساری بات بتائی کے پٹنا شہر میں آنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو آگے جارہے تھے کہ سفر میں کل رات ان کے بڑے بھائی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ جلد علاج کے لیے انہیں آگے کا سفر ملتوی کر کے پٹنا شہر رکنا پڑا اور انہوں نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ رات بھر بھائی کے سر جانے اسپتال میں رہے۔ آج صبح بڑا ڈاکٹر مریض دیکھ کے جا چکا تھا۔ انہوں نے نرس سے اجازت لی اور درشتے داروں کو بھائی کی حالت کے بارے میں تار دینے کے لیے یہ بڑے ڈاک خانے گئے تھے کہ ان کا بڑا کسی نے نہیں لیا۔ انہوں نے اس کا پتھا کیا۔ وہ آدمی بھاگتا ہوا ڈاک خانے کی بازو والی مٹی میں داخل ہو گیا اور اس نے ایک جگہ ان کے بالکل سر پہ آ جانے پر چاقو تان لیا۔ انہوں نے اسے قابو میں کر لیا اور اپنا ہوا حاصل کر لیا تھا کہ ایک دوسرے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا، دوسرا پھر تیسرا۔

دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ وہ اپنے پہلے ساتھی کی ناک کی کاہلہ لینے کے لیے ان پر وار کرتا جا رہے تھے، انہوں نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے بہت کچھ کہا، کہا کہ انہیں کہیں جلد ہی پہنچنا ہے۔ شاید اسپتال کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ یہ اپنا ہوا دینے پر بھی تیار ہو گئے تھے۔ وہ دونوں بہت غصے میں تھے۔ انہیں ہر حال میں اپنا ہوا کرنا تھا۔ ایک آدمی کو انہوں نے بس میں کر لیا تھا کہ دوسرے نے کچھ نہ دیکھا۔ اس کی ذرا سی چوک سے ان کی پکڑ میں آئے اس کے ساتھی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کچھ یہی ہوا، وہ آدمی دیوانہ ہو چکا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کہتے ہیں، انہوں نے اس کے وار سے خود بچنے اور

کہ مجھے اپنے گھر کا پتا بتائیں، میں ان کے رشتے داروں کو پتا آنے کے لیے تارے دیتا ہوں۔ وہ کل یا برسوں تک آجائیں گے۔ اس وقت تک یہ میرے گھر پیچھے رہیں۔ پھر کسی دن، کسی مناسب وقت، اندھیرا ہو جانے کے بعد رات کو کسی وقت چپکے سے یہ پتا شہر سے نکل جائیں۔ انہوں نے میرا ہر مشورہ مسترد کر دیا۔

”یہ نوجوان آدمی ہیں۔ اچانک انہوں نے فیصلہ کیا انہیں خود استاد میدا کے پاس جانا چاہیے۔ میں انہیں منع کرتا رہا۔ یہ نہیں مانے۔ مجھے نہیں معلوم یہاں آنے کا ان کا فیصلہ کس قدر جذباتی ہے یا استاد میدا کو اس کی پرانی جگہ سے بے دخل کر دینے کا بھروسہ اس حد تک درست ہے۔ میں نے احتیاطاً ان کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا، شاید میرے ساتھ ہونے سے بات اتنی نہ بڑھ پائے۔ جو کچھ میرے علم میں ہے، میں نے آپ کو بتا دیا ہے میدا بھائی۔ میں انہیں بالکل نہیں جانتا، آج ہی آنا سامنا ہوا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے، اپنے بھائی کے پاس جانے کے لیے یہ بہت بے چین تھے۔ بھائی کے لیے یہ کچھ بھی کر کر سکتے ہیں۔“

اکبر علی خاں کو موقع کی نزاکت کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے خوش وضعی سے جیسے ایک ایک لفظ چن چن کے، آواز کے کسی زیر و بم کے بغیر، بڑی حد تک غیر جانب داری سے ساری روداد گوش گزار کی۔ مدعا کی تسیل کے لیے سماعت اور گویائی کا توازن لازم ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں قفاطین کی سماعت کی استطلاعات کا خیال رکھا اور عدالتی طرز بیان سے احتیاط کیا۔ عدالتی بیان میں دلیلیں مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکبر علی خاں نے سادگی شعار کی تھی، سادگی اور اختصار، چیز نیاں اور صراحتوں سے بڑھنے اور سننے والے کا تجسس و اشتیاق متاثر ہوتا ہے۔ سطور کم، بین السطور زیادہ، یہی بلاغت کا قریب ہے۔ نہ کہتے ہوئے بھی

انہوں نے کبھی کچھ کہہ دیا تھا۔ وکیل دو کتنے ہی بڑے ہوں، ان کا بیان ان کی طبیعت ذہانت کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ ہر فیصلت کی پہلی شرط ذہانت ہے۔ انہوں نے ہر غیر ضروری ذکر سے پرہیز کیا تھا۔ ہول میں ہمارے قیام، چاقو لہراتے ہوئے ان کے گھر میں میری آمد کی ناگہانی، پردہ دار خواتین کی بے پردگی اور انہیں بیٹ میں رکھنے کے جرم کی گفتنی نالغنتی سے انہوں نے پہلو بھئی کی تھی۔

سارے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ میدا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دخل دیا نہ میں نے۔ اکبر علی خاں کے چپ ہو جانے پر لمحے گزر گئے، میدا بے حرکت بیٹھا رہا پھر اس نے پہلو بدل کے حقے کا لمبا کش لیا، اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ایک ہل کے لیے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پیشانی پر شیشیں گہری ہو گئی تھیں۔

میری خاموشی کا اب کوئی جواز نہ تھا۔ میدا کے منہ، ثبت ناثر کا انتظار کرنا اب بے عمل اور بے مصلحت تھا۔ میں نے اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”وکیل صاحب کو جو بولنا تھا، بول چکے میدا استاد! سمجھو، وکیل صاحب نے تم سے کچھ بولا اور نہ تم نے کچھ سنا۔ ان کے جھوٹ جج پر دھیان مت دو اور اپنا میرا وقت اور برباد مت کرو۔“ میں نے پھر جی سے چاقو کھول لیا۔ ”اپنا فیصلہ اسی پر ہونا چاہیے۔ تم کو یہی زبان آتی ہے نا۔“

اکبر علی خاں نے مایوسی سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

میدانے میرا کہا درگزر کیا اور ہاتھ اٹھا کے اکبر علی خاں سے پوچھا۔ ”او تو سب ٹھیک ہے۔ جو آپ بولے، ہم پورے دھیان سے سن لیے، پر آپ کا بھٹت ہیں، ہمارا مطلب ہے، آپ کتنا جانت ہیں، اسی سارا سیدھا ہی بولت ہیں کا؟“

”میں نے جو دیکھا اور سنا ہے، وہی آپ کو بتایا ہے۔“ اکبر علی خاں ابھی ہوئی آواز میں بولے۔

”ایک بات صاف کر دوں میدا بھائی، میں ان کا وکیل بن کے یہاں نہیں آیا، میں نے آپ سے ان کی کوئی سفارش بھی نہیں کی ہے لیکن کچھ..... کچھ باتیں.....“ کہتے کہتے اکبر علی خاں رک گئے۔ ان کے ہونٹ میچ گئے، غلط بھراٹل کیا اور مایوسی سے بولے۔ ”جانے دیجئے، بہتر ہوگا، آپ دونوں خود ہی منٹ لیجئے۔“

”اوکا..... کا بات؟“ میدا ہل کے بولا۔ ”او تو آپ جیسا بولت ہو، بعد کو ہم دیکھ ہی لیں گے۔ ہم کو ہی سارا دیکھنا ہے، پر آپ بولو، آپ کا..... کا کہنا چاہت تھے؟“

”کچھ نہیں میدا بھائی۔“ اکبر علی خاں کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”یہ ہمارے گھر اپنی مرضی سے آئے تھے، ہماری دعوت پر، ہماری خوشی سے نہیں، اور انہوں نے ہمیں کچھ سوچنے بھیجے، کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔“

میدا اچھل پڑا۔ اس نے اکبر علی خاں کو بات پوری کرنے نہیں دی۔ ”جرور چاکو نکالا ہوئے گا۔ چاقو سے حکیمان کا ان کا بہت چاؤ لگتا ہے۔ اسی ہی نا؟“

اکبر علی خاں نے تاحید کی، نہ تردید۔ بروہاری سے بولے۔ ”شروع میں انہوں نے زور ڈالا تھا، ڈالنا ہی چاہے تھا لیکن جلد ہی ہماری ساری حیرت دور کر دی، وہ کچھ بھی اور خوف بھی۔ انہوں نے گھر کے کسی فرد کو تنگ نہیں کیا، کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے آنے کی وجہ بتائی اور گھر میں اس طرح داخل ہونے کی معافی چاہی۔ کچھ دیر گھر میں رہنے کی اجازت چاہی۔ اس کے سوا کچھ نہیں..... میں نے بہت کریدی اور ان کے جواب پر کسی اور طرف دیکھنے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسپتال اور ڈاکٹر کا نام بھی بتایا۔ میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے کہ یہ دو تین دن ہمارے گھر قیام سے رہنے کے مشورے پر راضی نہیں ہوئے۔“

اکبر علی خاں کے لہجے میں پہلے سے کہیں زیادہ اعتماد

تھا۔ کہنے لگے۔ ”اتنی عمر میں ہم نے بھی کچھ دیکھا بھالا ہے میدا بھائی، اپنا کام ہی ایسا رہا ہے بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، ایک سے ایک بڑھ کے، تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہوئی چاہیے۔ آپ کے آدمی اور پولیس والے ان کے پیچھے نہ ہوتے تو یہ ہمارے گھر میں کیوں داخل ہوتے۔ کوئی اور بات، کوئی اور ارادہ ہوتا ان کا تو یہ ہم سے کسی اور طرح پیش آتے۔ میں نے دیکھا ہے، ان میں حوصلے کی کمی نہیں۔ یہ پولیس کے سامنے بھی آجاتے اگر انہیں کسی جگہ پکڑنے کی بے گلی نہ ہوتی۔“

میدا کی بھوس جڑھ گئیں اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ نخوتی لہجہ میں بولا۔ ”پولیس کو تو ہم ابھی ادھری بلواسکت ہیں۔ آپ کو پتا ہے وکیل صاحب۔“ اس کی آواز نرختنے لگی۔ ”اپنا ایک آدمی چلا گیا، بہت پرانا ساتھ تھا اپنا۔ چاکو کو گھماوت تھا، بجلی لپکت تھی اس کے انگ انگ میں۔ اس حرام چادے کا اتنا کھون نکل گیا کہ اسپتال کے رستے میں دم توڑ گیا۔“

”نمرے اس سختی وان، سری مان کے کارن اس کی بتیا ہو گیا۔ ایسوی میں کوئی دیکھا لگتا ہے وکیل صاحب، ہم سے زیادہ آپ جانت ہو۔ اسی ہم سے چاکو کی بات کرت ہیں۔ پہلے ہمارے آدمی کا حساب چیتا کر دیں۔ اسارے کا دیر ہو دے گی، پولیس ادھر آ جاوے گی۔“

”اشارہ کر دیا، بلا پولیس کو، سوچتے کیا ہو پھر؟“ میں نے پچھکاری آواز میں کہا۔ ”پر ہم کو معلوم ہے استاد، تم ایسا نہیں کرو گے، اپنے ان پٹوؤں کو کیا جواب دو گے، کس اندے سے سامنا کرو گے ان کا، کیا سوچیں گے یہ اپنے استاد کے لیے جو ہوئی پر بیٹھا اینڈ تار ہا، چونکی سے چنے سے بے کے لیے استاد کے پاس پولیس کی آڑ لگائی تھی۔ تم خوب جانتے ہو گے، ایسے راجا کو پر ہا کب تک سہن کرے گی، کب تک بچوں پہ بٹھائے گی اسے۔“

دہانی سے استاد کی فکر و تشریش میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہوگا۔

ادھر اکبر علی خاں نے درمیان کا کوئی فسانوی راستہ نکالنے کے لیے اپنی سی کوشش کی تھی۔ ان کی موجودگی سے اتنا ضرور ہوا کہ میدا استاد کی فہمائش و سرزنش کا جو کام مجھے کرنا اور کرتے رہنا تھا، اس کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اکبر علی خاں نہ ہوتے تو مجھی کو سارا کچھ دیکھنا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید اتنی دیر نہ لگتی مگر وضع و مروت میں جو شخص ساتھ آیا تھا، ایک شریف انفس، تعلیم یافتہ، صاحب دل، صاحب نظر شخص۔ بہت سی طرح کھڑے رکھنے کے بجائے اسے بھی اپنی مفاہاتہ، صلہ جو یا نہ کاوش کا کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔

پہلی نظر میں میدا مجھے کوئی مشکل آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ہوتا بھی تو میں تو اس کے اڈے، اس کی قلم رو میں آچکا تھا۔ مجھے ہر حال میں اس سے معرکہ آرائی کرنا تھی۔ واپسی کسی طور ممکن نہیں تھی۔ میرا تنہید غلط بھی ہو سکتا تھا۔ پھسل کے کہنے کے مطابق مقابل کی نا دیدہ برتری کی ایک گنجائش ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور اپنی کسی اتفاقی کوتاہی کا امکان بھی۔ اور پھسل ہی کا کہنا تھا کہ چاقو آزمائی سے پہلے مقابل کی نفسی و اعصابی شکست اور جنت کے لیے ہر ممکن حربہ آزمانا چاہیے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی، میں ہی جانتا ہوں کہ تمام تربیتیں اور خود اعتباری کے باوجود اس دہر و دعداوت سے پہلو تکی کی خواہش مجھے بھی تھی کہ میرا دل دماغ تو پھسل میں اٹکا ہوا تھا۔ میں کتنا ہی اپنے آپ کو ہاتھ کے رکھوں، مجھے تو وہاں اسپتال میں پھسل کے سر بانے ہونا چاہیے تھا۔ پولیس طلب کر کے مجھے اس کے خوائے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس پہلو پر تو میں نے فور ہی نہیں کیا تھا۔ اڈوں کو پولیس کی دہلی اندازی سے دور رکھا جاتا ہے۔ اڈوں کا تو خود پولیس ایسا نظام ہوتا ہے اور اڈے کے استاد کی پشت پر صرف اس کا

بل ہوتا ہے، پولیس کی پشت پناہی نہیں۔ یہ استاد کی پستی و پس ماندگی ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو آکر کار بنائے۔ میدا سے مجھے اس کم خطرہ و کمبلی کی امید نہیں تھی۔ اڈے کے آدمیوں کے لیے بھی ان کے استاد کی یہ نادر حرکت بڑی سبکی کی بات تھی۔

آئینے پر چھائی دھندلے ہو رہی تھی۔ اب مجھے بہت کچھ صاف نظر آ رہا تھا لیکن ایسا تعین بھی نامناسب تھا۔ میدا نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جواب خاصا مشکل بھی تھا۔ اس دوران اکبر علی خاں نے جیب سادھے رکھی، واپسی میں یا میری طرح کسی خوش گمانی میں۔ بہر حال تو ٹکراؤ اور تاویل و ٹکرا کا مرحلہ اب تمام ہو چکا تھا۔

استاد میدا مجھے گھورتا اور جتنے سے شغل کرتا رہا، پھر اس نے پہلو میں بیٹھے معمر آدمی سے قریب ہو کے کچھ کہا۔ معمر آدمی کی پیشانی سکڑی اور ہونٹ جھپکن گئے۔ دونوں ہند سنے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ معمر آدمی کبھی اڑکا، کبھی اقرار میں سر ہلاتا رہا اور اس نے میدا کا بازو پکڑ کے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، بڑبڑاتے ہوئے نزدیک بیٹھے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔ ان کے چہرے بھی سلگ رہے تھے۔ لگتا تھا، معمر آدمی کی ہم نوائی کر رہے ہیں۔ میدا کا منہ بگڑ رہا تھا اور بکا بکا اس نے جسکے سے جتنے کی فرش پر ڈالی، دونوں بازو سمیٹے، پھیلائے جیسے تازہ دم ہونا چاہتا ہو۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے ہاتھ باہر نکالا تو خالی نہیں تھا، بند چاقو ہاتھ میں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ پیر سیدھے کیے، دائیں بائیں جسم گھمایا، چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اکبر علی خاں کو اشاروں میں تسلی دی، ان کی آنکھیں پچھتی ہوئی تھیں۔ چوکی پر اور آس پاس، آٹنے سے آٹنے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی بھین بھناہٹ ہال میں گونجنے لگی تھی۔

میدانے چاقو کھول کے دھار پر انگلی پھیری۔

معمر آدمی کے ہاتھ چوے۔ معمر آدمی نے انکار میں شدت سے سر ہلایا۔ میدا اٹھائی چاہتا تھا کہ معمر آدمی نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی اور آنکھیں بھیج کے تنہائی انداز میں کچھ تاکید کی۔ میدا کے چہرے پر بیزارگی اور ناگواری نمایاں تھی۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کے اوپر قریب ہو گئے اور گھبرا سا ڈال دیا۔ میدا آمادہ نظر نہیں آتا تھا مگر جیسے زچ ہو گیا ہو، منہ موڑ کے اور سر جھکائے اس نے معمر آدمی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے آگے چاقو کر دیا۔ معمر آدمی نے جھپکنے کے انداز میں چاقو تحویل میں لے لیا۔ ہر طرف شور مچا۔ معمر آدمی نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ادھر میدا کی کمر تھپک کے ممنونیت کا اظہار کیا اور میری طرف نگاہیں مرکوز کیں۔ پہلے ایک دو بار، چاقو والا ہاتھ فاصلے کے تعین کے لیے آگے پیچھے کیا۔ میری نظریں بھی اس پر بھی ہوئی تھیں۔ اس نے ناپ تول کے اتنی اونچائی سے چاقو اچھالا کہ درمیان کی لمبائی بھی پر ختم ہو۔ چاقو ٹھکرا ہوا تھا۔

چاقو سے اس کی دست برداری اور میری گرفت کا وقفہ لمحوں پر مشتمل تھا۔ میں نے سارا ہوش چاقو کو دھتے سے پکڑنے میں صرف کیا اور مجھ سے کوئی چوک نہیں ہوئی۔ معمر آدمی کا نشا میری سمجھ میں آچکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ مجھے اپنا چاقو اسی چابک دہی اور مٹائی سے اس کا اور اپنا فاصلہ ذہن میں رکھ کے اچھالنا تھا۔ معمر آدمی بھی منتظر تھا۔ پہلے میں نے میدا کا چاقو سکون سے بند کیا پھر اپنا چاقو پھینکا۔ مجھے خبرت ہوئی اور کسی قدر غوثی بھی۔ اس کبر سنی کے باوجود چاقو پکڑنے میں معمر آدمی سے ذرا سی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ احتیاط سے چاقو بند کر کے اس نے میدا کی طرف بڑھایا۔ باؤل خواستہ، لمبی سانس بھیج کے اور آنکھیں جھپکا کے میدانے چاقو جیب میں رکھ لیا۔

”تم جاسکتے ہو۔“ معمر آدمی نے دھڑکنی

دگر صورت ہوتی۔ فیصلے میں ایسی دیر نہ لگتی لیکن دو بائیں گنڈہ ہو رہی تھیں۔ نوجوان کا کہنا ہے کہ اس کا بھائی شہر کے اسپتال میں زیر علاج ہے اور بیمار دار اس کے سوا کوئی نہیں، اور بھائی کے پاس اسپتال پہنچنا اس لیے ممکن نہیں رہا کہ استاد میدا کے حکم سے شہر کے راستے اس پر بند کر دیے گئے ہیں۔ استاد میدا اور اس کی گدی سے اسے ایسا سروکار نہیں۔ مجبوری میں یہی ایک تدبیر اسے بھائی دے کر اڈے کے استاد کو بے دخل کر کے خود اڈے کا استاد بن جائے۔ سامنے اڈے کا مستند استاد ہو تو ذہنی انتشار یا کسی بے حد نفسی اعتماد وہی میں کوئی اتنا بڑا دعو کر سکتا ہے۔

استاد میدا نے اپنے ساتھیوں کے مشورے اور شہر کے معزز شخص وکیل اکبر علی خاں کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے نوجوان کے راستے میں حائل بندشیں دور کر دی ہیں اور مبارزت سرست ملتی کر دی ہے۔ استاد اور اس کے ساتھی شقاوت اور سنگ دلی کا کوئی الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے اور حقیقت جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اس مہلت سے انہیں جھانک کی جھانک بین کا اچھا موقع مل جائے گا اور جیسا کہ وکیل صاحب کا خیال ہے، وہی سچ ہوا تو نوجوان خاطر جمع رکھے، اڈے کی طرف سے وہ ہر قسم کے بعض وعاد سے ہزار ہوں گا۔

چاقوؤں کی مشتکی سے مراد ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان خبیث آزمائی ہو جو ملوثی کی گئی ہے، ختم نہیں، انکار نہیں کیا گیا۔ التوا کی رعایت میدا استاد کی کشادہ دلی اور خود اعتمادی پر جمبول کی جائے کہ ذہنی فشار سے دوچار اپنے مقابل سے معرکہ آزمائی وہ اس وقت مناسب نہیں سمجھتا، اس اعتراف کے باوجود کہ اڈے کی چوکی سے نوجوان کو کوئی واسطہ نہیں، بھائی کی صحت کی بحالی کے بعد اسے بہر حال اپنے دعوے کی پے روی کے لیے اڈے واپس آنا ہے۔ اس نے اڈے کے اتنے

لوگوں کے سامنے ان کے استاد کی منہی خشیست پر کچھڑا چھالی ہے۔ اڈوں کی روایت کی میل استاد میدا پر لازم ہے۔ اسے ثابت کرنا ہے کہ وہی اڈے کی گدی پر برقراری کا حق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اسی گواڈے کے استاد کی خشیست سے دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔ استاد میدا ان پر سایہ بار بار ہے۔ انہیں یقین سے کہ زور اور چاقو بازی میں دور دور تک اس کا ثانی نہیں اور وہی ان کے درمیان رہے گا، اور وہ بھی جانتے ہیں کہ اڈے کے دو مطلب گار ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو کسی ایک کو اپنی توانائی کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ نوجوان نے اپنی برتری ثابت کر دی تو استاد میدا کے جاں فثار، اڈے کے یہی لوگ اس کے خیر مقدم میں کوئی بخل بھی نہیں کریں گے کہ اڈوں کا یہی طور ہے۔ اس عارضی مدت میں نوجوان خود کو ہر طرح محفوظ رکھے۔ نگرانی کے باوجود اڈے کا کوئی آدمی اس سے باز پرس نہیں کرے گا۔ نوجوان بھی گرہ میں باندھ لے کہ اسے اڈے واپس آکے مبارزت کا موقوف معاملہ نشانہ ہے۔ استاد میدا اس کی جلد واپسی کا منتظر رہے گا۔ اس دوران اس نے شہر سے فرار کی کوئی حرکت کی تو وکیل اکبر علی خاں کو ڈسے دار سمجھا جائے گا۔ وہ نوجوان کی ہم دردی میں اس کے ساتھ آئے ہیں اور انہوں نے اس کے حق میں اڈے کے استاد کو قائل کرنے کی موثر کوشش کی ہے۔ یہ پہلو وکیل اکبر علی خاں کے ذہن نشیں رہے کہ ان کا واسطہ اسی شہر سے ہے اور اڈے کے لوگ ایک حد تک ہی فیاضی اور درگزر کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اڈے پر سناٹا چھایا رہا۔ سمر آدمی کا لہجہ اتنا درشت تھا کہ ایسا نرم۔ سکوت میں اس کی بوڑھی آواز کی گونج بڑھتی تھی۔ میں پورے انہماک سے سنا کیا۔ عدالت کے کسی جج کے مانند اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ یہ اکبر علی خاں جج میں کیسے آگئے۔ میرے ساتھ ان کے آجانے،

ہم دردی کا اظہار کرنے اور حقیقت حال سے آگاہ کرنے سے مراد میری ضمانت کہاں ہوئی۔ ضمانت وغیرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن نہ عمر آدمی چاہتا تھا نہ میں نے اس کی یادہ کوئی پر حرف زنی مناسب سمجھی۔ ایسی چیز اور نازک صورت حال میں گھبرا آدمی یہی کچھ کر سکتا تھا، اور مجھے غیبت جان کے خاموش رہنا تھا۔ مجھے تو اڈے سے نکلے اور اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ اخلافا اس کا شکر یہ بھی ادا کرنا چاہیے تھا لیکن یہ تشکر میری جانب سے ان ساروں پر مرتب ہونے والے تاثر کی کمی کرتا۔ عمر آدمی کی سوچ بوجھ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اڈے پر اسی کا دماغ کام کرتا ہے۔ اس نے اڈے کے لوگوں میں میدا کا وقار اور دیدہ بہال رکھنے اور دوسری طرف اڈے کو کسی ناخوش گوار واقعے سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے جتن خوب کیے تھے۔ اس نے ہر گوشے اور ہر سہ کے خیال رکھا تھا۔ اس کا نام مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اڈے سے رخصت کے وقت کچھ رسمی کلمات ادا کرنے ضروری تھے۔ میں نے چچی ہوئی آواز میں عمر آدمی کو مخاطب کیا۔ ”میں آؤں گا بڑے صاحب۔ سہل رہیں، مجھے اپنا جاقو واپس لینا ہے۔ میں ضرور آؤں گا، پھر دیکھ لیں گے۔“

یہ انحصار ہی اس وقت موزوں تھا۔ عمر آدمی کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ میں نے اکبر علی خاں کو اشارہ کیا۔ وہ تو کم سم سے تھے۔ میرے ٹوکنے پر چونک پڑے۔ سامنے چوکی پر بیٹھے پورا ادھر ادھر گھڑے اڈے کے لوگوں کو ہم نے پچھستی نظروں سے دیکھا اور دروازے کی طرف پلٹ گئے۔ پیچھے گھڑے لوگوں نے دائیں بائیں ہٹ کے ہمارے لیے راستہ بنا دیا۔ ہم دروازے سے نکلنا ہی چاہتے تھے کہ عمر آدمی کی بلند آواز پر رکنا پڑا۔ اکبر علی خاں کو اس نے پکارا تھا۔ وہ ان سے حذرت کرنے لگا۔ ”آپ پہلی بار ادھر آئے ہو وکیل ساب، اور ہم

تسری کوئی آؤ بھگت نہ کر سکے۔ سے ہی الٹا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دھوا بھوک لاش آ رہی ہے۔ ادھر بھی اسی کارن اسکتے ہیں۔ آپ جانو اس سے۔“ عمر آدمی کی آواز جھٹکتی تھی۔

اکبر علی خاں نے سر جھکا کے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا، جواب دینے کی کوشش سے دو چار رہے اور کچھ کہہ نہ پائے۔ عمر آدمی کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھا کے سلام کا جواب دیا اور اکبر علی خاں کو مشکل سے نکالنے کے لیے لمحے بھر بعد استاد میدا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اکبر علی خاں کو ٹھوکا دیا تو وہ گھبرا سے گئے اور کسی معمول کے مانند میرے ساتھ چل پڑے۔

اڈے کی عمارت میں اب شور بھوٹ مڑا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ بھاگ کر فاصلہ طے کر دوں لیکن ہم دونوں متوازن رفتار سے عمارت سے نکل آئے، درمیانی کھلا حصہ اور ڈیڑھی عبور کر کے بڑک پر آ گئے۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے دو تین آدمیوں سے آگے سامنا ہوا تھا۔ اندر سے کوئی ہمارے پیچھے نہیں آیا۔ چار دیواری کے باہر بھی اکا دکا آدمی موجود تھے۔ تانگے والا قریب ہی گلی میں ایک کنارے کھڑا ہمارے انتظار میں پریشان پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اضطراب کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ اڈے کے آدمیوں کی زبانی اسے کچھ ہٹک مل گئی ہو۔ یہ تو اسے اچھی طرح معلوم ہی تھا کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ تانگے کی چھبلی نشست پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ دھوپ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ آگے چوک کی دکانوں کی چھل پہل بھی کم تھی۔ گلی اور چوک سے گزر کے ہم چوڑی سڑک پر آ گئے اور گھوڑے نے سر ہٹ بھاننا شروع کر دیا۔

اکبر علی خاں نے شیر والی کے اوپر کے ہٹن کھول دیے۔ کئی بار انہوں نے پیشانی پر ابھرنے والی بوندیں رومال سے خشک کیں۔ دروازے کے بعد

ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ ٹھیر سے گئے تھے۔ دیر تک انہوں نے مجھ سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ دکھا تو جیسے انہیں لب کشائی کاوصلہ ہوا۔ ان کے ہونٹ کھپکپائے، سن سناتی آواز میں بولے۔ ”یہ سب کچھ کیا تھا میاں؟“

”جو آپ نے دیکھا وہی تھا۔“ میں نے کہا۔

”مگر مگر یہ کیا ہوا بھائی؟“

”کیا ہوا۔“ میں نے آنکھیں میچ کے کہا۔ ”جو ہوتا تھا، وہی ہوا۔“

”آپ، آپ کو اندازہ تھا؟“ وہ حیرانی سے بولے۔

”دہاں جا کے کچھ دیر بعد ہو گیا تھا۔“

”یعنی کہ ہم، ہم اس طرح۔“

”اس طرح چلے آئیں گے۔“

”ہاں میاں!۔۔۔۔۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“

”آپ کیا سمجھ رہے تھے؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسی جگہ اور ایسے لوگوں سے پہلی مرتبہ سا اقدہ پڑا تھا۔“ اکبر علی خاں وحشت زدگی سے بولے۔ ”دل دھڑکتا رہا کہ آئے والا لحد کیا رخ اختیار کر لے، کس کروٹ چاہیے۔“

”آپ نے بڑی جرات کی۔“ میں نے کہا۔

”کیسی جرات۔“ اکبر علی خاں پچھانی انداز میں بولے۔ ”جو نہ آیا، بکنا گیا۔ بس یقین تھا کہ کچ کچ کہہ رہا ہوں۔ جسے آپ جرات کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تھی۔“

”دو نہ یہ سب کچھ مجھے کہنا پڑتا، ویسے میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ قتل دیں۔“

”مجھے معلوم تھا لیکن میں کب تک چپ رہتا، سوچا کہ شاید اسی طرح کچھ بات بن جائے۔“

”آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔“

”کیا کر دیا۔“ اکبر علی خاں بکھری ہوئی آواز

میں بولے۔ ”ایک بات تو بتائیے میاں، اگر واقعی وہ بد ذات مقابلے پر آمادہ ہو جاتا؟“

”نہیں ہوتا۔“

”کیوں، کیسے۔۔۔۔۔ یہ آپ دتھو سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”جس وقت اسے ہونا چاہیے تھا، اس نے وہ

وقت نکال دیا تھا۔“

”لیکن اگر ہو جاتا، فرض کیجیے، اگر ہو جاتا؟“

”تو میں تو اسی غرض سے گیا تھا۔“

”یعنی آپ۔۔۔۔۔ وہ سٹ پٹا کے

بولے۔ ”آپ!۔“

”ہاں!۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یوں تو

ہو کچھ بھی سکتا تھا لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو

دہاں ہوتے ہوئے بھی دہاں نہیں تھا۔ مجبوری کی

بات دوسری ہے۔ اس لیے میں بار بار اسے دعوت

دیتا رہا۔ ہو سکتا ہے، اس نے مجھے پھل دیوانہ سمجھا

ہو کہ ایسے شخص کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ ایسا شخص تو

کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”مجھے تو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔“ اکبر علی خاں

سراستگی سے بولے۔ ”آپ اس کی عزت نفس پر

مکمل وار کر رہے ہیں، اس کے اتنے بہت سے

ساتھیوں کے سامنے، کہیں اس کی غیرت کا پتہ نہ

چھلک نہ جائے۔“

”اور اس کی محتاط روی کی وجہ بھی تو یہی ہو سکتی

ہے کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے سامنے شرمندگی نہ

اٹھانی پڑ جائے۔“

”ہاں ہاں، یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“ اکبر علی

خاں اضطرابی لہجے میں بولے۔ ”میرے چہرے پر

ان کی بے قرار نظریں منڈلا رہی تھیں۔“ لیکن ایک

بات۔۔۔۔۔ ایک بات، سے مجھے آپ نے مطمئن نہیں

کیا۔“

”میں آپ کو ہر بات سے مطمئن کر دوں گا۔“

میں نے نرمی و دشا بھری سے کہا۔ ”مگر اس وقت مجھ

RE 467

”میں جناب، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ کیا بات ہوگی۔“ اکبر علی خاں فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

انہوں نے کوچوان کو کچھ ہدایت کی۔ ایک ڈیڑھ فلائنگ ایندھن کی طرف کی سڑک پر مڑ گیا۔ دفتر بند ہونے کا وقت تھا۔ سڑکوں پر سوار یوں اور پیدل چلنے والوں کی بھیڑ ہوئی تھی۔ نائے کی رفتار میں بھی فرق آ گیا تھا۔ جیسے جیسے اسپتال نزدیک آرہا تھا، میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے کسی جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں، یہ کیسی ندامت تھی جو مجھے ہلکان کر رہی تھی۔ غلطی میری ہی تھی۔ مگر اسپتال سے نکلتا، نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔ پھر جب جیب کترے نے ہوا اڑالیا تو اس کے تعاقب کی ہمانت دوسری غلطی تھی۔ اکبر علی خاں کا بھجان واضطراب بے جا نہیں ہے۔ میں نے انہیں جیسے تیسے چپ کرادیا ہے لیکن استادمیداکے اڑے پر جا، بھڑوں کے پختے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ بہر حال اب پیشانی سے کیا حاصل تھا۔ آدمی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ زندگی میں غلطیوں کا کتنا دخل ہے۔ غلطیوں سے زندگی کا سلسلہ چلتا ہے، کم غلطیاں، زیادہ غلطیاں، چھوٹی غلطیاں، بڑی غلطیاں۔ کبھی بڑی غلطی سے کچھ نہیں ہوتا، کبھی ایک چھوٹی غلطی زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ آدمی کو اشرف المخلوق کہا جاتا ہے۔ آدمی تو بہت ناقص، بہت ادھورا ہے۔ ایک دماغ ہی اس کے قابو میں نہیں تو کس بات کا اتنا کبھی برتری۔ کہتے ہیں، آدمی دماغ کے سوا کچھ نہیں اور دماغ تو بھٹکا، بھٹکا رہتا ہے۔ دماغ کو آدمی کا طبع ہونا چاہیے نہ کہ دماغ آدمی پر حاوی ہو۔ دیکھا جائے تو آدمی سارا گردن سے اوپر ہے، یہ کم فائنی، دراز قدی تو ایک گانا ہے۔ آدمی کے ذہن کی پہچان تو گردن سے اوپر کے

سے کوئی سوال جواب مت کیجیے۔ میں آپ کو ابھی کچھ نہ بتا پاؤں گا۔ اس وقت تو بس کسی طرح جلد سے جلد اسپتال.....“

”مناسب ہے۔“ وہ کسمسا کے چپ ہو گئے اور کچھ وقت بعد ہفتگی سے بولے۔ ”اکبر نزدیک ہے۔ آپ نے وہ پہر بھی کچھ نہیں کہا۔“ کچھ دیر غصہ کے کیوں نہ اسپتال چلیے، زیادہ وقت نہیں گئے گا۔“ ”نہیں، ابھی نہیں۔“ میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہ جانے میرے وہاں نہ ہونے پر کیا چہ منگوائیاں ہو رہی ہوں۔ ڈاکٹر راتے کیا سوچ رہا ہوگا اور پھل بھائی کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو مجھے پاس نہ دیکھ کے وہ تو بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نرس کہتے ہی عذر کرے لیکن آپ نہیں جانتے، وہ کیسے آ دی ہیں۔ اس حالت میں وہ اٹھ کھڑے نہ ہو جائیں۔ انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا، کتنی ہی حالت خراب ہو، وہ نکل پڑیں گے۔ وہ ایسے ہی ہیں۔“ ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ اکبر علی خاں اداسی سے بولے۔ ”آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو پہلے اسپتال ہی جانا چاہیے۔“ ”جیسے ہی ان کی طرف سے ہفتگی ہوئی، میں آپ کے گھر آؤں گا۔“ مجھے تو آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب، کیا میں آپ کے ساتھ اسپتال نہیں جاسکتا؟“ وہ شکایتی انداز میں بولے۔

”جاسکتے ہیں، کیوں نہیں مگر دیر ہوگئی ہے۔
 پہلے آپ کو گھر جانا چاہیے۔ وہاں سب آپ کی راہ
 دکھائے ہوں گے۔“

اعتراف تو نہیں ہے، "اُن کے شکوے میں ناراضی بھی شامل ہوئی تھی۔"

معدرت کی۔ مجھے تو ادھر گھر والوں کی فکر ہے۔ انہیں مطمئن کر کے کچھ دیر بعد آپ اسپتال

میں سے ہوئی جا ہے۔

ایک جگہ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ تانکے کو گھوم کے جاتا ہوا۔ دھوپ سنسنے لگی تھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ تانکے والے کو کمرایہ ادا کرنے کے لیے میں نے جب میں ہاتھ ڈالا، اٹھا، اکبر علی خان سامنے آئے اور انہی نے پیسے ادا کیے۔ تانکے کی لٹ۔ ست کے نیچے رکھا ہوا ایک مچھی انہیں یاد تھا۔ میں تو بھول ہی چکا تھا۔ انہوں نے بیک بھی مجھے اٹھانے نہیں دیا اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے اسپتال میں داخل ہو گئے۔

شام کے وقت اسپتال میں عیادت کا رول کا
ہجوم ہوتا ہے۔ ام نے جلدی جلدی فاصلہ طے کیا۔
ٹھنڈل کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میری
سائس پھولنے لگی تھی۔ اسپتال کے اس حصے میں
جہاں سب سے کشادہ اور آرام دہ کمرے بنے
ہوئے تھے، نسبتاً سکون تھا۔ میں تیزی سے کمرے
میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ جسم کو بھونکا سا لگا۔ کئی ڈاکٹر
اور نرسیں ٹھنڈل کے بستر کے گرد موجود تھیں۔ میں
نے بے اختیار اکبر علی خاں کو دیکھا۔ انہوں نے
چمک ایک کونے میں رکھ کر میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ام
دبے قدموں ٹینک کی طرف بڑھے اور ڈاکٹروں
کے پیچھے جا کے کھڑے ہو گئے۔ میں آگے جانے
کے لیے بڑھ گیا تھا۔ اکبر علی خاں نے مجھے روک
لیا۔

ڈاکٹر زسوں کو ہدایتیں دیتے اور دھیمی دھیمی باتیں کرتے رہے۔ ان میں ڈاکٹر رائے بھی تھا۔ میں نے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی لیکن میرے تو حواس ہی منتشر تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر رائے، نفل کے بستر سے ہٹ گیا۔ وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے مشورہ کر رہا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چونک پڑا۔ ”تم؟ تم کہاں تھے؟“ اس نے میری جانب اٹلی اٹھا کے اٹلی بڑی سیما بول دیا۔

تو کیا، کیا حال ہے ان کا؟“ میں نے سنجیدگی سے

آواز میں کہا۔

اس نے شانے اچکائے۔ ”ابھی دماغ کے ایک ماہر ڈاکٹر، ڈاکٹر فریڈی کو بلا کے دکھایا ہے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ انگلستان سے پہنچ رہے ہیں۔ آئے ہوتے ہیں۔ ایکس ریز دکھ لے گئے ہیں، کچھ اور ڈاکٹر فریڈی نے بھی تجویز کیے ہیں۔“ اس کے لمحے میں درستی تھی۔

”سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے
اسکی زبان سے پوچھا۔

اس نے فکر مستندانہ انداز میں سر ہلایا۔ ”ہم
کو شش کر رہے ہیں۔“

”یہ تو ایک فرسودہ جملہ ہے۔ اس سے مریض اور بیمار دار کی تشفی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے، آپ اپنی کوشش کر رہے ہوں گے لیکن مجھے کچھ اور بتائیے۔“ اس کا جسم تن گیا، چہرے پر رنگ آیا۔ ”اس کے سوا بتانے کو ابھی کچھ نہیں۔“ وہ بے گداز آواز میں بولا۔

”ایکس ریز میں اور کیا کیا..... اور کیا.....؟“
 مجھ سے پوچھنا نہ جاسکا۔

”ابھی کچھ خاص نہیں۔ فرین کے جھٹکے سے سر کے اوپر کی جلد پچک گئی ہے۔ سر کا خول کسی حد تک متاثر ہوا ہے اور گردن کچھ روبرو میں اور آئی ہیں۔ ان کا انتظار ہے۔ نہیں بتایا گیا تھا کہ بعض روبرو میں آنے میں ایک دو دن لگ سکتے ہیں۔ دوا میں دی جا رہی ہیں۔ آپریشن کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔“ ڈاکٹر نے کئی بدھی آواز میں بتایا۔ ”پر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں معافی چاہتا ہوں مجھے، کوئی ان ہونی
پیش آگئی تھی۔“ میں نے حاجت سے کہا۔

”راستہ بھول گئے تھے؟“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔
”کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب.. اب ایسا نہیں

”میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔“ میں نے عاجزانہ کہا۔

اس نے ساتھ رکے ہوئے ڈاکٹروں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے لمحے وہ سارے کمرے سے چلے گئے۔ صرف ایک نرس رہ گئی۔ معاذ مجھے جانے کیا ہوا، کمرے سے بھاگ کے میں نے ڈاکٹر رائے کا تعاقب کیا۔ وہ ابھی چند قدم دور ہی گیا ہوگا کہ راستہ روک کے میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس پر جراتی طاری ہوئی۔ میں نے اس کے ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ ”آپ انہیں ٹھیک کر دیجیے ڈاکٹر صاحب۔“ یہ التجا کرتے ہوئے میری آواز بھرائی۔

جواب میں اس نے میرے سر پہ ہاتھ بکھیر کے
میرے بال بکھیر دیے اور آگے بڑھ گیا۔

”اے آپ کو سنبھالیے میاں! آپ تو بڑی ہمت والے ہیں۔ اب اندازہ ہو رہا ہے واقعی آپ کیسی اذیت میں تھے۔ وہاں ان لوگوں کے درمیان خود کو کس طرح جکڑ کے رکھا تھا۔ یہاں بھی آپ کو کسی برداشت کی ضرورت ہے۔“ وہ آہستگی سے مجھے سمجھاتے رہے، کہنے لگے۔ ”اس سے بڑا اسپتال شہر میں نہیں ہے اور دور دور تک نہیں ہے اور یہ جو ککڑ رائے ہے، یہ بھی بہت مشہور ڈاکٹر ہے۔ مزاج کا ذرا سخت ہے، اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہے لیکن ساتھ میں شفا ہے۔ یہ کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کے مجھے تو بڑی حیرت ہوئی۔ آپ کی خاصی تیز باہمی اس نے سہی، ورنہ لوگ کہتے ہیں، وہ تو ناک پر مٹی بیٹھے نہیں رہتا۔ کیا جاو کھا آپ نے؟“

میں نے پڑھ کر دنگی سے کہا۔

”آپ بھی چادوگر ہیں میاں، خدا نے آپ کو

”آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو.....“

”خیر جانے دیجیے، پھر بات کریں گے۔ بہت سی باتیں جی میں لڑ رہی ہیں، پھر کہی۔ اب آپ ذرا سکون سے بیٹھیے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ یکا یک میزے پر بائیں سے اٹھ گئے۔

”کسی کو خبر بھیجے گا؟“ انہوں نے پوچھتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے نہیں معلوم، آپ کے کنبے خاندان کی کیا صورت ہے لیکن میرا خیال ہے، بہتر ہوگا، کسی ترسیلی عزیز، عزیزہ کو بلائیں، اگر کوئی آسکے۔ آپ کی دوسرا ہٹ ہو جائے گی۔ آپ کا یہاں سے لگنا تو مشکل ہے اب، اور کہیں چائے بھی تو کیوں۔ میں انہیں تاروں کا۔“

”ہاں ہاں۔“ میں نے بے سوچے سمجھے گردن ہلا دی۔

”سوچ لیجیے آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کس کے آنے سے بھائی صاحب کو سلی ہو سکتی ہے اور کون

”یہ کہاں کی سعادتمندی اور محبت ہے۔ ٹھیک ہے، کسی کو مت بلائیے اور پھر میں بھی تو ہوں یہاں آپ کے ساتھ۔ مجھے بھی کوئی ایسے کام نہیں۔ فٹے میں چار دن کالج جاتا ہوں، تین چار گھنٹوں کے لیے۔ چند دن نہیں جاؤں گا۔“

”واہ صاحب!“ اکبر علی خاں سرتاپا بے قرار سے ہو گئے۔ ”اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

”دشکر ہے۔ وہ آپ کا گھر تھا۔ ایک نہیں طبع،
معاملہ فہم اور شفیق آدمی کے گھر کے دروازے کی
طرف میرے قدم اٹھ گئے۔ گھروں کے انتخاب کا
تو موقع ہی نہیں تھا۔ کسی دوسرے گھر میں جانے
کے لوگوں سے سامنا ہوتا۔“

”ای کو شاید حسن اتفاق کہتے ہیں۔“ وہ مسکرائے ہوئے۔

ایک اچھوتی سرگزشت

چھلاوا

بیسویں صدی کی ایک نہایت پر اسرار خاتون
صبیحہ بانو کی آپ بیتی

✽ دولت مند، آزاد خیال، پردقار، خوبصورت اور خطرناک صبیحہ بانو، جنہیں لوگ جانتے ہیں مگر نہیں جانتے!

✽ جرائم پیشہ افراد انہیں ”چھلاوا“ کہتے ہیں!

✽ صبیحہ بانو کی زندگی بہت عجیب اور خطرناک حالات سے گزرتی رہی ہے۔ انہوں نے جب اپنی زندگی کے کچھ حالات قلم بند کئے تو انہیں پڑھ کر ہزاروں لوگ ان سے ملنے اور انہیں جاننے کے متمنی ہو گئے۔ اسی لئے ان کی آپ بیتی کی اشاعت اردو زبان میں ایک ریکارڈ ہے۔

اس کتاب کا انحصار ایڈیشن شائع ہو چکا ہے

صفحات 1120 قیمت 300 روپے ڈاکٹر ج 23 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز، کراچی

kitabiati1970@yahoo.com • 021-5804300

63-فیر II ایسٹیشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی 75500

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

اکبر علی خاں نے کسی کو بلا لینے کا نہایت عاصب مشورہ دیا تھا۔ میں خود اسی شخص ویش میں تھا، کسے نہیں۔ بھل کی نسبت سے زریں کا چہرہ ہی سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ تار پٹنے ہی وہ چل پڑے گی۔ ارشد، ثوب اور جہاں کیر فیض آباد میں ہیں۔ اب تو نصیر بابا بھی وہیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ہم راہ وہ آسکتی ہے اور نیساں، ملکی اور خانم وغیرہ میں کسی کو بھی ساتھ لاسکتی ہے۔ اسپتال میں رات کے وقت ایک ہی تیار دار رہ سکتا ہے، باقی دوسرے گراڈ ہوگی میں رات گزار لیں گے۔ زریں سے زیادہ بھل کی خدمت کون کر سکتا ہے۔ سچائی تو اس کا ہنر ہے۔ آدمی دھوپ ہوتا ہے آدمی چھاؤں، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ زریں تو سر پر کونئی شہر سایہ دار ہے۔ اس گل اندام کا تو وجود ہی تقسیم سے، ریشم سے عبارت ہے۔ آدمیت کا اس سے سوا اعلیٰ ترین وظیفہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود کو دوسروں پر ترک کر دیا جائے۔ اس کی مثال تو شمع کے مانند ہے جو روشنی بکھیرتی اور تمام ہوتی رہتی ہے۔ اپنے سرھانے اسے دیکھ کے بھل کو بہت سکون ہوگا۔ وہ اس کی بات بہت مانتا، بہت اس کے تار اٹھاتا ہے۔ اس شیوہ ناز برادری کے تسلسل کے لیے لازم ہے کہ وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جانے کی کوشش کرے۔ زریں اس کے لیے امید کا درجہ رکھتی ہے۔ امید ہی تو زندگی کی توانائی ہے۔ امید بجائے خود زندگی ہے۔

بھتا میں سوچتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ فیصلے کا مرحلہ ہو تو دماغ بھی بالکل ساتھ نہیں دیتا، کئی حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ ابھی کچھ انتظار کرنا چاہیے۔ خدا کرے، بھل جلد ہی ٹھیک ہو جائے۔ کل رات وہ اپنے پیروں سے یہاں آیا تھا۔ ایک رات میں اس کا کیا حال ہو گیا۔ کل اس کی حالت میں بہتری بھی آسکتی ہے۔ میں اسی اندیشہ و فکر میں الجھا ہوا تھا کہ اسپتال کی مخصوص وردی پہننے دو سو دوپ ملازم ہاتھوں میں دشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کے نرس سیورین اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ملازم بکٹ، کیک پیسٹری، سمو سے اور چائے پر مشتمل ہشتے کا سامان لائے تھے۔ اکبر علی خاں صوفے کے آگے رکھی میز پر تشریاں اور پیچھے رکھنے میں سیورین کا ہاتھ بٹانے لگے۔ یہ سارا ناشتہ انہیں کے ایما پر آیا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی مقصد سے وہ سیورین کے پاس گئے ہوں گے۔

”اب آپ انکاپرمت کیجیے۔ مجھے بھی اب کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دیکھئے، سمو سے کیسے کرا گرم ہیں۔“ مجھے آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے سودا گروں جیسا طر ایضہ اختیار کیا۔

ادھر گلنے بھی تار دیا جاسکتا ہے۔ تاریخینے کی دیر ہوگی۔ زور، جبر و اور جامو کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ ہوگی۔ ان میں سے کوئی بھی کل رات باز آبادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک یہاں آجائے گا لیکن زریں ہو، جامو ہو یا بھرو اور زور۔ آج صبح ہی ڈاک خانے سے پٹنا شہر پہنچنے کی اطلاع انہیں دی ہے۔ اسی دن دوسرا تار پٹنے سے سب ٹھیک جائیں گے۔ اور انہیں بلانے کے لیے کوئی تو عذر کرنا ہی پڑے

میری بھوک غائب تھی لیکن منع نہ کیا جاسکا۔ اکبر علی خاں نے سیورین کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس کی معذرت پر اصرار بھی نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور جیسے میں کوئی مہمان ہوں، میزبانہ برتاؤ کرتے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مجھ سے کچھ اور قریب ہو گئے وہ راز دارانہ انداز میں کہنے لگے۔ ”ایک بات ذہن میں انگ رہی ہے میاں۔ اسے میرا وہم ہی چاہیے۔ اصل میں قانون کے پیشے سے وابستگی ہے۔ ہر دیدہ و نادیدہ پر نظر رکھنے کا مجھے عارضہ سا ہو گیا ہے۔“

”کیا بات ہے؟“ میں نے تردد سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، یہی مناسب رہے گا آپ کسی کو یہاں بلا لیں۔“ وہ رک رک کے بولے۔

”کیوں، کیوں؟“ میں نے الجھ کے پوچھا۔

”دیکھیے، میدا کے ٹھکانے سے ہم یہ سلامت واپس آ گئے ہیں۔ یہ غائب سب کچھ درست ہو گیا ہے لیکن، لیکن.....“ وہ پہلو بد لے گئے۔

”لیکن کیا؟“

”ایسے لوگوں کا کیا بھروسہ۔ بد ماغ لوگ ہیں۔ کسی وقت دماغ پھر جائے۔ مرنے والے کی آخری رسوم کے وقت وہاں موجود لوگ بھڑک نہ جائیں۔ اپنے ساتھی کے اس طرح جدا ہوجانے کا صدمہ انہیں مشتعل بھی کر سکتا ہے، اور کہتے ہی وہ میدا کے فرماں بردار ہوں، برہمی میں اس سے باز پرس بھی کر سکتے ہیں کہ ایسی آسانی سے آپ کو کیسے چائے دیا گیا۔ ٹھیک ہے، وہ لوگ اس وقت خاموش رہے لیکن ضروری نہیں، بعد کو بھی چپ سادھے رہیں۔ بعد کی کیا ضمانت ہے۔ میری مراد ہے، میدا کے ٹھکانے کا کوئی آدمی، مرنے والے سے زیادہ قریب کوئی بھی جنوی آدمی پولیس کا رخ نہ کر لے۔ اور وہی بات ہوگی، پولیس تو تماشے کی منتظر رہتی ہے۔ فرض کیجیے، ایک فی صد بھی میرے اس خدشے کا امکان ہے تو یہاں بھائی صاحب کی تیمارداری

کے لیے کوئی عزیز تو موجود ہوگا۔ کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا۔ دوسری جانب رہا پولیس سے غشے کا معاملہ.....“ دیکھ لیا جائے گا پھر۔ مگر کچھ وقت تو قانونی مراحل میں لگ جاتا ہے۔

”میرا لحاظ تھا یا اپنے مدعا پر مبالغے کے شے نے انہیں آگھیرا تھا، وہ لفظ چبا چبا کے بول رہے تھے۔ انہوں نے ایک فی صد امکان کی بات کی تھی۔ ان کا اندیشہ ایسا غلط نہیں تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”سمجھے آپ؟“ میری خاموشی پر وہ واپس سے ہو گئے اور کسمسا کے بولے۔ ”میں نے کچھ زیادہ قیاس تو نہیں کر لیا؟“

”نہیں،“ میں نے ان کی ہم زبانی کی۔ ”بے شک کچھ بھی ممکن ہے۔“

اکبر علی خاں ان لوگوں سے واقف نہیں تھے اور ان کے سامنے اڈوں کے طور طریقوں کی تشریح بھی مناسب نہیں تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ کے خدشات بجا ہیں لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔“

”نہیں ہونا چاہیے۔“ اس ازیاز پوٹو ٹھٹک مگر جناب، میں تو ایک فی صد کی بات کر رہا ہوں۔ نظر تو ہمیں ہر طرف رہتی پڑے گی، رکھنی چاہیے۔“

”وہ ایسے بدعہد لوگ نہیں ہیں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ان کی آنکھیں چندھیا سی تھیں۔

”میں انہیں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”یعنی آپ پر امید ہیں کہ اب ان شورہ پشتوں کی طرف سے کسی کیسے اور عداوت کا امکان نہیں ہے؟“ اکبر علی خاں کے لہجے میں ناراضی بھی تھی مگر بھی تھا۔

جرح کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے ان کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ”نہیں، پوری طرح

نہیں۔“

”یہی تو میں عرض کر رہا ہوں میاں۔“ وہ زور دے کے بولے۔

”ایک دن اور دیکھتے ہیں، کسی کو بلائے اور آنے میں اتنی دیر نہیں لگی۔“

وہ ایک مہذب آدمی تھے۔ میری ٹھٹکی آواز سے انہوں نے اخذ کر لیا کہ ان کے وہم و قیاس میری ناگواری و ناسازی کا باعث ہو رہے ہیں۔ ایک چیز فہم شخص کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ محفل کی تیمارداری کے لیے کسی کو بلائے میں تامل کی وجہ کوئی مجبوری اور مصلحت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے موضوع بدل دینے کی بلاغت کی۔ ”سمو سے کا ایک ٹکڑا میرے سامنے کیا۔“ منہ سلوٹا کر کیجیے۔“

میں نے ان کی خواہش کی قبول کی۔

”شیرینی منہ میں رکھ لی رہتی ہے اور ذائقے بدلتی رہتی ہے۔ دیر ہو جائے تو منہ کا مزہ ٹڑا سیٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کا توڑ ٹھٹک ہی سے ممکن ہے۔“ انہوں نے خوش کلامی کی۔

غذا کی اپنی کرشمہ کاری ہے۔ کہتے ہیں، غذا، غم کی تو جہن ہے لیکن پھر آدمی کیا کرے۔ اپنے پیار کے ساتھ پیار ہو جائے۔ کسی جانے والے کے ساتھ خود بھی چلا جائے۔ کیا عجیب ہے، دکھ سنے کے لیے بھی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بہت کم کھا پایا تھا لیکن مجھے اپنا جی کسی قدر ٹھیرا ہوا لگتا تھا، تشنگی سے دکھ دو چند ہو جاتا ہے اور سر ٹھٹکی سے جاتا نہیں۔ شاید کچھ پوچھوں ہے کہ حالت غم میں اشتہائی نہیں، دلی دلی، چھپی چھپی رہتی ہے لیکن آدمی کو خود اچھا نہیں لگتا۔ حالت غم میں تو اسے اپنا غم ہی عزیز ہوتا ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ سیورین نے کمر روشن کر دیا۔ دوپہر اکبر علی خاں گھر سے لٹکے تھے۔ ان کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گئے بھی

وہ میرے ساتھ تھے، ایک چاقو بردار کے ساتھ جو ان کے گھر میں ناگہانی بلا کی طرح وارد ہوا تھا۔ کتنی ہی بات صاف ہو گئی ہو، میری ہیبت تو ان کے دلوں پر نقش ہو چکی ہوگی۔ اکبر علی خاں کو گھر جانے کے لیے میں نوکے نوکے رہ جاتا تھا۔ کہیں وہ برائے مان جائیں۔ غالباً میں بھی کچھ یہی چاہتا تھا کہ وہ یہیں میرے پاس بیٹھے رہیں۔

روٹی کو اپنے اظہار کے لیے اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اندھیرا جتنا گہرا ہو رہا تھا، کمرے میں چلتے چلتے اتنے ہی روشن ہوتے جاتے تھے۔ اکبر علی خاں کو خود ہی احساس ہوا، کہنے لگے۔ ”جی تو نہیں چاہ رہا مگر گھر جانا چاہیے۔ مجھے اجازت دیں میاں۔“

”گھر میں سب شدت سے منتظر ہوں گے۔“

یہی بہتر ہوتا کہ آپ انہیں بتا کے آتے۔“

”آپ کو نہیں معلوم، نزہت خانم عام قسم کی جذباتی خاتون نہیں۔ ان میں بہت ٹھٹک ہے۔“ اپنی نیٹیم کا ذکر کرتے ہوئے ان کا لہجہ شیدا نیت سے لب زبیر تھا۔

”مگر در تو ہو گئی ہے۔“ میں نے زربل کہا۔

”ہاں، لیکن نزہت ہمیں غیر ذمے دار نہیں سمجھتیں۔“ وہ وثوق سے بولے اور صوفے سے اٹھتے اٹھتے مجھے تاکید کرنے لگے کہ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں گے، وہ گھر سے کھانا لائیں گے۔

میں نے بہت کہا کہ اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ ایک تو مجھے بھوک نہیں، دوسرے اب رات ہوائی چاہتی ہے۔ گھر جا کے وہ آرام کریں اور تازہ دم ہو کے صبح آجائیں۔

”دل نہیں مانے گا۔“ گھر سے یہاں تک کا فاصلہ بھی اتنا نہیں ہے۔ بس میں آ رہا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کیجیے۔“ انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

دروازہ عبور کرتے ہوئے وہ رک گئے اور

بولے۔ ”گھر تو آپ کو یاد ہوگا؟“
 ”کیوں؟“ میں نے تجسس سے
 پوچھا۔ ”آپ تو آہی رہے ہیں۔“
 ”بس یوں ہی۔“ ان کا جسم لہرا سا گیا۔ ”ایسے
 ہی خیال آیا۔ خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی صورت ہو تو
 مجھے اطلاع مل سکے۔ احتیاطاً میں گھر کا پنا لکھ دیتا
 ہوں۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے ان کا بازو تھام کے
 کہا۔ ”آپ مطمئنانہ سے چاہیے۔“
 وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اسی کیفیت میں
 دروازے سے نکل گئے۔ کچھ دور تک میں نے ان کا
 ساتھ دیا پھر ان کے اصرار پر کمرے میں لوٹ آیا
 اور میرے قدم سیدھے نکل کے بستر کی جانب
 اٹھے۔ اس کی حالت وہی تھی، اپنے آپ سے بے
 خبر۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ اس کے
 جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ ناچار میں نے سیورین کی
 طرف دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر اٹھی رکھ کے مجھے
 منع کیا اور جلدی سے اپنے لیے مخصوص کرسی سے اٹھ
 کر میرے پاس آگئی اور میرے پہلو میں کھڑی
 ہو گئی۔ کسی انہمی خبر کے آسرے میں، میں نے اس
 سے پوچھا۔ ”اب کیا حال ہے ان کا؟“

میرے لہجے میں چھپی حسرت اس پر عیاں
 ہو گئی۔ وہ ایک خوش طبعیت لڑکی تھی، مستعدی سے
 بولی۔ ”حرارت نہیں ہے اور اچھی علامت ہے۔“
 ”یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے
 شکستہ آواز میں پوچھا۔

”انہیں مسلسل نیند کی دوائیں دی جا رہی
 ہیں۔“
 ”ڈاکٹر لوگ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے بے چینی
 سے پوچھا۔

”وہ ہمیشہ پر امید رہتے ہیں۔“ وہ نرمی سے
 بولی۔
 ”بتاتے کیا ہیں؟“ میں نے تکرار کی اور اپنے

لہجے کی ترشی پر قابو نہ پاسکا۔ ”آپ کو تو کچھ بتایا
 ہوگا۔“
 ”ابھی واضح طور پر کچھ نہیں۔“ وہ متانت سے
 بولی۔ ”لیکن ظاہر ہے، جلد ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ
 جائیں گے۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ سادہ و شایستہ سیورین کے
 پاس میری خوش نویدی کے لیے مزے سے کچھ سوائیکس۔
 نرس ایک کی طرح اس نے بھی مریضانہ اعزاز میں
 مجھے آرام کا مشورہ دیا۔ کتنی آسانی سے ایک آدمی،
 دوسرے آدمی کو سکون و آرام کی تلقین عطا کر دیتا
 ہے۔ یہ جانے بغیر کے دوسرے کے کہاں خانے
 میں کسی خود کش یا بے سیورین کو یا تو واقعی کچھ معلوم
 نہیں تھا یا کوئی احتیاطی تدبیر تھی۔ اس کی اس کمزوری،
 رکی رکی جواب دہی پر جی میں آتا تھا کہ کسی
 دوسرے لہجے میں باز پرس کروں مگر میں اسے
 خوشنکس نظروں سے دیکھا کیا۔ اس کے چہرے پر
 بڑی معصومیت تھی۔ وہ تو ایسی نازک تھی کہ ذرا اونچی
 آواز پر کھلا، مرتعجا جائے۔

”گھبراہٹ نہیں۔“ وہ نرم و ملائم آواز میں
 بولی۔ ”ڈاکٹر رائے رات کو آئیں گے۔ رات کو وہ
 اسپتال نہیں آتے۔ صرف آپ کی خاطر آئیں
 گے۔ آپ پر وہ بہت مہربان ہیں۔“

”میرے بجائے میرے بھائی پر مہربان ہوں
 تو بہتر ہوگا۔“

”اچھی کی وجہ سے آئیں گے۔“ میرے لہجے کی
 تیزی سے وہ اداس ہوئی اور کچھ توقف کے بعد میرا
 دھیان بنانے کے لیے دل گداز لہجے میں
 بولی۔ ”آپ کو اتنی دیر کیوں ہوگی؟ مجھے تو فکر ہو رہی
 تھی۔ آپ نے کہا تھا، آپ کے لیے شہر نیا ہے۔“
 ”لیکن داستان ہے۔ بس ایسے ہی۔“ میں نے
 ہزارہی سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے وقت پر آگئے تھے۔ وقت کے وہ
 بڑے پابند ہیں۔ آپ کے بارے میں پوچھنے پر

میں نے ان سے نہیں کہا کہ آپ کو مجھے دیر ہو گئی
 ہے۔ دوسری بار انہوں نے پوچھا تو مجھے بتانا پڑا۔
 لباس تبدیل کرنے اور کچھ ضروری سامان لانے
 گراؤ ہوئی تک گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔
 ڈاکٹر رائے کے مزاج کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اسپتال
 میں بھی اتنا سے دور دور رہتے ہیں۔ اس کی ٹھیکس
 تھکر رہی تھیں۔ جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا، وہ ایسی کم
 سخن بھی نہیں تھی۔ کچھ ایسے طور سے باتیں کرتی تھی
 جیسے پہلی بار نیا کچھ بول رہی اور نیا کچھ سن رہی ہو۔
 میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اکبر علی خاں
 کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ”کیا آپ کا ان سے
 کوئی رشتہ ہے؟“

”رشتوں کے لیے رشتہ داری ضروری ہے
 اور شدت۔“ میں نے کہا۔
 ”آپ انہیں پہلے سے نہیں جانتے تھے؟“
 ”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“

وہ حیران ہوئی اور مردوۃ اس کے ہونٹوں پر
 مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا
 میں نھل نے بس اس سانس بھی اور اس کا جسم بے کل
 سا ہوا۔ صاف نظر آتا تھا کہ درد و کرب کی کوئی لہر
 اس کے تن بدن میں اٹھی ہے۔ سیورین متحرک
 ہو گئی۔ میرا تو سر پکڑنے لگا۔ سیورین نے ایک پہلو
 سے دبا ہوا نھل کا ہاتھ رسائی سے باہر نکالا۔ میں
 نے دھڑکنی آواز میں اسے دکھایا۔ اس کے پونے
 حرکت میں آئے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھلیں،
 ماتھے پر سلوٹس ابھریں۔ دوسرے لمحے وہ غافل
 ہو گیا۔ سیورین نے اشارے سے مجھے مزید
 آوازیں دینے سے روک دیا۔ ہوا میں فٹکی تھی۔
 سیورین نے اس کے جسم پر سیٹھ سے چادر ڈھانپ
 دی۔

میں وہیں نھل کی پابنتی کھڑا رہا۔ وہ تو کوئی
 اور آدمی لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ ہر کلمے ہوئے تھے
 اور آس پاس کوئی بندش بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے میں

کسی شے میں کسرا ہوا ہوں۔ میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔
 یہ کیسی بے چارگی، نا کارگی ہے کہ میں اس کے کسی
 کام نہیں آ سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھ
 سے اس کی خبر گیری میں کہاں کو تباہی ہو رہی ہے۔
 میں پھر کیا کروں، کہاں جاؤں، کون سا ہنر، کون سا
 داؤد آزمائوں کہ وہ نھل جائے اور میری حالت
 اس سے کون سی جدا ہے۔ وہ سب سے بے گانہ
 ہو کے بستر پہ پڑ گیا ہے۔ میرا ہوش اور میرے
 دست و بازو کبھی کس کام کے ہیں۔ میرا حال تو اس
 سے برا ہے۔ اسے میری ٹکریں کہ مجھ پر کیا گزر رہی
 ہے۔ میری تو جان بھی جا رہی ہے۔ کسی بیمار کو علم
 نہیں ہوتا کہ دوسرے ثابت و سالم اس کے مدد،
 اسے اپنے آپ سے زیادہ عزیز رکھنے والے کیسے
 دیران ہو جاتے ہیں۔

جانے کتنی دیر ہوئی، میں نھل کے بستر کے
 سر جانے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ سیورین کب
 میرے پاس آئی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ اس کی
 دھیمی آواز کی دستک پر میں چونک پڑا۔ وہ نزدیک
 ہی کھڑی تھی۔ اس نے جیکے سے میرا ہاتھ تھام لیا تو میں
 سٹ پٹا سا گیا اور مجھے پیمانی بھی ہوئی۔ کسی معمول
 کی طرح میں نے اس کی بے روی کی۔ وہ مجھے نھل
 کے بستر سے ہٹا کے صوفے تک لے آئی۔ خوش
 چہرگی سے خوش اطوار سی شروٹ نہیں ہے۔ اس میں
 دونوں خوبیاں یک جا ہو گئی تھیں۔ اسپتال کے ان
 شاہانہ کمروں کے لیے اپنے ہنر میں ماہر زرموں کا
 انتخاب کیا گیا ہوگا اور انہیں مریض کے ساتھ ساتھ
 بیمار دار سے حسن سلوک کی تربیت۔ بطور خاص دی گئی
 ہوگی۔ بیمار داروں کو کچھ کم توجہ کی ضرورت نہیں
 پڑتی۔ سیورین کی خوش شعاری میں خوش نہادی کا
 بھی دخل تھا کہ اس کی راہ و رسم میں تکلف و صنعت کی
 گرائی نہیں تھی۔ میں نے صوفے کے مونڈھے سے
 گردن نکال کے آنکھیں کھلیں۔ سیورین بھی شاید
 یہی چاہتی تھی۔ میری طرف سے مطمئن ہو کے وہ

دروازے کے کنارے رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔

میں نے طرح طرح کے وہم و گمان کی پورش سے خود کو محفوظ کرنے اور ایک سوہونے کی کوشش کی لیکن آدمی کو اپنے اختیار کا پورا کس قدر ہے۔ میرا سارا جسم نوٹ پھوٹ سا رہا تھا۔ اکبر علی خاں کی موجودگی میں ایسی ناتوانی اور بے بسی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد سب کچھ بکھرا ہوا لگتا تھا، بہت شور ہو رہا ہو جیسے، ایک ہاؤس ہو اور ہجوم میں، میں اکیلا کھڑا ہوں، اور کوئی کسی کی نہ سن رہا ہو، کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا ہو جیسے۔

میں صوفے پر نیم جاں پڑا تھا کہ کسی کی بہت ہلکی آواز پر آنکھیں بند نہ رہ سکیں۔ وہ نرس ایکی تھی۔ اس کا مطلب تھا، بیورین چلی گئی ہے۔ جاتے وقت اس نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہو گا حالاں کہ میں سو کہاں رہا تھا۔ میں تو اپنے آپ سے دور ہو جانے، اپنے آپ سے اوجھل ہو جانے کے جتن کر رہا تھا۔ ایکی نے ہنسنے کی بجائے مجھے سلام کیا، حال پوچھا اور معذرت چاہی کہ ڈاکٹر رائے اسپتال آ چکے ہیں اور کسی وقت کمرے میں آ سکتے ہیں، اس لیے اسے میرے آرام میں خلل ہونا پڑا۔

میں فوراً اٹھ گیا اور میں نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں جلدی جلدی چہرے پر پانی چھڑکا۔ کاش پانی میں آدمی کے دوران خاندان وجود دینے کی قوت بھی ہو کر رہتی۔ اپنا حلیہ کسی قدر درست کر کے میں کمرے میں واپس آیا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میری نظر میں دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں، پھر میں باہر نکل گیا۔ گھومتی ہوئی مختصر راہ داری میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سرے سے اس سرے تک میں نے کئی پھیرے لگائے۔ ڈاکٹر رائے کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے اسپتال کی مرکزی عمارت جانے کا ارادہ کیا اور چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دور سے آئیں سانی دیں۔ اس حیاں سے کہ ڈاکٹر رائے یوں راہ داری میں

مجھے ٹھٹھا دیکھ کے مکدر نہ ہو، میں کمرے تک لوٹ آیا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا۔ اس کے استقبال کے لیے میں کمرے سے باہر کھڑا رہا۔ اس کی رفتار اتنی کم تھی نہ اتنی تیز۔ مجھے دیکھ کے اس نے میرے سلام کے جواب میں سر کو خفیف جنبش دی اور اپنے ادھیڑ ساٹھی ڈاکٹر سے گفتگو کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اس کا یہ مختار نہ طور اچھا نہیں لگا، سو اس کے پیچھے جانے کے بجائے میں دروازے کے پاس سٹڑا سٹھا کھڑا رہا۔

دونوں ڈاکٹر انہماک سے مشغل کام مآثر کرتے رہے۔ انہوں نے نہیں دیکھی، پیر کے انگوٹھے کھینچے، ڈاکٹر رائے نے اس کا سر ٹھٹھا، دیا یا اور پوچھے اٹھا کے آنکھیں دیکھیں اور اپنے ساتھی سے کوئی سر گوشی کی۔ دونوں نے پابندی سے لگے ہوئے احوال مانے پر بار بار نظر ڈالی۔ ڈاکٹر رائے نے مشغل کو آہستہ سے پکارا تو مجھ سے اپنی جگہ پھیرا نہ جاسکا لیکن ایک قدم بعد میں نے خود کو روک لیا۔ میں نے دیکھا، ڈاکٹر رائے کی آواز کے جواب میں مشغل کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا حال پوچھنا چاہا، دو بارہ، سہ بارہ۔ مشغل کے ہونٹ بددائے ہوں گے کہ ڈاکٹر نے سر جھکا کے اپنا کان اس کے قریب کر دیا، اتنے قریب کے مشغل کی گہری سانسیں اس کے کمال سے مس ہو رہی ہوں گی۔ مشغل نے کوئی جواب دیا، یہ میں نہ جان سکا۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر رائے کچھ نہ پاتا تو اتنی جلد وہاں سے نہ ہٹا۔ لمحوں تک وہ اپنے ساتھی سے مشورہ کرتا رہا اور دوبارہ پہلے کی طرح مشغل کے سرہانے چلا گیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہو سکتا ہے، دبا بھی رہا ہو۔ مشغل کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئی ہیں یا کوئی گراہ لگتی ہے، وہ یہی جانتا چاہتا ہوگا۔ میری نگاہیں مسلسل ڈاکٹر رائے کے چہرے پر جھنک رہی تھیں۔ ڈاکٹر وہاں کے چہروں کی بے تاشی ان کی تعلیم کا حصہ ہوئی

ہے یا پھر یہ معمول کی بات ہے۔ صبح وشام طرح طرح کے سرکیش آزمائے آزماتے وہ ان کی آہ و بکا کے عادی ہو جاتے ہیں۔ معمول کی باتوں اور مناظر سے عام آدمی بھی سرسری گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر رائے نے عقب میں مستعد کھڑی نرس ایکی کو کوئی ہدایت دی۔ ایکی تنہا ہی سے نوٹ بک میں درج کرنی رہی۔

پھر کہیں ڈاکٹر رائے کو میرا خیال آیا۔ میرے سامنے آ کے وہ پھیر گیا اور چیز چھتی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں خاموش رہا۔ "کیسے ہو تم؟" اس کا لہجہ اتنا سناٹا نہیں تھا، لہجہ نہ چہرہ۔

"میں نے ہونٹ بھیج لیے اور کچھ نہیں کہا۔"

"ٹھیک تو ہو؟" وہ انگریزی ہوئی آواز میں بولا۔

"ٹھیک کیسے ہو سکتا ہوں۔"

"ہونٹ؟" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔ "کچھ ناراض لگتے ہو، کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔ کچھ نہیں۔" میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "آپ سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے۔"

"تم ہو سکتے ہو۔"

"میں کہاں..... میں....." مجھ سے آگے کچھ نہ بولا جاسکا۔

"تم نے کچھ پوچھا نہیں بھائی کے لیے؟"

"کیا حاصل، معلوم ہے، کیا جواب ملے گا، وہی رہے رہائے، گھسے بٹے جملے۔"

"تم کیا سننا چاہتے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں۔" میں نے مختصر کیا۔

"کہنے کے لیے کچھ ہو جی تو کچھ کہا جائے۔"

منڈلائے لیکن تازگی کے احساس نے مجھے باندھے رکھا۔

"کافی پیو گے؟" اس نے دھیرے سے کہا۔

میں دنگ رہ گیا۔

"کافی یا چائے؟"

"جو..... جو آپ کو پسند ہو۔" میری زبان ہلکا ہو گئی۔

"جسہیں کیا مرغوب ہے؟"

"کافی ہی ٹھیک ہے۔" میں نے دلی آواز میں کہا۔

اس نے نرس ایکی سے کافی منگوانے کی فرمائش کی۔ میری طرح ایکی کو بھی یقین نہیں آیا۔ ایک ٹاپے کے لیے اس پر سٹانا طاری رہا پھر پتی چھپاتی باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رائے میرا ہاتھ پکڑے صوفے پر آ گیا اور اس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

مجھے اپنی کم تھی، جلد بازی اور بے اعتنائی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

"تم کب آئے تھے یہاں؟" ڈاکٹر رائے نے پھسستی ہوئی آواز میں پکا پکا مجھ سے پوچھا۔

"کل..... کل رات....." میں نے ہلکا پھلکا ہونے کہا۔

"گویا ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ سر کی اندر دلی چوٹ ہے، چوٹ سے ہونے والے نقصان کی نوعیت جاننے کے لیے چند ٹیسٹ ضروری ہیں۔ ان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہنا مناسب ہوگا۔"

"جی ہاں، میں سمجھتا ہوں۔"

"تم نہیں سمجھ رہے۔"

میں چپ رہا۔

"تمہاری عمر ہی ایسی ہے اور یوں بھی تم ایک الگ نوجوان ہو۔ ویسے نوجوانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

مجھ سے ان کی حالت برداشت نہیں

ہورہی۔" میں نے تیدہ آواز میں کہا۔

"یہ تعلق کی بات ہے۔"

"آپ کو کیا بتاؤں، یہ کون ہیں..... آپ نہیں

سمجھیں گے، یہ میرے لیے کیا ہیں۔"

"کوئی بھی کسی کے لیے اتنا اہم ہو سکتا ہے۔"

"وہ میری زندگی ہیں۔" اپنے لہجے کی شدت

مجھے خود گراں گزری۔

"یہ جذبہ اب کیسا غطا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ

دیدے گھما کے بولا۔

"آپ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ سب لوگ

یہاں یہی کہتے ہیں۔" میں نے اس کی منت کی۔

"بس ڈاکٹر صاحب، آپ انہیں اچھا کر دیجیے۔ میں

آپ کا..... آپ کا....."

میری بات ادھوری رہ گئی۔ نرس ایک تیزی سے

کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہچہے ایک

باوردی خدمت گار بھی تھا۔ اس نے پیالیاں،

دودھ، شکر اور کافی کے برتن میز پر سجانے شروع

کر دیے۔ دو سیٹوں میں انگریزی کیکٹ، شک میوہ

بھی وہ ساتھ لایا تھا۔

"ایک اہم بنای، دودھ پرائے نام، آدھ چمچ

شکر۔" ڈاکٹر رائے نے ایسی کو حکم دیا۔

ایک تمام تر نفاست سے کافی بنانے لگی۔ ڈاکٹر

رائے دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "تم کیا کہہ

رہے تھے؟"

"میں کہہ رہا تھا..... مگر نہیں، جانے دیجیے۔"

میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے آپ کو کیا باور کرانا

ہے۔"

"ہاں۔" وہ سر ہلانے لگا۔ بہتر ہے، کچھ مت کہو

اور باتیں کرتے ہیں۔"

"کیسی بات؟ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا

ڈاکٹر صاحب۔"

"ہشت۔" اس نے منہ بنایا۔ "تم پڑھے لکھے

نوجوان ہو، تمہیں معلوم ہوگا کہ زندگی وقت کے

چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر کام میں

وقت لگتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر وقت کا پیمانہ گزری

نہیں ہوتا چاہیے۔ گزشتہ پچیس گھنٹے آپ نے بھی

بتائے ہیں، میں نے بھی، لیکن مجھ پر قیامت کی

طرح گزر رہے ہیں، پہاڑ کے مانند۔ ممکن ہے آپ

پر جو بیس گھنٹے کم گزرے ہوں۔"

اس کے شانے سپدھے ہو گئے۔ "تم نے بڑی

اچھی بات کہی لیکن کوئی نہ کوئی پیمانہ تو بنانا ہی پڑتا

ہے۔ زندگی محض تصوریت یا عینیت نہیں۔"

"اور زندگی محض مادیت اور حقیقت بھی نہیں

ہونا چاہیے۔"

"دو اور دو تو چار ہی ہوتے ہیں عزیز من۔"

"کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ جناب، مگر یہ

پانچ اور بھ ہو جانے والا پیمانہ آپ نے ایجاد نہیں

کیا۔"

"کبھی کبھی کی بات ہے تا....." وہ لطف لینے

ہوئے بولا۔ "اس کے لیے پیمانے کی ایسی کہا

ضرورت۔"

"لیکن یہ کبھی کبھی زندگی کا ایک مستقل مظہر

ہے، پھر کسی طرح اس کی تشریح، کس طرح اسے

بیان کیجیے گا؟"

"یہ شاذ و نادر، اوزان و پیمائش سے ماسوائے

رکھو۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"یعنی آپ ایک ڈاکٹر، پانچ یا چھہ پاسات

ہو جانے والے مظہر سے انکاری نہیں۔ میں بھی کیا

انتظار کر رہا ہوں کہ وقت کے ان ٹکڑوں سے کچھ سوا

کیجیے، سیمانی کا کوئی کرشمہ، کوئی اعجاز۔"

اس کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ "میرا

اندازہ غلط نہیں تھا۔"

"کیسا اندازہ جناب؟" میں نے تعجب سے

پوچھا۔

"جی کہ تم سے دل چسپ اور معنی آفریں مکالم

ہو سکتا ہے۔“ اس نے کافی کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا اور ایک سے ایک اور پیالی کی فرمائش کی اور میرے آگے بیکٹ کی پلیٹ بڑھائی۔ ”تم نے نہیں لے۔ یہ تو کھانے پینے کی عمر ہے۔“

”مگر وقت نہیں۔“ میری بڑ بڑا ہٹ شاید اس نے نہیں سنی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پلیٹ سے بیکٹ اٹھا لیا۔

”یہاں اسپتال میں تمہیں خالص چیزیں ہی ملیں گی۔ ڈاکٹے میں مزے دار نہ ہوں مگر ہولی خالص ہیں۔“

ایک ایک میرے ذہن میں ایک گمان نے ڈبک مارا اور میرا سارا وجود ہی ڈگمگایا۔ مجھ ایک اجنبی سے ڈاکٹر جیسے تند خو شخص کی یہ رغبت اختیاری اور شعوری تو نہیں؟ اسے میری حالت اور وحشت کا احساس ہو گیا ہے۔ کہیں مجھ پر خالص لطف و کرم شعل کی طرف سے بے اطمینانی کے سبب سے تو نہیں؟ میری استقامت کے لیے وہ کوئی پیش بندی تو نہیں کر رہا؟ ابھی ابھی تو اس نے شعل کا جائید کیا ہے۔ اس کے نورانی بعد اس کی مہربانی سوا ہو گئی ہے۔

میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے اپنی بدگمانی سر سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ ڈاکٹر رائے کی کبھی ہوئی باتوں کی بازگشت دماغ میں گونج رہی تھی۔ میری نفسی کے لیے خوش امید کی کے فراخ دلانہ اظہار میں اسے کیا عار ہے۔ اسے کوئی امید تو مبہم دموہوم بنیادی طور پر وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ مجھ پاگل کے لیے زینہ بہ زینہ آباد کی ہی مناسب رہے گی۔ ایسی کسی تدبیر ہے تو وہ عمل چیرا نہیں؟ مجھ پر نوازش کی ارزانی اور شعل کے معاملے میں محتاط بیانی میں دور بینی کا کوئی پہلو تو منظر میں ہے۔

میرا سر گھوم رہا تھا اور شاید کافی کی پیالی میرے ہاتھ سے گر پڑی کہ نرس ایکی نے سلیطے سے اپنی

گرفت میں لے لی۔

”کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو گئے؟“ ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا مگر وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ میری کیفیت اس ہزار چشم سے سمجھی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ بے تاب سا ہو گیا۔ ”اوو، اوو، یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہو گیا میرے بچے۔ یقیناً کوئی برا خیال، بڑے خواب کی طرح تم پر مسلط ہو گیا ہے۔ نا نا..... میرے عزیز، جو صلہ رکھو۔“

میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ آنکھوں کی آگ پانی بن جاتی ہے۔ میں نے بہت ضبط کیا لیکن آنسو نہ رک سکے۔

ڈاکٹر اور مضطرب ہو گیا۔ اس نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے۔ دو اور دو، پانچ کی کرشمہ کاری کا مرحلہ ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو ہم اپنے تپ نول کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی امید ہی میں..... سب سے پہلے یہ تو پتہ نہیں۔ میں نے وقت کی بات کی تھی، کوئی مایوسی کب ظاہر کی۔“

”ڈاکٹر صاحب۔“ مشکل تمام میں نے سنی تھی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے کچھ بتائیے۔“

”کیا کچھ؟“ وہ چپٹا کے بولا۔ ”میں نے تم سے کیا پچھایا ہے؟“

”آپ نے صاف کچھ بتایا بھی نہیں۔“ میں نے یاسیت سے کہا۔

وہ اپنا سر تیزی سے ہلانے لگا۔ ”اوو، نہیں، میں نے تم سے کیا کہا ہے، یہی تا کہ ابھی بعض طبی تجویزوں کا انتظار ہے۔ نہ پھر جب تم یہاں نہیں تھے، میں اس شعبے کے ماہر ڈاکٹر فرینکی کو لے کے آیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ میں تمہیں کچھ صاف بتانے کی صورت میں نہیں ہوں، ہم مریض کے عزیزوں سے کوئی ایسی سیدھی بات نہیں کرتے جو بعد کو پشیمانی کا باعث ہو۔ ہم ابھی مشاہدے کے مرحلے میں ہیں میرے بچے!

یہ ایلو پتھی طلب ہے، یونانی، آئورودیک اور ہومیو پتھی نہیں۔ اس کا اچھا طور طریقہ ہے۔ تم کسی ذیہ، سنیا سی بابا، سڑک کے کنارے چوکی پر بیٹھے کسی پہلوان، اطالی اور بعض دیکھ کے جسم کے اندر کا حال، سارا کچا چٹھا جان لینے والے حکیم کے پاس نہیں آئے۔“ اس کی آواز پر کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں سے سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے میری کمر چھلی۔ ”لگتا ہے، پہلے تمہارا علاج کرنا چاہئے۔ یہ کمزوری اور رونا دھونا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ چلو، ایک بہار اور جو صلہ مند نوجوان کی طرح اب کھڑے ہو جاؤ اور خوش دلی سے مجھے رخصت کرو۔ اپنے بارے میں میری رائے بدلنے کا کچھ مجھے مت دو۔“

یہ کہتے ہی میرا بازو تمام کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے بھی اپنے بوجھل جسم کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ ابھی وہ کمرے میں تھا کہ دروازے پر اسپتال کے مخصوص لباس میں دہلا پٹا ایک آدمی دکھائی دیا۔ ڈاکٹر رائے کو دیکھ کے وہ پلیٹ جانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی کڑکٹی آواز پر ٹھٹھک کے رک گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس ایکی نے تیز قدموں سے آگے جا کے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اس نے کان پھوسی کے انداز میں ایکی کو جانے کیا بتایا کہ ایکی جزیرہ نظر آنے لگی۔ اس دوران ڈاکٹر رائے، اس کا ساتھی اور میں دروازے پر پہنچ گئے۔

”کیا ہے؟“ ڈاکٹر نے رکھائی سے پوچھا۔

”جناب! یہ کہتا ہے، باہر صاحب سے ملنے دو پولیس والے آئے ہیں۔“ ایکی نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”کیا؟“ ڈاکٹر قریباً چیخ کر بولا۔ ”پولیس!“ دوسرے لمحے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی من لیا تھا۔ ایکی نے میرا نام ہی لیا تھا۔ میں تو دم بہ خود ہو گیا تھا۔ ”تمہارے لیے پولیس؟“ ڈاکٹر وحشت آمیز حیرانی سے بولا۔ ”کیوں، کس وجہ

سے؟ یہ کیا معاملہ ہے۔“ میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس کے سوا مجھے کوئی جواب نہیں سوچا۔

”کیا بولتے ہیں وہ لوگ؟“ ڈاکٹر رائے نے ہندوستانی میں براہ راست قاصد سے پوچھا۔

”وہ سب سے ملنا چاہتے ہیں جناب۔“ قاصد میا کے بولا۔

”کس واسطے، کیوں؟“ ڈاکٹر برقعہ لگی سے بولا۔

”اپنے کو بچیں مالوم جناب۔“ قاصد حواس باختہ ہونے لگا۔ ”وہ لوگ کچھ نہیں بولے۔“

”ٹھک ہے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ جاپیے، میں ان سے مل لیتا ہوں۔“

”مگر وہ، وہ کیوں آئے ہیں یہاں؟“ ڈاکٹر کی فکر و تشویش میرے بے پروایانہ لہجے سے بھی کم نہ ہوئی۔ ”یہ اسپتال ہے۔“ وہ پھر کے بولا۔

”کوئی بات ہی ہوئی۔“ میں نے غلی آواز میں کہا۔ ”میں دیکھ لیتا ہوں۔“

ڈاکٹر رائے جرات و اضطراب کے عالم میں کھڑا میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں شانے اچکائے۔ ”مناسب ہے، تم دیکھو ان کو۔“ وہ ٹھہر کے بولا۔ ”اور سنو! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھ سے مت چھپاؤ۔“

”میں کچھ نہیں چھپاؤں گا آپ سے، مجھ پر بھروسہ رکھیے۔ آپ اطمینان سے گھر جاپیے۔“ میں نے بہ ظاہر اعتقاد سے کہا۔

میری حالت عجیب تھی۔ ڈاکٹر رائے کے سامنے قاصد آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا، میری کوئی چوری بکڑی گئی ہے۔ میں ڈاکٹر کے سامنے بے لباس ہو گیا ہوں۔ میں اسے تفصیل کیا بتاتا، میری کوئی غلطی، میرا کوئی تصور نہیں ہے۔ صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف اسے دلاسا دینے کا

فریضہ انجام دینا تھا، دوسری طرف پولیس والے میرے منتظر تھے۔ پولیس کی آمد کا سبب ایک ہی ہو سکتا تھا۔ جس خدشے کا اظہار اکبر علی خاں نے کیا تھا، وہی ہوا۔

”کدھر ہیں وہ لوگ؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

قاصد نے اسے بتایا کہ مرکزی عمارت کے ملاقاتی کمرے میں پولیس والوں کو بٹھا دیا گیا ہے۔ وہ سادہ لباس میں آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے حکم دیا کہ انہیں کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔ کمرے سے باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوا دی جائیں۔

ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھہرا۔ اس نے شب بخیر کہا نہ میں نے۔ وہ تو کم سا ہو گیا تھا۔ جانے کیسے کیسے شکوک اس کے دل و دماغ میں گھر گھر کرنے لگے ہوں گے۔ میں نے بھی گریز کیا کہ اس صورت حال میں شب بخیر کی رسم ادائیگی بڑی بے عمل معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد کمرے میں آ کے میں نے ایک بار پھر نخل پر نظر ڈالی۔ اسے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ نرس ایکی بھی کھوئی کھوئی، سبھی سبھی نظر آتی تھی۔ بار بار اچھی نگاہوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ پولیس ہیٹ و دہشت کی علامت ہے۔ آتنا سامنا ہو جائے لوگ تو فرار کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، نرس ایکی یہ نہ سوچ رہی ہو کہ میں بھی کچھ بیک کروں گا۔ میں نے مسلسل خانے

جا کے منہ دھو یا۔ بال درست کیے، لباس کی ٹکلیں دور کیں اور خود کو استوار کیا۔ اب جو کچھ بھی ہو۔ تمام بدترین نتائج ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔ پولیس دروازے پر کھڑی ہے اور میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اکبر علی خاں آیا ہی چاہتے ہوں گے۔ دیر ہوئی ہے مگر وہ آئیں گے ضرور۔ میں ان کی بات مان لیتا تو آرجنٹ ٹاربا تک ٹکٹے بیچ چکا ہوتا۔ میں نے نرس ایکی سے کاغذ اور قلم فراہم کرنے کی درخواست

کی۔ اس کے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ میں نے ٹکٹے کے اڈے کا پتا اور پیغام لکھا اور ایکی کو تاکید کی میری عدم موجودگی میں اکبر علی خاں نامی ایک صاحب آئیں تو یہ تعداد ان کے حوالے کر دیا جائے۔ پیغام مختصر تھا کہ تار ملتے ہی پہلی گاڑی سے وہ چل پڑیں۔ پہلے میں نے اسپتال کا پتا لکھا تھا، پھر اسے کاٹ کے ہونٹ کا نام لکھ دیا۔ اسپتال کا پتا دیکھ کے وہ سارے گھبرا اٹھے۔ سفر کرنے نہیں کتنا تار کے اخراجات کے پیسوں کے لیے میرا ہاتھ جیب میں گیا تھا لیکن اکبر علی خاں کے شیشہ احساس کے خیال سے میں رک گیا۔

”ان لوگوں کے ساتھ تمہیں بھی جانا ہے؟“

ایکی نے آزدگی سے پوچھا۔

”کیا کہا جا سکتا ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور پوچھتی یا کہتی کہ پولیس کی آمد کی اطلاع دینے والا قاصد دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے کچھ بتانے سے پہلے میں نے دروازے کا رخ کیا۔ کمرے کے آگے چوڑی راہ داری تھی۔ اس کے پار جھوٹے سے قلعے پر گھبراہٹ بکھا ہوا تھا۔ کنارے کنارے پھولاری تکی ہوئی اور قاصدے فاصلے پر پستہ قد درخت ایستادہ تھے۔ راہ داری میں چلتے

تمغوں کی روشنی کسی حد تک سبزہ زار بھی روشن کر رہی تھی ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ سکوت، سکون نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں تلاطم برپا تھا۔ سامنے سبزے کے بیچ میں بید کی کرسیوں پر دونوں پولیس والے سر جوڑے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ ملے کر کے میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں

ایک کی عمر چالیس، پینتالیس، دوسرے کی تیس تیس کے درمیان ہوئی۔ کوت چلون پہنے ادھیڑ آدمی کا قد درمیانہ، صاف کسی قدر فربہ تھا۔ مونچھیں ہلکی ہلکی تھیں، رنگت سالونی اور کپڑوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔ کرتے پاچاسے میں پولیس نو جوان آدمی کا

جسم چھرا، قد کھنپا ہوا تھا۔ رنگت اس کی بھی سالونی تھی۔ وضع قطع سے دونوں پولیس والے ہی لگتے تھے۔ مجھے سامنے دیکھ کے دونوں کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں تک نظروں نظروں میں مجھے ٹوٹے رہے۔ میں بھی اس اثنا میں ان کا اندازہ کرتا رہا۔

”کیا بات ہے؟“ سلام کرنے کے بجائے اور ان کے کچھ بولنے سے پہلے میں نے اچھٹی آواز میں پوچھا۔

”آپ ہی ہو، ادھر میدا کے ٹھکانے پر جانے والے؟“ نو جوان شخص تیزی سے بولا۔

میں نے سر ہلا کے اقرار کیا۔

”آپ کا نام؟“ لگتا تھا، اپنے لہجے کے تعین میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔

”کام بتائیں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

دونوں نے بے تابانہ ایک دوسرے کو دیکھا۔

ادھیڑ آدمی کا منہ میڑھا ہوا۔ ”کام بھی بتا دیں گے۔“

”کون ہو آپ؟“ تھوڑا اپنے بارے میں بتاؤ۔“

میں نے اپنی آواز اتوارن ہی رہی۔

”کوٹوالی سے آوے ہیں۔ یہ انسپکٹر شری دھن راج جی ہیں۔ ہر نام رام پر سادہ ہے، سب انسپکٹر رام پر سادہ۔“ نو جوان نے ہنستی سے جواب دیا۔

اس چنستی میں مناسب کا کلمہ و تقاضا نمایاں تھا۔

”پولیس والے ہو آپ؟“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

”وہ اسپتال کا کیور کچھ نا ہیں پولس؟“ ادھیڑ شخص نے تکی ہوئی آواز میں کہا۔

”بولا تھا کچھ ایسا، پر آپ وردی بنا آئے ہو۔“ اپنے پیمان کی پردہ پوشی کے لیے مجھے اپنا لہجہ ٹھیرا ہوا اور دھیمائی رکھنا چاہتے تھا۔

”ہم سے کو اسپتال کا دھیان تھا۔“ نو جوان نے بیگلت عذر خواہی کی۔

نو جوان بولا۔

”کیسی جان کاری؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”میدا کا آدمی دھنوا کا کھون کے بارے میں۔“ نو جوان ادھر ادھر دیکھ کے بولا۔

”پر ہم کیسے جانیں، آپ پولیس ہی کے آدمی ہو؟“ میں نے کسمسا کے کہا۔

”کا۔۔۔۔۔ کا مطلب؟“ نو جوان چڑسا گیا۔

”پہچان بنا ہم آپ لوگ سے کیا بات کریں۔ اپنے کو کیا معلوم، آپ۔۔۔۔۔“

”اچ چھا، اچ چھا۔“ ادھیڑ آدمی میری بات کاٹ کے بولا۔ ”ٹھیک ہی پولیس ہیں۔ پہچان کروائے دوا پنی۔“

نو جوان نے کرتے کی جیب سے گتے کا شکستہ دوسیدہ کارڈ نکالا۔ ادھیڑ شخص نے بھی اٹکاتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے کارڈ نکال کے

نو جوان کی طرف بڑھا دیا۔ نو جوان نے دونوں پہچان نامے میرے آگے کر دیے۔ میں نے انہیں ہاتھ میں لیے بغیر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

کم از کم ایک طرف سے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جانے یا گرفتار کرنے نہیں آئے ہیں۔ اس کا اندازہ تو شروع ہی میں ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ سیدھے وارنٹ دکھاتے اور اپنے اصلی لب دلچہ میں مخاطب ہوتے لیکن وہ میری جستجو میں اسپتال آئے تھے اور اپنی آمد کے سبب کا اشارہ نو جوان پولیس والے نے کر بھی دیا تھا۔ ابھی کچھ نہیں کہا

جا سکتا تھا کہ دھنوا کے خون کے بارے میں انہیں کس قسم کی معلومات مطلوب ہیں۔ ایسی صورت میں اختصار ایک مجرب تدبیر ہے۔ یوں بھی، کہتے ہیں کہ کم گوئی میں بہت حفظ و امان ہے۔ دھند صاف ہو جانے تک مجھے بہت محتاط رہنا تھا۔ طول کلامی میں زبان بیک سکتی اور انہیں کسی اور طرف سوچنے پر مائل کر سکتی تھی۔ میں نے جو وہ ایک بات کہہ دینی

جہان سے سننا چاہیں ہیں، ہم کو بولو، کا ہوا تھا ادھر؟

”ہم نے ملے کیا تھا کہ اب کسی سے بات نہیں کریں گے۔ ایسا دینا کچھ ہوا تو سیدھے کچھری جا کے زبان کھولیں گے۔“ میں نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر آپ ادھر آئے ہو تو ٹھیک ہے۔ ہم بتاتے ہیں۔“

میں نے گاڑی میں ٹھل کو بھڑکا گئے، سڑمٹوئی کر کے پٹنا اترنے، اسپتال آنے، صبح ڈاک خانے جانے اور وہاں پیش آنے والا واقعہ مختصر اُٹایا۔ میں نے کہا کہ اسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ پولیس کے چکر میں بڑے جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے بات کی جائے۔ یہ معلوم تو ہو ہی چکا تھا کہ میدا کو کون سی زبان آتی ہے۔ کوئی منت کرنے کے بجائے میں نے اس سے چوکی سے اتر جانے کو کہا۔ اس کے چوکی سے اتر جانے پر بھی کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جاتا۔ میں نے پھر اسی کی زبان میں بات کی۔

”بعد کا سارا ہم جابیں ہیں۔ اپنے دو چار آدمی بھی ادھر میدا کے ٹھکانے پر رہتے ہیں۔“ ادھیڑ پولیس انسپکٹر گردن میڑھی کر کے بولا۔

”پھر ہمارا کیا بولنا.....“ میں نے کہا۔ ”ابھی جا کو بدلی میں بات نہ کی۔ ٹھیک ہے پر کل تا ہیں تو برسوں، دس پندرہ دن بعد.....“ میں نے ادھیڑ آدمی کی بات مکمل کی۔ ”اس کے پاس جاتا ہے۔“

”جانا ہے۔“ نو جوان کی بے قراری دیدنی تھی۔ ”اپنا چاقو اس کے پاس ہے، واپس تو لینا ہے اسے۔“ میری آواز میں ذرا سی پیش نہیں تھی۔ ”آپ..... آپ.....“ نو جوان نہ جانے کیا پوچھنا چاہتا تھا کہ منسٹر جو گیا مل کھا کے بولا۔ ”وہ بھونکی کا بہت جمانے سے ادھر راج کرت ہے۔“

ایک نمبر کا چاقو باج ہے۔“ ”دیکھ میں گئے۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہتھیار بیچ میں آتا ہے تو کسی ایک کو زمین دیکھنی پڑتی ہے۔“ ”نمبر کا آپ اس کے ٹھکانے پر بیٹھنا چاہیں ہیں؟“

”اپنے کو اس کے ٹھکانے، چوکی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں اس شہر میں نہیں ملنا، ہم نے اسے بھی صاف بول دیا تھا۔ ہم نے کہا، اپنے کو آگے جانا ہے۔ پٹنا تو ہم بھائی کی وجہ سے آگے گئے۔ اس نے ہماری بات مان لی۔ مگر کے لوگوں نے سارا دیکھا بھالا تھا، انہوں نے بھی کچھ بتایا ہوگا اس کو۔“

میری سادہ بیانی پردہ اور مضطرب ہوئے۔ ادھیڑ آدمی نے پھر وہ سوال کیا جو اس کے سر میں ٹکا بنا ہوا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ دیوڑا میدا سے مہارنٹ کا دعوا میں نے کسی عزم، کسی مل بوتے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے اپنی زبان سے پوچھا کہ نتیجہ مختلف نکلا، میں میدا پر قابو نہ پاسکا تو.....! مجھے بھی بڑھ چڑھ کے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہ امکان تسلیم کیا تو دونوں بے مزہ اور بے آرام ہوئے اور جلد ہی انہیں قرار آ گیا۔ انہوں نے میرے سکون سے شاید وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں اپنی زبان سے کہتے ہوئے جھجکا رہا تھا۔ پھر انہیں انجام سے غرض بھی کیا تھی۔ انجام کچھ بھی ہو، ان کا کون سا زیاں تھا لیکن ان کے کچھ کہے بغیر اتنا تو نظر آنے لگا تھا کہ نہ تو میدا کے فرستادہ ہیں، نہ اس سے کوئی ہم دردی رکھتے ہیں۔ البتہ اس کی ہریمیت کے مشتاق ہیں اور میرے پاس ان کی آمد کا ایک مقصد مجھے دیکھنا، میرے عزم و ارادہ کا اندازہ کرنا ہے۔

”بہت جلدی چڑھ گئی تھی اس صبح کو۔“ اگست ہے، او جان کس، اب اس کا وکھت کھتم ہو چکا ہے۔“ نو جوان نے مجھے ہمیز کرنے کے لیے کہا۔ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ میں چپ رہا۔

”میرے اپنے کو کوئی بھروسہ نا ہیں اس پر، اچھی طرح جانیں ہیں ہم اس کو۔“ وکھت نا ہیں دیو، اس راتوں نے سے لیو۔ من میں اس کے کسی اور پر کارگزار پکڑن کا بھی ہو سکے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نا ہیں؟“ نو جوان نے بڑبڑاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اے ہی تو ہم پولیس ہیں۔“ ادھیڑ آدمی اٹھ کے بولا۔ ”آپ کو پھر بہت کھیل کے رہنا ہووے گا۔ اس کے پالتو جتاو شہر میں ڈکراتے پھریں ہیں۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں ہمیں تو سب سے پہلے اپنے بھائی کی فکر ہے۔“ ”اسی کارن ہم ادھر آئے ہیں، آپ کو دیکھنے بھی..... اور اپنی کوئی مدد، سہایتا کی ضرورت ہو تو بھی.....“

میں نے پھر ان کا شکر یہ ادا کیا۔ ”تا ہیں نا ہیں۔“ نو جوان نے جو شیلے انداز میں اصرار کیا۔ ”کوئی بات، کوئی اپا نے من میں ہو تو آپ بولیں۔“

”کیا پولیس، آپ خود ہی سارا دیکھ چکے ہیں۔“ ”او بد ماس سپر کا سب سے بڑا حرا می ہے۔“

پھر ہم کیا کریں، آپ ہی مشورہ دیں۔“ ”اب ہم آگے ہیں نا۔“ نو جوان پولیس افسر نے شکرگزاری کے انداز میں کہا۔ ”پر دیکھیں صاحب! ایک آدمی کا کھون ہو گیا ہے۔ بہت بڑی بات ہے ای، چھوٹی موتی نا ہیں۔ لاگت ہے، امید ادا کا باج پہلے آپ کو اس پتھر میں پھنساوے گا۔ ٹھیک ہے، مگر کے لوگ سارا کچھ دیکھے ہیں، پر ان کا کاجھروسا، ادو سسرے مٹی کے مادھو ہیں۔ بے ہندے کے لوٹے۔ میدا سے دشمنانی کا ہے مول میں گئے۔ ہم کو پتا ہے، آپ اپنا چاقو نا ہیں لٹا لے تھے۔ دھوا کو اس کے مٹی سا بھی کا چاقو کھیا

ہے۔ اور ادھر سارے نہیں، تو پولیس کے بھی کچھ دلال لوگ میدا کا نمک کھا دیں اور سسرے سر ملا دیں ہیں۔ ٹھکانے سے ملیدہ ماہن آوے ہے برابر۔ پکا تال سیل بنا ہے دونوں میں۔ ادھیڑ اڑچن ڈال نہیں ہیں..... پر آپ..... آپ سہانت رہو، ہم سوچیں ہیں آگے کا۔“

ہم دردی کی وجہ میری سمجھ میں دیر سے آئی اور مجھے اپنی دیرہمی پر غصہ بھی آیا۔ اس مہربانی کی وجہ میدا سے عداوت، پیشہ وارانہ فرض شناسی اور دور اندیشی نہیں تھی بلکہ وہ دونوں کچھ زیادہ ہی پولیس والے تھے۔

مجھے ان کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیے تھا۔ نو جوان کا لہجہ اب خاصا مفاہمانہ ہو گیا تھا، اشتیاق سے بولا۔ ”آپ لوگ، مطلب ہے، آپ کے بھائی اور آپ کا کریں ہیں؟“

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد شہر کے علاقے میں تھوڑی بہت زمینیں ہیں۔

”زمین دار ہیں آپ؟ ادو لاگت ہی تھا اپنے کو۔“ نو جوان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

شہر کے سب سے بڑے اسپتال اور اسپتال کے سب سے مہنگے کمرے میں علاج و معالجے کا حوصلہ کوئی اقبال مند شخص ہی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، انہیں شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ہمارے قیام کا بھی علم ہو۔ وہ پولیس والے تھے۔ زس، ڈاکٹر، مجھے ڈاک خانے لے جانے والا تاکا، ہوٹل کا منیجر اور عملے تک ان کی رسائی مشکل نہ تھی۔ میدا کے اڈے، مٹی کے لوگوں اور راہ کیروں سے ایک پہر کے غرے میں انہوں نے اس قدر معلومات حاصل کر لی لی تھیں۔ وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔

”اپنی کوشش ہووے گی، آپ ان کٹ کہنا لو گن، ان جو جنم سے دور دور ہیں۔ ادھر بھائی کی دیکھ بھال میں کوئی کھوٹ نہ پڑے۔“ ”آپ کی مہربانی۔“ میں اور کیا کہنا۔

میں نے کہا جانا کہ صرف دونوں کی بات ہے۔
 ٹھل اور میری پریشانی حال کے لیے اسے لوگ
 اکٹھے ہو سکتے ہیں کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں
 نے ان سے نہیں کہا کہ وہ غلط جگہ آگئے ہیں، یہاں
 سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ان کے گریبان پر
 ہاتھ ڈالے، ان کی خدمت کرنے کو بہت جی کرنا تھا
 لیکن یہی بہتر تھا کہ ان کے فرمودات جوں کے توں
 قبول کر لیے جائیں۔ انہوں نے بہر حال ایک
 اعانت ضرور کی تھی، ایک ایسے گوشے کی طرف
 انہوں نے اشارہ کیا تھا جو مجھ کو اس باخند سے اوچھل
 رہا تھا۔ میدان اور اس کا سر پرست بر جو اپنی عطا کی گئی
 مہلت میں میرا قصہ ہی پاک کر دینے کی کوشش
 کیوں نہیں کریں گے؟ میدان اور بر جو ایک زمانے
 سے اڈا چلا رہے ہیں۔ ٹھل کے بقول جاتو اور
 بازو کے زور کے ساتھ اڈا گیری میں دماغ کے زور
 کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ان بھی اڈے کی چوکی
 سے چپے رہنے والوں کو میری موجودگی میں اپنا راج
 پات تمام ہو جانے کا خدشہ بجا طور پر لاحق ہونا
 چاہیے۔ اڈے کا استاد ہی نہیں، چوکی سے ہٹ
 جانے پر اس کے نفس ناظمہ، حاشیہ بردار بھی متاثر
 ہوتے ہیں۔ ان کی عزت و حریت، ان کی بقا
 خطرے میں ہے۔ میں نہیں رہوں گا تو سب کچھ
 یوں ہی قائم رہے گا۔ ادھر اڈے کے بہت سے
 لوگوں کے سینوں پر ایسے ہم نشیں دھواں کی جواں
 مرغی کا بار ہے۔ دیوانگی کا پورا جواز ہے، عذر بھی
 بہت معقول ہے کہ دھواں کا کوئی نڈائی، ایک سرکش
 بے لگام ہو گیا تھا۔ یہ شیران کا، پولیس کی پشت پناہی
 انہیں حاصل ہے۔ اتنی جلدی اور تیزی مشکوک
 ہو سکتی ہے۔ سو میری ناہودی کے فیصلے میں انہیں کچھ
 عمل کرنا چاہیے لیکن کیا عجب، دماغ میں کچھ بھی سا
 جائے..... اور یہ اسپتال کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی بھی کسی
 وقت میرے سر پہ آدھک سکتا ہے۔ سامنے سے نہیں
 تو عقب سے آسکتا ہے۔ بے وضعی پھیری تو کیا جائز

دنا جائز۔ حاصل یہ کہ مجھے تو اب اپنے سائے سے
 بھی فائدہ پہنچا ہے۔
 ”آپ سمجھ رہے ہیں نا؟“ مجھے غم دیکھ کے
 نوجوان افسر نے ٹوکا۔
 ”جی، جی ہاں۔“ میں نے سانس لے کے
 کہا۔ ”ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے۔“
 ”کچھ ناہیں ہووے۔ جھگڑا کرے، سارا
 ٹھیک ہی رہے، پر اپنے کو تو آگے پیچھے کا دھیان
 رکھنا ہے۔“ نوجوان نے مجھے تلقین کی۔
 ”پولیس بازو کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ کانٹا آپ
 مانگ سکتیں ہیں پر نٹو کا پتا، پولیس کا، کوئی بکا و آدی
 ہوا۔“ اڈیٹر پولیس افسر نے اپنا ایشیہ جاری رکھا۔
 میں نے کہا جانا کہ دو اتو میری طرف سے بھی
 کیا جاسکتا ہے۔ کل صبح عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹایا
 جاسکتا ہے۔ شہر میں ایک اجنبی جس کے ساتھ چار
 بھائی تھا، کبھی کبھی زیادتیوں کا ہدف بن رہا۔ اس کی
 جمع ہوئی جھینٹی گئی۔ مزاحمت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔
 دھواں کو جاتو نہیں لگتا تو اجنبی نشانے پر تھا۔
 انہوں نے اس کے لیے شہر کے راستے تنگ کر دیے
 اور اب وہ اسے ختم کر دینے کے درپے ہیں کہ اس
 نے شہر کے اڈے کے استاد کو اس کی چوکی سے بے
 دخل کر دینے کی جرات کی تھی۔ گواہ موجود ہیں، ایک
 نہیں، بہت سے۔ روپے سے کیے کی بات ہے تو سچ
 بولنے کے لیے انہیں خریدا جاسکتا ہے۔ آج کل سچ
 بھی خریدا جاتا ہے۔
 ایسے ایسے بے سرد یا خیال میرے سر میں
 منڈا رہے تھے۔ اچھا ہوا جو میں نے اپنی زبان بند
 رکھی ورنہ وہ میرے متعلق کیا سوچتے۔ عدالت، اس
 کے سرطلے، الزامات، صفائیاں، پیشیوں پر
 پیشیاں۔ ہمیں کون سا یہاں غصہ رہتا ہے۔ کچھ
 عرصے کے لیے عدالت کی طرف سے پولیس کا
 حفاظتی دستہ تعینات ہو جائے گا اور تاریخیں پڑتی
 رہیں گی۔ سچ کا اپنا زور و اثر کس قدر، عدالت، میں

اسے ثابت کرنا پڑتا ہے اور آدمی کی عمر صرف ہو جاتی
 ہے۔ یہ عدالت کی بات جانے کیسے میرے دماغ
 میں آگئی۔ آدمی کے پاس دماغ ہونے سے مراد یہ
 نہیں کہ دماغ ہر وقت اس کا ساتھ دے رہا ہے۔
 کہتے ہیں، دو خونیاں آدمی کو جانور سے میز کرتی
 ہیں۔ بولنے اور سوچنے کی قوت یا صلاحیت مگر
 دونوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دونوں کتنا اور کہاں تک
 آدمی کا ساتھ دیتی ہیں۔ زبان بہک جاتی ہے دماغ
 بہک جاتا ہے۔ دونوں آدمی کا ساتھ دیتے تو دنیا ہی
 بدلی ہوئی۔ آدمی کے یہ دونوں اوصاف تو بہت خام
 اور ناتمام ہیں۔
 ”آپ بولو تو اسپتال اور آس پاس سمجھ
 کیڑواں میں آدمی پھیلا دے دیں؟ اولوگ میدان کا
 سب آدمی کو جانت ہیں۔ تھوڑا کھرچا پانی ہووے گا
 پر کام پکو ہو جاوے گا۔“ نوجوان کو حرف مطلب
 زبان پر لانے میں اتنی دیر لگ گئی۔
 مجھے کوئی اچھا نہیں ہوا اور شاید جو مجھے کہنا
 چاہئے تھا، میں نے وہی کہا کہ جو بہتر سمجھیں، کریں۔
 میرے اس خسروانہ عنڈیے سے ان کے
 چہروں پر سکون و مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔
 دولت کا عجب کرشمہ ہے۔ آدمی کو آدمی کا اسیر کر دیتی
 ہے۔ پاس ہو تو گردیدگی میں کی نہیں آتی، پاس نہ
 ہو تو دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ جلوہ گری کی تو بات ہی
 اور ہے، ذکر ہی اس کا مسکور کن ہوتا ہے، جس پر لٹاؤ،
 اس کا تو عالم ہی کیا، جس سے ہاتھ پیچھے رکھو، وہ ایک
 نظر عطا، لطف و عنایت کی ایک نظر کے آسرے میں
 زندگی گزار دیتا ہے یا گنوا دیتا ہے۔ کوئی اور وقت
 ہوتا تو میں پولیس افسروں کو ٹھانچے مارا اور
 دھکے دے کے باہر نکال دیتا لیکن میرے پاس پیسا
 تھا، انہیں اس کی ہوس تھی۔ وہ میری ضرورت تھے،
 میں ان کی ضرورت تھا۔ وہ کئی دولت کے طلب گار
 ہوں گے۔ مسائل کا ظرف بھی تو کشادہ ہونا چاہیے،
 اور یہ تو ٹھل کا معاملہ ہے۔ مسائل کا ہر ظرف چھوٹا

پڑتا۔

بہت دیر سے نرس ایکی خاصی فکر مند نظر آ رہی
 تھی۔ پولیس سے بڑے بڑے رستم پناہ مانگتے ہیں۔
 وہ تو ایک عورت تھی۔ بار بار کمرے سے باہر آکے وہ
 نہیں دیکھ جاتی۔ اس بار وہ مجھے دکھائی دی تو میں
 نے آواز دے کے اسے روک لیا۔ وہ منتظر ہی تھی۔
 چلتی ہوئی ہمارے قریب آگئی۔ میں نے اس سے
 درخواست کی کہ مہمانوں کی خاطر تو واضح کچھ انتظام
 ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا
 تھا، اس لیے کہ اب تک وہ مجھ سے اسی زبان میں ہم
 کلام رہی تھی۔ اس نے مودبانہ انداز میں سر جھکا یا
 اور راہ داری میں بائیں طرف چلتی ہوئی نظروں
 سے دور ہو گئی۔
 گوروں کی زبان بھی ان کی طرح دولت
 و شمت، طاقت و عظمت کی علامت ہے، اسے
 بولتے ہوئے آدمی زیادہ دانا دیتا، اعتبار کے لائق
 معلوم ہوتا ہے۔ کچھ شدید میرے سامنے موجود
 پولیس افسروں کو بھی تھی۔ ”ای کا، کاجروت ہے۔
 اپنے کو پتا ہے، ای اسپتال ہے، کھاتو تو اجو کی جگہ
 ناہیں۔“ نوجوان نے چلتی آواز میں کہا۔ اس کے
 بزرگ ساتھی نے بھی ہم نوا لی کی۔
 ”ان کمروں میں انہوں نے مہمانوں کے لیے
 ایسا کچھ انتظام کیا ہے۔“ میں نے اس کے احترام کی
 روش ترک نہیں کی۔
 ”ای کمروں کا، کابات ہے گورالوگ بھی ادھر
 آکے ٹھہرت ہیں۔“ نوجوان چلتی پٹ پٹا کے
 بولا۔ دونوں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔
 خوشامد ہر ایک کو مرغوب ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی
 وضع و صورت میں قبول کی جاتی ہے۔ آدمی کیا
 کرے، تعریف و توصیف کرنے والے کو
 دھتکار دے کہ وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے۔ اپنا
 عرفان، مدد و کسب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ یہ
 بھی کہتے ہیں کہ اسی کو سب سے کم ہوتا ہے۔ اس

نہیں کیا تو میں نے پوچھا۔ ”کس فکر میں پڑ گئے آپ؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ مبتدئہ لہجہ میں بولے۔

”سوچ رہا ہوں، بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک بات انہوں نے بھی غلط نہیں کہی۔ میدا یا اس کے آدمی اس مہلت میں..... وہ کہتے کہتے رک گئے۔“

”وہ مجھے دوبارہ اڈے پر جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑیں گے۔ یہی تا؟“

”یہ خیال میرے دماغ میں بھی آیا تھا لیکن ایسی جگہوں اور ان لوگوں کے رسم و رواج پر آپ کا یقین دیکھ کر، میں چپ رہا۔“

”ایسا کہیں ہوتا نہیں ہے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اور مجھے تو اب بھی شبہ ہے۔“

”یعنی اب تک آپ کو..... وہ رنجیدہ ہونے لگے۔ ”مگر مجھے ان لوگوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ صاف بات ہے۔ آپ مانیں نہ مانیں۔ وہ میدا کا دست راست بر جو بہت گھاک اور کابیاں شخص ہے۔ اس نے مہلت لی ہے، وہی نہیں ہے اور جیسا کہ آپ کا اعتماد تھا، اسے اپنے پروردہ کا انجام نظر آگیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ مہلت بڑی غیرت محسوس ہو رہی تھی لیکن اب..... ان سے کچھ بعید نہیں ہے مہیاں۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا کہوں۔ دماغ کام نہیں کر رہا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے، وہ پولیس والے ٹھیک کہہ رہے تھے، آپ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔“ اکبر علی خاں بہت گھبرا گئے تھے۔ ان کی پریشانی کم کرنے کے لیے میں نے ہلکی آواز میں کہا لیکن یہ تسلی بڑی مصنوعی تھی۔

”اب تو مجھے اپنا یہ شک بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو کہیں میدا ہی نے نہ بھیجا ہو۔ وہ یہ جانا چاہتا ہوگا کہ اس کے ٹھکانے سے جانے کے

بعد اب آپ کے ارادے کیا ہیں۔“

”ایسی صورت میں تو کچھ بھی ممکن ہے۔“

”انہوں نے آپ سے آپ کے ارادوں کے بارے میں کچھ پوچھا تھا؟“

”ہاں ہاں، پوچھا تو تھا کچھ ایسا۔“

”اور آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے وہی کہا جو میرا ارادہ ہے کہ مجھے اپنا چا تو واپس لینے میدا کے اڈے پر جانا ہے۔“

”اوہ!“ انہوں نے شدت سے آنکھیں بھیجنے لیں، ماتھے پر ٹکٹوں کا جال پڑ گیا۔ ”معاف کیجیے، کیا ضرورت تھی آپ کو یہ کہنے کی۔“

”ہاں، مجھے شاید اپنا اعزاز اپنے آپ تک ہی رکھنا چاہیے تھا۔“ میں نے نفرت سے کہا۔

”اس کے بعد وہ کیا بولے؟“ انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

”انہوں نے میرا ارادہ اور مہیز کیا اس وقت میں نے جانا کہ وہ میدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں۔ انہوں نے میدا کو بہت برا بھلا کہا۔ مغلطات سنا میں۔“

”وہ خاموش ہو گئے، میں بھی۔“

”شہنم گرتی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن سبزہ نم ہو گیا تھا۔ بہت دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ نرس ایکی نے باہر آکے ہمیں چونکا دیا۔ وہ کھانے کے لیے پوچھ رہی تھی۔ اکبر علی خاں ایک دم کھڑے ہو گئے۔

”میں تو بھول ہی گیا۔“ وہ پینینائی سے بولے۔

”کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔“

”ہم کمرے میں چلے آئے اور ٹھنڈے کوا ایک نظر دیکھ کے پھر باہر آ گئے۔ ایکی کا مشورہ تھا، دیکھی کھانوں کی خوشبو۔ کمرے میں ریج بس جاتی۔ ایکی نے کینٹین کے ملازم سے رکابیاں منگوائیں۔ اکبر علی خاں کے ساتھ آنے والے لڑکے نے بھی اس کی مدد کی۔ کھانا ابھی نیم گرم تھا۔ وہ کوئی پانچ آدھ گھنٹوں کا کھانا لے آئے تھے۔ جھوک نہ ہو تو اشتہا انگیز خوشبو بھی

ان لوگوں کے لئے جو خوبصورت کتابیں پڑھنے کے شوقین ہیں

ہزاروں دلوں کی دھڑکن

محی الدین نواب

کے قلم سے

آپ کی اس (مناظرے) کی (کتابیں)

ایمان کا سفر

قیمت - 150 روپے

ڈاکے - 25 روپے

دو ماہ قبل ان کو آپ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ان کی تلاش تھی

ایمان کا سفر - شریا کیب سافٹوئیر کے محلات رانا پور، راولپنڈی۔ اس کے رازدار مسدودیت کا قتل کی آواز سن کر مارا کر رہا ہے۔

چور رشت - ہری مندر کی اس دلکش شہر کا نام کی گلیاں میں ایک چور کی اس قلب کے چور والے سے ایک چور کی اس دلکش شہر کا نام کی گلیاں میں ایک چور کی اس قلب کے چور والے سے۔

سداسا گن - عین اسٹارٹ کر دیتی تھی۔ میں نے احمد گارڈ چور۔ راجیو راہو تھا۔ ایک مندر کی اس دلکش شہر کا نام کی گلیاں میں ایک چور کی اس قلب کے چور والے سے۔

میٹھا زہر - جاباب کی خود کشی کی کہانی، اس کا اختتام نہایت ہی جگہ ہے اور وہ ناگوار لڑائی ہے۔

آئینہ خانہ - ہم ان کا کیا کہنے آئے تھے میں نے اسے جس میں میں میں اپنے گھر کے لڑکے پر ملوث تھا ہے جو ایک تاریکی میں رہتا تھا۔

آؤں کا باپ - دو ماہ قبل ان کو آپ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ان کی تلاش تھی

یشو کے سچا - ایک ہزاروں کی کہانی ہے جو شہر کے ایک نوجوان ہیں۔ ہر ماہ چھ ماہ اس بار سے جوئے پر کھانا ہو جاتے ہیں۔

جئے کی چاندنی - ایک کہانی ہے کہ اس کی کہانی ہے آپ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ان کی تلاش تھی

مناظرے - ایک کہانی ہے کہ اس کی کہانی ہے آپ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ان کی تلاش تھی

کلی کا کفن - ایک کہانی ہے کہ اس کی کہانی ہے آپ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ان کی تلاش تھی

دیکھ کر یہ منی آرٹسٹ پر شکیروانہ ہو گئی

کتابیات پبلی کیشنز

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

کراچی 74200

kitabiat1970@yahoo.com

پہلے بھکی گئی ہے۔ اکبر علی خاں کی وجہ سے میں نے ساتھ دیا۔ کھانا خاصا لذیذ تھا مکمل لذت بھی تو نشا را خاطر سے شروہ ہے۔ میں لٹے نوٹنگن رہا۔ اکبر علی خاں بھی رسم نبھایا کیے۔ کھانے کے دوران انہیں خیال آیا۔ ”کچھ پیش بندی تو کرنی ہوگی۔“ ”دوبی صورتیں ہیں۔“ میں نے ٹھنی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایک تو یہ صاحب، کسی طرح جلد سے جلد ٹھیک ہو جائیں۔“ میرا اشارہ بھل کی طرف تھا۔

”خدا کرے، آپ کی زبان مبارک ثابت ہو۔“ اکبر علی خاں تڑپ سے گئے۔ ایسی تڑپ جو کسی اپنے ہی میں ممکن ہے۔ ”اور دوسری صورت؟“ انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔ ”دوسری یہی رہ جاتی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں تار دے دیں۔“

لفظ ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ”ہاں ہاں، بے شک۔ یہ بھی ایک صورت ہے، ان حالات میں نہایت صاحب۔ کاش آپ شام ہی کو ہاں کر دیتے۔“

”اب بھی کتنی دیر ہوئی ہے۔ تار گھر تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ تار وقت پر مل گیا تو کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔“ ”ارخنت تار دیا جائے گا۔ رات کو بھی پہنچایا جاتا ہے۔ پھر تو مجھے جلدی کرنی چاہیے۔“

”پہلے آپ کھانا تو ختم کر لیں۔“ ”میرا ارادہ دیر تک بیٹھنے کا تھا۔ آپ کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ مجھے آنے میں دقت لگ گیا۔ آپ کو معلوم ہے، والدہ بیمار ہیں۔ شام کے وقت ان کی طبیعت عموماً بگڑ جاتی ہے۔ آج تو ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔“

”پھر تو آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔“ ”کیسے نہ آتا۔ وعدہ جو کیا تھا آپ سے۔“ ”زہرت نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ وہ تو بھی آنا چاہتے

تھے۔ میں نے کہا، رات ہوگئی ہے بھی۔ کل چلیں گے۔ سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔“ ”میں تو دوپہر ہی ان سے ملا تھا۔“ میں نے اداسی سے کہا۔

”اس وقت کی بات اور تھی۔ میں نے جا کے جب بتایا کہ باپ میاں کی ایک ایک بات حرف بہ حرف درست تھی۔ واقعی اپنی کے بھائی اسپتال میں ہیں اور علاج..... علاج تشخیص کے مرحلے میں ہے تو بھی شرمندہ ہوئے۔“

”الٹا شرمندہ ہوئے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”مجھے تو ان کے سامنے جانے کے خیال ہی سے ندامت ہو رہی ہے۔“

”واہ صاحب، یہی ندامت۔“ وہ شکرتی لہجے میں بولے۔ ”خیر چھوڑیے۔ یہ بیٹھا بیٹھے کھانا تو آپ نے کھایا ہی نہیں۔ زہرت خاتم نے یہ صلہ اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ تجربے کرتی رہتی ہیں۔ کہیں لبنانی صلہ کی ترکیب پڑھ لی..... صبحی، بس طبع آزمائی شروع ہوگئی۔“ اکبر علی خاں نے رکابی میں صلہ نکال کے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک چمچ لیا۔ بہت خوش ذائقہ تھا۔ واقعی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ ”میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے گا۔“ میں نے کہا۔

”وکل وہ آئیں گی۔ آپ خود کہہ دیجیے اور ہاں، اگر آپ کہیں تو تار دے کے میں واپس آ جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔“ میں نے شدت سے انکار کر دیا۔ ”رات اب بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ آپ جا کے آرام کریں۔“

”آپ کو پتہ نہیں آئے گی اور کچھ بوجھے تو مجھے بھی نہیں آئے گی۔ خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کر دے۔ گھر میں سبھی نے دعا کی ہے۔ زہرت تو کہہ رہی تھیں، کل محلے کی عورتیں بلا کے آہٹ کر بیچکا کر دوا دیں گی۔“

ان سے آج دوپہر ملاقات ہوئی تھی۔ جس طرح برسوں کا تعلق کھوں میں ختم ہو جاتا ہے، لہجوں میں برسوں جیسا تعلق قائم بھی ہو جاتا ہے۔ تعلق خاطر کے لیے وقت کے طول و عرض کی کوئی شرط نہیں۔ کوئی ایک نگاہ بھی ایسی کارگر ہوئی ہے کہ آدمی زندگی وقف کر دے، زندگی سچ دے۔ بھی زندگی بھر کی رفاقت سے کچھ فرق نہیں پڑتا، آدمی کی تنہائی اور تشدد کا ختم نہیں ہوئی۔

اکبر علی خاں جلد ہی چلے گئے۔ کچھ دیر میں اکبلا باہر بیٹھا رہا۔ تنہائی سے مراد خاموشی نہیں ہے۔ تنہائی میں آدمی خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مخاطب کو خاموش کیا جاسکتا ہے، اپنے آپ کو نہیں۔ جہنم سے کپڑے رسمائے لگے تو میں نے کمرے کا رخ کیا۔ کمر استہان تھا۔ میں غسل کے بستر پر نہیں گیا۔ اسے اس طرح بے حال رکھ کے میرا بی ہو لئے لگتا تھا۔ اپنی اپنی مخصوص آرام کرسی سے اٹھ کے میرے پاس آئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ اس نے وہی سوال کیا جس کا جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے جواب سے اس کی بے چینی وحشت میں بدل جاتی۔ ”کچھ خاص نہیں۔“ میں نے سرسری طور پر کہا۔ ”کچھ شبہ ہو گیا تھا انہیں۔ دور ہو گیا تو چلے گئے۔“

ایک ایک بردبار عورت تھی، اپنی حدود سے واقف، سو اس نے تجاوز نہیں کیا۔ میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہی ایک سوال جو کئی بار میں نے کیا تھا۔ اب پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میرے عاجزانہ لہجے پر مسکرا پڑی۔ ”میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز پر باسیت غالب آ گئی۔

”نرس بھی آدمی ڈاکٹر ہوتی ہے۔ تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کاش میں کچھ شاکستی ایک بات ہے۔ مجھے ڈاکٹر رائے پر اعتماد ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر

ہیں۔“ اس نے وثوق سے کہا۔ ”یہ تو میں کل رات سے سن رہا ہوں۔“ ”اور کچھ غلط تو نہیں سن رہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر رائے تو کچھ کہتے ہی نہیں۔“ ”وہ ایک ذمے دار ڈاکٹر ہیں۔“

”لگتا ہے، وہ مجھ سے کچھ بھیارے ہیں۔“ ”ڈاکٹر رائے نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم ایک

بڑے بچے ہو۔“ اس کے ہونٹوں پر اس کی خاص مشفا قائم مسکراہٹ چھیل گئی۔ میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے۔ وہ غسل کے بستر کی طرف گئی اور کرسی پر بیٹھ کے آنکھیں موند لیں۔ یوں وہ مجھے بھی آرام کی ترغیب دینا چاہتی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر مریمین کے ذاتی نگہ دار کے لیے مخصوص بستر پر آ کر راز ہو گیا۔

میں آنکھوں کے سامنے موجود افراد، مناظر اور اشیاء آدمی کے تصور کی بے کرائی محدود کر دیتے ہیں۔ بند آنکھوں کے آگے تو ایک جہاں کھل جاتا ہے۔ پھر کوئی حد اور کوئی حساب نہیں۔ بند آنکھیں تو اور بیٹا ہو جاتی ہیں۔ آنکھ بند کرتے ہی میرے سامنے کوئی فرد ماہ و سال کھل گئی تھی، اپنی عدالت آپ۔ آپ ہی منصف، آپ ہی مدعی۔ کون سی کوئی ہی ہوئی، کس کا حق چھینا گیا، کس سے زیادتی کی گئی۔ یہ کون سے گناہوں کی سزائیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ یا سبب اور فرداں کو اس کیسے سید محدود علی کے چنگل سے چھڑا کوئی جرم تھا کیا؟ انہیں آباد کرنے کی خاطر فیض آباد جانا ضروری تھا۔ وہاں گئے ہوئے وقت بھی خاصا گزر گیا تھا۔ ایک دن عوبلی سے نکلنے کی غلطی کیا ہوئی کہ شہر سے باہر جانے پر پابندی لگا دی گئی اور جب اجازت ملی تو..... جہاں اتنے دن ہو گئے تھے، ایک دو دن فیض آباد میں اور گزرا رہے جاسکتے تھے۔ محفل نے زیریں کا خیال کیا نہ عوبلی میں نو وارد فرداں اور یا سبب

جاسوسی انجسٹ میں سلسلہ اشاعت ہونے والی قبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

KHAN STATIONERS &
GENERAL STORE
Shop F/890, Bhabra Bazar,
Nishtar Road, Rawalpindi

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

مجلدات

مکمل سیریز منگولیا
مکمل سیریز 600 روپے
ڈاک خرچ منگولیا

کتاب کی قیمت 600 روپے
ڈاک خرچ منگولیا

فلسطین کی جنگ آزادی میں شامل ایک
پاکستانی جاں بازی ناٹا بل فراموش جدوجہد

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
جب خون جگر برفاب ہوا

آئی تھی اور ابا جان اسے گھر میں رکھنے پر تیار نہیں
تھے، تو مجھے ان کے سامنے سیز پر ہوجانا چاہیے تھا۔
وہ کیا کر لیتے، گھر سے نکال دیتے تو بات دوسری
تھی۔ سب لوگوں کو چھوڑنے کا اٹا بڑا فیصلہ میں نے
کیوں کر لیا۔ میں ابا جان کے پیروں پر سر رکھ کے
دہائیاں دیتا تو وہ پیچ بھی سکتے تھے۔ ائی، ائی،
کرشنا جی، چیرودادا، کانٹے، مارٹی اور جانے کون
کون..... کہتے ہیں، جو گزر گیا، وہ مٹی ہو گیا، آدمی
ہو یا وقت۔ آج جو موجود ہے اس کی فکر کرنی
چاہیے..... مگر آدمی کو گزرے ہوئے ماہ و سال سے
نجات کہاں ملتی ہے، گزرے ہوئے وقت کی
زنجیریں تو اسے جکڑے رہتی ہیں۔ ہر آج، جیسے
ہوئے کل کے نمبر سے اٹھتا ہے اور آدمی کو چین لینے
نہیں دیتا۔ ائی اور مٹی ہو گئیں پر سامنے تو اب بھی
آجانی ہیں، کرشنا جی، چیرودادا، کانٹے، مارٹی، ان
کا بھی یہی ہے، جب دیکھو منٹھائے چلے آئے
ہیں..... آدمی مٹی ہو جاتا ہے، نقش تو مٹی نہیں
ہوتے۔ نقش تو اس وقت تک محفوظ رہتے ہیں جب
تک نقش محفوظ رکھنے والا ہی مٹی نہ ہو جائے۔ کاش
زندگی بہت مختصر ہوا کرتی، ایک دن، دو دن، ایک
مل، دو مل۔ انجام تو ایک ہی ہے۔ وقت زیادہ ملے
یا کم پر یہ زیادہ وقت کی زندگی تو بوی عذاب ہے۔
ایک ایک ایک ہو کر ہی اٹھی۔ میں بستر پر اٹھ کے
بیٹھ گیا۔ سیدھے جیسے کوئی دھنک رہا تھا۔ کمرے میں
پرائے نام روختی تھی۔ ایسی آرام کرسی پر نیم دراز
تھی۔ ٹھنڈا، معمول بے خبر تھا۔ میں نے
کمرے پر نظر ڈالی۔ ہر چیز ٹھہری ہوئی، جوں کی
توں تھی۔ ایسی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا حلق
ٹنک ہو رہا تھا۔ ایسی کے منتشر ہوجانے کے خیال
سے میں نے اٹھ کے پانی پینے کا ارادہ ملتوی کیا اور
دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔
اس وقت دروازے پر دھنک کا شہ ہوا۔ نیم
خوابیدہ ایسی مجھ سے پہلے چونک پڑی۔ اس نے

کا۔ حویلی کے ہر کمین کی یہی خواہش تھی کہ ابھی چند
دن اور ہم ان کے پاس رہیں۔ جب ہم رخصت
ہو رہے تھے، سب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ میں
نہ ہوتا تو ٹھنڈا رک جاتا، میں نہ ہوتا تو ٹھنڈا نہیں
جاتا ہی کیوں۔ وہ تو اتنی عزیز ازجان، اپنی بیٹی
زریر کے پاس ہی رہتا۔ زریر میں تو اس کی جان
انگی ہوئی ہے۔ ٹھنڈا رک جاتا لیکن میں جو ایک
مستقل مطالبہ، مستقل تقاضا، اس کے سامنے کھڑا
تھا۔ روز ہزاروں ریل گاڑیاں ادھر سے ادھر جاتی
ہیں۔ اسی دن ہمیں روانہ ہونا اور اسی گاڑی سے
سفر کرنا تھا جس کا انجن آگے جا کے خراب ہو جانا تھا
اور یہاں پٹنا شہر میں ہوا پٹن گیا تھا تو اس غاصب
کے تعاقب کا گناہ کیوں مجھ سے سرزد ہو گیا۔ ایک
غلطی کے بعد دوسری غلطی۔ کہتے ہیں، سارا مجھ
آسان کے قبو پر ہے۔ کوئی مصلحت، کوئی اس کی
رمز ہوئی ہے۔ آسان کا یہی طور ہے تو کوئی کیا کر سکتا
ہے۔ آسان کی نظر میں یہ لغزشیں ہیں تو آدمی سے
ہوتی رہیں گی۔ اب تو ہر بات پر شبہ، ہر قدم پر کسی
خطا کا گمان ہوتا ہے۔ کیا معلوم، کون پیچھے سے پھرا
گھونپ دے، کچے کا منہ کھول دے۔ کتنے کون سی
بات بری لگ جائے، کون سا راستہ کب بند
ہو جائے۔ کوئی امتحان ہے یہ.....؟ تو کیسا امتحان
ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ امتحان ہی میں آدمی تمام ہو جاتا
ہے کیا!.....
میں کروٹیں بدلتا رہا، ایک کے بعد ایک منظر۔
ہوا میں رکھی کتاب کے ورق جیسے پلٹتے جاتے ہیں۔
کہاں سے کہاں تک، کتنے کئی کوپے، کتنے چہرے،
کیسے کیسے لوگ، مز کے پیچھے دیکھو تو دماغ پھٹ
جائے۔ کتنے لوگ لپیٹ میں آ گئے۔ کہتے ہیں، آدمی
کے ختم ہو جانے کے بہانے بن جاتے ہیں۔ بہانہ
پھر کس کا ہوا؟ اس رات نہ میں اپنا گھر چھوڑ کے کورا
کے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کرتا نہ اسنے لوگوں کا
بہانہ بنتا۔ اب تو کوئی شام ہی نہیں۔ کورا اپنا لینے گھر

کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ، مٹی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال فرمائیں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313-5802551

kitablat1970@yahoo.com

راہیل کے لئے: C-63 فیز 111 یکسٹینش ڈی ایچ اے میں کوئٹہ روڈ کراچی 75500

بے کئی سے میری طرف دیکھا۔ لکڑی کے اونچے اور چوڑے دروازے کے بالائی حصے میں چھوٹے چھوٹے چوکور خانے شیشے کے تھے۔ ایک نے پردہ کھینچ دیا تھا۔ باہر کا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی تھی۔ دروازہ کھولنے کے بجائے گھبرائی ہوئی آواز میں اس نے انگریزی میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

جواب میں ایک دو لمبے خاموشی رہی پھر کسی نے بے درنگی سے کہا۔ ”باہر صاحب کے کچھ مہمان آوت ہیں۔ ان کو باہر بھیج دیو۔“

میں بستر سے اچھل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ بیک وقت بہت سے شکوک ذہن میں اٹھے۔ اشارے سے میں نے ایک کو اپنے بارے میں کچھ جاننے سے منع کیا۔

دروازے سے مٹ کے ایک کچھ فاصلے پر کھڑکی کی جانب چلی گئی۔ کھڑکی پر باریک جالی نصب تھی۔ اندر عام دروازے کی طرح لکڑی اور شیشے کے پت تھے۔ تازہ ہوا کے لیے ایک پت کھلا ہوا تھا لیکن کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں آڑ میں ہو گیا۔ ایک نے پردہ ذرا سا کھسکایا۔ ”باہر سب ادھرنا ہیں ہے۔“ ایک نے پہلے انگریزی پھر ہندوستانی میں جواب دیا۔

”سب کدھر گئے ہیں؟“ باہر سے کسی نے بیجانی آواز میں پوچھا۔

”وہ ادھرنا ہیں ہے۔“ ایک نے بے ظاہر ہے اعتنائی سے کہا۔ ”ہول گیا ہے۔“

”ہول۔۔۔ کون سا ہول؟“ یہ آواز پہلے سے مختلف تھی اور لکڑی ہوئی تھی۔

”اپنے کو؟“ میں معلوم، رات ادھر ہی ریٹ کرے گا۔ سویرے آنے کو بولا ہے۔“ ایک نے اس بار کسی جھجک کے بغیر پوچھا۔ ”آپ کون ہے؟“ ابھی ایک نے اتنا کہا تھا کہ راہ داری میں دور

سے کہیں بھاگتے قدموں کی چا پیں گونجیں اور بھنائی سرگوشیاں۔ چا پوں اور سرگوشیوں کا کلا جلا شور قریب ہوا اور ای چیز سے دروازے سے دور ہوا گیا۔

ایک لکڑی کے پاس کھڑی رہی۔ کچھ ہی دیر میں سناٹا چھا گیا۔

ایک نے کھڑکی کا پردہ ٹھیک کیا۔ میں بھی آڑ سے مٹ کے صوفے پر چلا آیا۔ اتنی رات گئے آئے والے میری تلاش میں آئے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ انہیں اسپتال میں داخل ہوتے ہوئے اسپتال کے عملے اور دربانوں نے نہیں دیکھ لیا تھا اور ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری جستجو میں آنے والے ہمارے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن انہیں زیادہ دیر دروازے پر ٹپکنے کا موقع نہ مل سکا۔ راہ داری میں اسپتال کے دربانوں اور محافظوں کے سر پہ پہنچ جانے کی وجہ سے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

میرا جسم ڈھیر ہو گیا تھا۔ سانس لینے اور کچھ سوچنے سے پہلے ایک کے سوالوں کے جواب کے لیے مجھے تیار ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھے بھی اپنے آپ کو جواب دہی کی بہت بے فکری ہے۔ ایک پتہ عمر عورت تھی، اپنے کام میں طاق، بے اعتماد لہجے میں بات کرتی تھی، اپنے کام اور اپنی ذات پر اسے بہت اعتماد تھا۔ اس وقت اس کا حال مختلف تھا۔ بے گانہ لگا ہوں سے مجھے دیکھا کہ جبر سے سر پر سیٹنگ نکل آئے ہوں جیسے۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”کون تھے یہ؟“ اس نے دھڑکی آواز میں پوچھا۔

جواب آسان نہیں تھا۔ رات کو دو پولیس افسروں کی غیر متوقع آمد کے بارے میں اسے سنا طرح مطمئن کر دیا تھا لیکن اب میں اسے کیا بتاؤں گا۔ تک سارے اسپتال میں گردش کرنے والی چ

مچھوٹیوں کے خیال سے میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ بہت کچھ ایسی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زبان کس حد تک کھولتی ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اسپتال کے بینکوں کو کیا کچھ بتاتی ہے۔ رات ہی ڈاکٹر رائے پولیس افسروں کی آمد کی اطلاع پر کھٹک گیا تھا۔ اب اسے میرے اور شعل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں کیا دشواری ہوگی۔ وہ ایک سخت مزاج شخص ہے۔ اس کی بدگمانی اور برائی۔۔۔ مشکل صورت حال سے دو چار کر سکتی ہے۔

”کیا بات ہے؟“ زس ایک سرانسیکی سے بولی۔ ”کون تھے یہ؟“

میں نے آنکھیں میچ لیں اور چنچنی آواز میں کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔۔۔ لیکن وہ میرا ہی نام لے رہے تھے اور میری تلاش میں آئے تھے۔“

ایک کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

”میں نہیں بتاؤں گا چاہتا تھا کہ اس لیے کہ تمہارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔“ میں نے آسان بیعت کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن وہ یہاں تک آگئے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن اب نہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کل رات سے اب تک میرے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کل رات سے پہلے اس شہر میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہمیں یہاں آنا ہی نہیں تھا مگر بھائی کی حالت کی وجہ سے آگے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔“

شاید یہی مناسب تھا کہ میں اس سے کچھ نہ چھپاؤں اور میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں نے اس قدر اختصار روا رکھا کہ اسے میرے بیان میں کوئی گروہ اور پیچیدگی محسوس نہ ہو۔ سیاق و سباق کے بغیر اس سادہ شعرا کی نظر میں یہ عرض حال نامکمل ہوتا۔ وہ درمیان میں نہیں بولی، ایک بار میری آواز بندھ گئی تو اس نے اٹھ کے مجھے پانی پلایا اور مہبوت انداز میں ملتی رہی۔ اس نے وہی سنا جو میں نے کہا تھا اور وہی سمجھا جو میں چاہتا تھا کیوں کہ وہی سچ تھا اور

کیوں کہ وہ ایک نیک دل خاتون تھی۔ میں چپ ہوا تو وہ آدہ دہر ہوئی۔

”ہم کوئی چور چکے نہیں ہیں۔ ہم نے کسی کا حق غصب نہیں کیا۔ بھائی کی حالت نہیں معلوم ہے۔ ایسے میں کون کسی جھگڑے مننے میں پڑنا چاہے گا۔ پانچ ہی ہو گا کوئی۔۔۔“ میری آواز رنہ بننے لگی۔

”یہ سارا کچھ ناقابل یقین سا ہے۔ ایسے برے، بے ایمان اور بد معاش لوگ رہتے ہیں اس شہر میں۔“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”اور۔۔۔ اور یہ، یہ لوگ کیا کرنے آئے تھے؟“

”ظاہر ہے، ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یعنی وہ جنہیں۔۔۔ جنہیں۔۔۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔“ وہ میرے خدا۔

”ان کی آواز پر میں باہر نکل جاتا، اگر ان سے پہلے وہ پولیس افسر نہیں آتے۔ پولیس افسروں کی آمد کے بعد مجھے چوکنٹا ہو جانا چاہیے تھا۔“

”اوہ، اوہ۔۔۔ اسے بھر جھری آگئی۔“ یعنی وہ پولیس افسر جو تم سے ہم دردی جتانے آئے تھے، یہ ایک کے آدمی تھے۔“

”ہو سکتا ہے۔ وہ میدا کو بری طرح کھالیاں دے رہے تھے۔ وہ میدا کے فرستادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے سارا محل وقوع دیکھ لیا تھا۔ اسپتال کے اس حصے میں ویسے بھی سناٹا ہوتا ہے۔ اتنی رات گئے تو انہیں یہ سب کچھ بہت آسان معلوم ہوا ہوگا۔ کچھ مجھ سے بھی غلطی ہوئی۔ پولیس افسروں کی زبانی میدا کے ارادوں کا سن کے میں نے کہا کہ پھر تو مجھے کل سویرے سورج نکلنے ہی میدا کے اڈے کا رخ کرنا چاہیے لیکن صرف غصہ ہی نہیں، یہ جتانے سے مقصد کچھ اور بھی تھا۔ پولیس افسروں کے سامنے اپنے عزم کی پختگی کا اظہار بھی مقصود تھا۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان پولیس افسروں کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ جیسا کہ

انہوں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ چاقو بدلنے کی رسم ادا کر کے میدا نے سر پہ منڈ لانا خطرہ نکالا ہے۔ اب اسے میرا کام تمام کرنے میں جلدی کرنا چاہیے۔ دھنوا کے جنونی ساتھیوں کے غم و غصہ کا جواز تو موجود ہی ہے۔ دربانوں نے انہیں دیکھ لیا اور ادھر میں کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے ایکی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے کچھ کبے بغیر کمرے میں میری موجودی سے انکار کر دیا۔ ہو سکتا ہے، انہیں یقین آ گیا ہو اور وہ بالواس کوٹھا چاہتے ہوں کہ تعاقب میں آنے والوں نے انہیں اور بھٹکا دیا۔

”مجھے کچھ شبہ ہو گیا تھا۔“ ایکی کی آواز ہانپ رہی تھی، کہنے لگی ”رات وہ پولیس والے آئے تھے، پھر رات گئے، اتنی رات گئے نہیں پوچھتے ہوئے ان لوگوں کی آمد پر میرا ہاتھ ٹٹکا کہ نہیں کوئی گڑ بڑ ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ ان خاص الخاص کمروں کے ہر کمرے سے ملحق نرس کا ایک چھوٹا کمرہ بھی ہوتا ہے۔ رات بھر نرس وہیں رہتی ہے اور وقفے وقفے سے مریض کو دیکھنے آتی رہتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر مریض اور اس کا سامی بیمار دار بھی کھٹنی بھا کے اسے طلب کر سکتا ہے۔ گزشتہ رات میں اپنے کمرے میں تھی اور شاید تین چار مرتبہ مریض کا معائنہ کرنے آئی تھی۔ آج ڈاکٹر رائے نے خاص طور پر مجھے مریض کے کمرے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے نیند آور دواؤں میں کمی کی تھی اور مریض کا رد عمل دیکھنے کے لیے میرا اس کے پاس رہنا ضروری تھا۔ عموماً رات کو ہم کمروں میں چھٹی نہیں لگاتے۔ یہ ایک بڑی محفوظ جگہ ہے۔ ایکی واردات کا تو یہاں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرے کسی انتہائی اہم ضرورت میں چھٹی کھلوانے میں وقت صرف ہونے کا بھی احتمال رہتا ہے۔ لیکن چون کہ آج رات میرا کام اسی کمرے میں تھا، میں نے چھٹی لگا دی۔ میں کہہ نہیں سکتی، کیوں؟ شاید اس لیے کہ تمہارے پاس آنے والے پولیس افسر دیکھ

کے میرے چھٹی جس بیدار ہو گئی تھی..... اور یہ لوگ آگئے۔ انہوں نے دروازہ کھول کے اندر آنے کی کوشش کے بجائے دستک دینا مناسب سمجھا۔ وہ خود بھی گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ دروازہ کھلا ہوتا اور وہ دھک دے کے اندر داخل ہو جاتے اور اگر میں نہ ہوتی، کمرے میں صرف تم ہوتے اور اگر ہم دونوں بھی ہوتے تو.....“ ایکی کا جسم لرز گیا۔ اس نے جلدی سے سینے پر کراس بنایا اور خوف زدگی سے بولی۔ ”خداوند نے ہم سب پر رحم کر لیا۔“

”ہاں“ میں نے کھٹنی کھٹنی آواز میں اقرار کیا۔ ”پھر تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“ اس کے ہم دردانہ رویے سے مجھے حوصلہ ہوا۔ اسی لیے میں نے سیاق و سباق کے ساتھ سارا احوال اس کی جناب میں کہہ دیا ضروری جانتا تھا۔ اب میں اس سے گزراؤں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سسر! تم ڈاکٹر رائے کو کچھ نہ بتاؤ تو بہتر ہوگا۔ کیا ضرورت ہے، انہیں بتایا جائے کہ وہ لوگ ہمارے کمرے پر آکے ٹھہر گئے تھے اور میرا نام لے رہے تھے۔“

”دکھ..... تمہارا ان کا تعاقب کرنے والے دربانوں نے انہیں ہمارے کمرے پر ٹھہرے ہوئے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔“ وہ ہچکچا کے بولی۔ ”امکان یہی ہے، نہیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کمرے کے دروازے پر موجود لوگ، دربانوں کی بلند ہوتی ہوئی چابوں پر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ انہوں نے پھر کوئی کوشش نہیں گویا ہوگا۔“ میں نے ایکی کو قائل کرنے کی کوشش کی اور کھٹنی لہجے میں کہا۔ ”سسر! ڈاکٹر رائے کے مزاج سے تم واقف ہو۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھیں۔ مفرور، جرائم پیشہ، کیا کیا۔ کوئی اتنی سیدھی بات ان کے دماغ میں آگئی تو ہم کیسی معیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، اسپتال سے نکل جانے کا حکم دے دیں۔ پھر ہم کہاں کہاں بھاگتے پھریں گے، کون سے اسپتال کا رخ کریں گے۔ بھائی کی حالت اس در بدری کی

متحمل ہو سکتی ہے؟ یہ تم بہتر جانتی ہو۔ بھائی کی صحت یابی کے بعد تم جو چاہو، ان سے کہہ دینا۔“ وہ چپ ہو گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ”تم نرا کت سمجھ رہی ہو؟“ میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ میں نے پھر اس سے اصرار نہیں کیا۔ بہت دیر خاموشی کے بعد وہ ہیزا کے بولی۔ ”لیکن ناکام ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ شیطان دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔“

”اکبر علی خاں کے ذریعے میں نے تار دلوادیا ہے۔ کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”پھر میں انہیں دیکھ لوں گا۔“

”کیا..... کیا دیکھ لوں گے؟“

”اس عرصے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔“ مجھے خیال آیا اور میں نے بات بدل کے کہا۔ ”اس دوران ہم خود بھی پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔ وہ پولیس والے، اگر واقعی میدا کے آدمی نہیں تھے تو جیسا کہ انہوں نے کہا تھا، روپے پیسے کے عوض میرے لیے سیر کا کام کر سکتے ہیں اور اب امید یہی ہے، اس ناکامی کے بعد دو ایک دن تو کوئی بھی اسپتال آنے کی جرأت نہیں کر پائے گا۔ وہ خود بھی ہوشیار ہو جائیگا۔ گے اور کیا عجب ہے، اس دوران بھائی ٹھیک ہو جائیں۔ مجھے تو سیلے ان کی فکر ہے، ان کی طرف سے ذرا سکون ہوتا دیکھنا۔ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ ایسا اندھیر ہوتا نہیں کہیں۔“ میں نے ٹھٹھل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے مجھے کسی کام کا نہیں.....“ میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔

”دوسرے، ارے، سب ٹھیک ہو جائے گا، خدا پر ہمارا رکھو۔“ ایکی، وہ غم گسار خاتون، سامنے کے سونے سے اٹھ کے اٹھتے ہوئے میرے پاس

آگئی اور میرا سراپا اپنی آغوش میں لے لیا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ایک ہمت والے لو ہو ان ہو، اور مرد..... مرد روئے نہیں۔ یہ کام تو ہمارا ہے۔ ہم عورتوں کا۔“ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور خود اس کی آواز پھٹکنے لگی۔ میں سسکیاں بھرنے لگا۔

باقی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ جیسے ہی سورج طلوع ہونے کے آثار ہوئے، ایکی کو بتائے بغیر میں کمرے سے نکل گیا اور سن گن لینے کے لیے راہ داری سے آگے چلا گیا۔ سارا اسپتال جاگ رہا تھا۔ صفائی کرنے والے خاک روپ کو کمرے کی طرف بڑھتا دیکھ کے میں فوراً ہی واپس آ گیا۔ خاک روپ کو آج اپنے کام سے زیادہ رات ہونے والی واردات سے ایکی کو باخبر کرنے کی فکر تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پھٹی آنکھوں اور پھٹی پھٹی آواز میں ایکی کو بتایا کہ رات اسپتال میں ڈاکٹرس آئے تھے۔ ان کے چہرے ڈھانٹوں سے چھپے ہوئے تھے۔ تعداد میں چار پانچ ہوں گے یا اس سے زیادہ۔ اسپتال کے عام دروازے سے داخل ہونے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان خاص کمروں کے جسے پر تعینات بوڑھے دربان کو انہوں نے چند ضروریوں سے ادھ صوا کر دیا لیکن رات کی ڈیوٹی پر موجود اسپتال کے ملازمین میں سے کسی نے انہیں دیکھ کے شور مچایا اور تعاقب شروع کر دیا۔ کئی اور ملازم بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ ڈاکٹر سیلے تو ادھر ادھر پھرتے پھرتے اور کوئی راستہ نہ دیکھ کے انہوں نے داکٹس ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ انٹھوئی نامی اسپتال کا ایک نو جوان ملازم ناک لگائے پھٹا تھا۔ اس نے اوٹ سے نکل کے کسی کے سر پر لاٹھی ماری اور اسے دبوچ لیا۔ ڈاکو نے اس کے پیٹ میں پھرا گھونپ کے جان پھڑائی۔ زخمی انتھوئی نے آدھ گھٹنے میں دم توڑ دیا۔ ڈاکوؤں نے جس بوڑھے دربان کو مارا پٹا تھا،

اس کی حالت بھی تازک ہے۔ پولیس آگئی ہے اور تفتیش کر رہی ہے۔

ایک نے میری طرف دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ میرے اور ایک کے لیے ناشتہ لانے اور کمرے میں نولے چادریں وغیرہ بدلنے والے ملازمین نے بھی کم و بیش یہی رد و ادھرائی۔ مبالغہ بہترین نمونہ تھا۔ حاشیہ آرائی اور خلاق کے لیے انہیں وقت ہی کتنا ملتا تھا۔ ہنک رہے، ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے بہ قول ڈاکو، ہمارے کمرے کے دروازے پر آکے ٹھہرے تھے۔

مجھے شدت سے ڈاکٹر رائے کا انتظار تھا۔ وہ کسی قدر تاخیر سے آیا۔ اس کا چہرہ سنگ رہا تھا۔ میرے سلام کا جواب اس نے سر کی جنبش سے دیا اور کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اس کے نزدیک جانے سے پہلو تکی کی۔ اس کے ساتھ دو اور ڈاکٹر تھے۔ ان تینوں اور ایک نے شعل کے بستر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ انہوں نے خاصا وقت لیا پھر نرس کو ہدایات دے کے ڈاکٹر رائے میری جانب پلٹا۔ اس کے سامنے آجائے میرا جسم غیر ارادی طور پر تن گیا۔ کچھ بہتر علامتیں ہیں، شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔ اس نے بھاری آواز میں مڑ دہنایا اور کہنے لگا۔ "لیکن اصل فیصلہ دوپہر پور نہیں آنے پر کیا جائے گا۔"

پرسوں رات سے اب پہلی بار ڈاکٹر رائے کے منہ سے کوئی امید افزا بات سنی تھی۔ میرے ہونٹ کھپکھپانے لگے اور مجھ سے کچھ کہنا نہ جا سکا۔

"رات وہ پولیس والے کیوں آئے تھے؟" اس نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

"ایسے ہی بس۔۔۔ کوئی خاص بات نہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ انہیں کچھ شبہ ہو گیا تھا۔"

میں نے بے تعلقی اور بے پرواہی کا اظہار کیا۔ "کیسا شبہ؟" وہ چونک کے بولا۔ "کوئی اور بات تو نہیں۔"

"اور کیا بات ہوتی۔" میں نے کسمسا کے کہا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا، میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

نرس ایک بھی قریب کھڑی نہ رہی تھی۔ "تمہیں معلوم ہے، رات اسپتال میں کیا ہوا؟" ڈاکٹر بڑے تجدد سے بولا۔

"سنا تو ہے کچھ۔" میں نے جیسے مسکراہٹ سے کہا۔

"یہاں پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"جواب شک نہ ہو سکا ضروری تو نہیں کہ آئندہ بھی نہ ہو۔" میں نے بددلتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔" ڈاکٹر رائے چھتی آواز میں بولا۔ "پولیس آگئی ہے۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ تم سے دوپہر کو بات ہوگی۔" چلتے چلتے وہ رک گیا۔ اس نے ساتھ کھڑے ہوئے معاون ڈاکٹروں کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ نرس ایک کے دور ہو جانے کے بعد وہ مجھے لہجے میں بولا۔ "اگر وہ ڈاکو تھے تو اسپتال میں ان کا کیا کام۔ یہاں سے انہیں کیا مل سکتا تھا؟"

"ہاں۔ لیکن ممکن ہے، انہیں کسی آدمی کی تلاش ہو۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"آدمی؟" وہ اچک کے بولا "آدمی کی کیوں؟"

"آپ کہہ رہے ہیں نا۔۔۔" میں نے اپنی زبان کی لغزش کی تلافی کرنا چاہی۔ "انہیں یہاں روپیہ چھپا تو نہیں مل سکتا تھا؟"

وہ کھوسا گیا پھر چھتی آواز میں بولا "تمہارے پاس کوئی بڑی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز تو نہیں؟"

میں نے عجب سے اسے دیکھا۔ "تھوڑی بہت تو ہے۔"

"کھل دو پھر تم کہاں کہاں گئے تھے؟"

"پہلے گراؤ ہوٹل پھر تار دینے کے لیے بڑے ڈاک خانے۔" میں نے ہچکچا کے کہا۔ بعد کی

مصرفیات کا میں اسے کیا بتاتا۔

"تمہیں اور تو نہیں۔ یاد کرو، تم یہاں بہت دیر سے آئے تھے، غالباً شام کے وقت؟"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"مطلب ہے، تمہیں تم نے کسی سے اپنے پاس موجود رقم کا ذکر تو نہیں کیا۔ ذرا سوچو، کس کس سے ملے تھے تم؟"

"کسی سے نہیں لیکن۔۔۔ لیکن ہاں۔ میں نے احتیاطاً ایک معقول رقم ہوٹل میں جمع کرائی تھی۔ یہ رقم بھائی کے کپڑے بدلنے وقت ان کی جیب سے نکلی تھی۔ سفر میں عموماً بھائی اچھی رقم ساتھ لے کے چلتے ہیں۔"

"ہوٹل والوں نے تمہیں کوئی رسید دی تھی؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے جیب ٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ رقم ہوٹل میں ہے تو پھر۔۔۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟" میں نے تذبذب سے پوچھا۔

"تم کہتے ہو، تمہیں اس شہر میں کوئی نہیں جانتا۔"

"جی ہاں، بس کل اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا نام کبیر علی خاں ہے۔ وکیل ہیں اور یہاں کسی کان میں قانون پڑھاتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ آدمی ہیں۔ شاید آتے ہوں انہی۔"

رات گئی آئے تھے، گھر سے کھانا لے کے۔ پولیس والوں سے رات ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔

مجھے یاد آیا، کل شام ڈاکٹر رائے شعل کو دیکھنے آیا تھا تو اکبر علی خاں موجود تھے۔ میں نے کہا۔ "وہی صاحب جو کل شام کمرے میں میرے ساتھ تھے۔"

"رات کو جو پولیس والے آئے تھے، تمہیں

یقین ہے وہ پولیس والے ہی تھے؟"

بازی گرو (127)

"انہوں نے شناخت نامے دکھائے تھے۔"

"تم نے دیکھے تھے؟"

"نہیں، انہوں نے جیب سے نکالے تو میں دیکھنے نہیں۔"

"ہاں، تو دیکھو تو نہیں مگر آپ۔۔۔؟"

"وہ کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں، بہرہ ہے۔"

میری وضاحت سے پہلے اس نے قیاس آرائی کی۔ "ناز بھائی نے آئے ہوں، ہو سکتا ہے بعد کو رات گئے آنے والوں کا ان سے کوئی تعلق ہو۔"

میں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ میرے لیے چپ ہو جانا ہی بہتر تھا۔ تاہم سے مراد یہ تھی کہ جس

کچ پر ڈاکٹر رائے سوچ رہا ہے، میں اسے ہمیز کر دوں۔ تیرہ دید کے لیے ایک جہت لازم ہو جاتی۔

مجھے حیرت تھی، اس نے کسی طرح تال میل پیدا کر لیا کہ رات کو آنے والے نہیں میری جستجو میں نہ آئے ہوں۔ ڈاکٹر رائے کو تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس کے ہونٹ کھپکھپانے لگے۔ "دیکھتے ہیں۔" اس نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں لپک کے چند قدم کے فاصلے پر موجود ایک کے پاس پہنچا اور اس سے ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا لیکن وہ کھری کھری ہی نظر آ رہی تھی۔ مجھے شک ہوا، رات دروازے پر دستک

دینے والے حملہ آوروں کے بارے میں اپنے دیرینہ رشتہ کار ڈاکٹر رائے کو بے خبر رکھنے کے

ناصف اور ندامت سے زیر بار نہ ہو۔ مجھے کچھ پوچھنے ہوئے جھومک ہوئی۔ "اب پریشان ہونے کی

کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔ "تم نے سن لیا سسر ڈاکٹر صاحب کیا کہہ

رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بھائی کی حالت میں بہتری نظر آرہی ہے۔ اور، اور شاید آپریشن کی

ضرورت نہ پڑے۔"

بازی گرو (126)

میری کوشش کا رگر ہوئی۔ ایسی کا بچھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ہاں، وہ برا امید نظر آ رہے تھے۔“

”تم سے بھی کچھ گہا“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر رائے قبل از وقت بڑی بات نہیں کرتے۔“

”اب تک انہوں نے ایک لفظ اطمینان کا نہیں کہا تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں سسر! ڈاکٹر صاحب کی زبانی اتنا سننے کے لیے مجھ پر کیا عالم گزر رہے ہیں۔“

”بس اب ساری دھند چھٹ جائے گی، ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی، دیکھنا۔“

میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ میں نے تیزی سے ایسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور سینے سے لگا کے کہا۔ ”تم نے بہت احسان کیا ہے مجھ پر۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔“

”تم آدھے پاگل ہو۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”تم منع نہیں کرتے تو بھی میں سوچ سمجھ کے زبان کھولتی اور دیکھو..... یہ شکر یہ اب مت ادا کرنا..... یہ اتفاق ہے کہ اسپتال کا کوئی آدمی ان لوگوں کو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے نہ دیکھ سکا ورنہ میری خاموشی سے بھی کیا ہوتا۔“

میں نے کئی بار اس کا ہاتھ چوم، آنکھوں سے لگایا۔ مجھے اپنا وجود اب بہت ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا۔

نرس سیورین کے آجانے پر مجھے دعا میں دیتی ہوئی ایسی رخصت ہو گئی۔ اس دوران میں تین چار مرتبہ غسل کے بستر کی جانب گیا اور ہر مرتبہ اس کی بے آرامی کے خیال سے میں نے اسے آواز نہیں دی۔

ٹھیک گیارہ بجے اکبر علی خاں آ گئے۔ میں نے سب سے پہلے انہیں یہی نوید سنائی کہ ڈاکٹر رائے نے صبح کے معائنے میں غسل کے لیے کیا کہا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی پٹکنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ رات یہاں سے جاتے ہی انہوں نے کلکتے باروے

دیا تھا، ار حنت تار۔ عملے سے مستعدی کی درخواست بھی کر دی تھی پھر صبح احتیاطاً یہاں آنے سے پہلے ایک اور تار روانہ کر دیا ہے۔

سیورین کمرے میں تھی۔ میں اکبر علی خاں کو رات داری میں لے آیا اور میں نے رات کا سارا واقعہ انہیں سنایا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ پھر میں نے ڈاکٹر رائے کے بارے میں انہیں بتایا کہ صبح اس کے سوال و جواب کی ایک آزمائش سے میں کس طرح گزر رہا ہوں۔ ڈاکٹر رائے پھر اس امکان پر اٹک گیا کہ رات آنے والے پولیس افسر اور ان کے بعد آنے والے حملہ آوروں میں کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔

یہ سن کے اکبر علی خاں غم غم سے ہو گئے۔ وہ بہر حال ایک دیکھ تھے۔ کتنے چینی روز و شب کا وظیفہ بھی۔ کہتے گئے۔ ”میاں! آپ کہہ رہے ہیں کہ رات کے حیران کن واقعے کی تفتیش کے لیے صبح سے پولیس اسپتال آئی ہوئی ہے۔ فرض کیجئے، ڈاکٹر رائے نے اپنے اس شبے کا ڈگر پولیس سے کر دیا۔ پولیس تو آپ کی طرف بھی آ سکتی ہے۔ پھر آپ کیا نہیں گے ان سے، رات آپ سے ملاقات کرتے والے پولیس افسر کون تھے؟“

مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں تو اکبر علی خاں کی صورت دیکھا کیا..... اس نکتے پر میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ بے شک ڈاکٹر رائے کو اسپتال میں موجود تفتیش کاروں سے یہ کہنے میں کیا عار ہوئی کہ گزشتہ رات اس کے زیر علاج، شہر میں انہیں ایک مریض کے بیمار دار بھائی کے پاس توغ کے خلاف دو پولیس افسر آئے تھے۔ اسپتال میں دھڑا دیے ہوئے پولیس والے رات کے واقعے کے اندھیرے میں کسی کرن کی امید میں میرے پاس آ سکتے ہیں۔ پھر میں ان سے کیا کہوں گا کہ بتاؤں گا کہ ان کے نام کیا تھے، چلیے کیسے تھے اور آ

کا مقصد کیا تھا۔ یہ مسلسل کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ کیا یہ جنجال ہے۔ ایک عذاب ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے جو مجھ سے جواب طلبی کی جارہی ہے۔ میرا سر پھرانے لگا۔ میں نے پولیس والوں کو سچ بتا دیا کہ رات کو ان کے ہم پیشہ، امید استاد کے سطلے میں آئے تھے تو میرا یہ اعتراف ڈاکٹر رائے تک متعلق ہو جائے گا۔

وہ مجھ پر دروغ گوئی کے اثرات عائد کرے گا۔ میری تو ہر بات اسے الٹی نظر آئے گی۔ نرس ایسی کی طرح، گزشتہ روز کی ساری روداد اسے سنا دیتا ہوں تو اس کا خلاق دماغ کیا کیا قیاس آرائیاں کر سکتے گئے۔ بات پھر بہت دور جا سکتی ہے، فیض آباد، کلکتے، جانے کہاں کہاں۔

”کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا میاں۔“ اکبر علی خاں مجھ سے زیادہ فکر مند لگ رہے تھے۔ ”آپ کہیں کہ آپ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ رات آنے والے دو آدمی، بیسیا کہ ان کا دعو تھا، پولیس افسر ہی تھے۔ آپ کہیں کہ انہیں آپ کی شکل سے کوئی دھوکا ہو گیا تھا۔ بات صاف ہو گئی تو وہ معذرت کر کے چلے گئے، کچھ ایسی ہی منظم انداز میں بات کرنا ہوگی۔“

”ظاہر ہے، بات تو بتانا ہی پڑے گی۔“ میں نے بے جا رکھی سے کہا۔

”آپ کی کوشش ہوئی چاہے کہ پولیس تفتیش کے دوران ڈاکٹر رائے موجود نہ ہوں۔“

”میری کوشش سے کیا ہو سکتا ہے۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”میرا بس تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“

اکبر علی خاں مجھے حوصلے کی تعلیم دینے لگے۔ چالان کہ سر دست خود انہیں اس کی بڑی ضرورت تھی۔ میں نے چڑ کے کہا۔ ”ٹھیک ہے جو ہونے والا ہے، اس پر میرا اختیار ہے نہ آپ کا۔ جو ہوگا،

دیکھا جائے گا، اور زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ رات آنے والے لوگ کس ارادے سے آئے تھے، کام باب بھی ہو سکتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔“

”نوید کیجئے میاں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اتنا آگے جا سکتے ہیں۔ آپ ہی کہہ رہے تھے کہ بڑا بڑا ٹھکانے والے ایسے بدعہد نہیں ہوتے۔ اب دیکھ لیا آپ نے۔“

”مجھے اب بھی یقین نہیں کہ انہیں میدانے بھیجا تھا۔“

”پھر کس نے..... کون بھیج سکتا ہے انہیں اتنے بڑے اقدام پر..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ اکبر علی خاں کی آواز بچ گئی۔

”وہ مرنے والے دھوا کے قریبی ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔ میدانے اڈے کے لوگوں کو باندھے رکھنے میں ناکام رہا ہے شاید۔ آپ کو یاد ہوگا، میں نے میدانے اڈے پر گہا تھا کہ اڈے کے استاد کو اسے آخری آدمی تک نگاہ رکھنی پڑی ہے..... یا پھر وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو میدانے استاد سے بڑی محبت و عقیدت رکھتے ہوں اور انہیں شہ جو کہ میدانے اپنا چاقو واپس لینے کسی وقت بھی میں اڈے آ سکتا ہوں۔ نتیجے میں ان کا محبوب استاد چوکی پر شاید قائم نہ رہ سکے۔ ایسے لوگ میدانے کی محبت میں اسے جتائے بغیر میری طرف آ سکتے ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ اکبر علی خاں کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ ”میرا جرم پیشہ لوگوں سے بہت واسطہ رہا ہے لیکن اس قماش کے لوگوں سے کچھ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ آپ کا یقین بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ بہر حال اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں، میدانے کے اشارے پر آئے ہوں یا اسے لاعلم رکھ کے۔ میں تو سوچتا ہوں..... خدا نخواستہ.....“ اکبر علی خاں کہتے کہتے رہ گئے۔ انہوں نے آنکھیں میچ لیں۔

”زندگی محض حادثہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”زندگی تو ہر وقت، ہر لمحے کسی نہ کسی افادہ، کسی ناکامیابی کی زبردستی ہے، موت ایک مستقل حقیقت ہے۔ انسانی جسم کے ہزاروں کلیرزوں میں کوئی بھی کسی لمحے مبینہ کی طرح خاک ہو سکتا ہے اور یہ نہ ہو یا تو آہاں سے نکلی کر جاتی ہے، چھت ڈھے جاتی ہے، زلزلہ آ جاتا ہے۔ زندگی سے موت کا فاصلہ بس لمحے بھر کا ہے، کبھی یہ لمبہ طویل ہو جاتا ہے، کبھی بہت مختصر۔ زندگی ایک عجوبہ ہے۔ اتنی بلاؤں، آفتوں، اتنی دشمنیوں اور اتنی جسمی پیچیدگیوں کے باوجود آدمی بچا رہتا ہے تو ایک کرشمہ ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی دکن موت ہے اور ج ہمیشہ اسی کا ہوتی ہے۔“ میرے منہ میں جو آیا، کہتا گیا۔

مسلک ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اسے شہ ہے کہ موت کے بعد احساس کی کبھی موت ہو جاتی ہے، جسم ختم ہو جانے کے بعد روح بھی موجود نہیں رہتی۔ اسے بتایا گیا ہے کہ جسم کے ساتھ روح نہیں مرنی۔ روح باقی ہے تو احساس باقی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ہر ذی نفس موت سے ہیبت زدہ رہتا ہے۔“

پونچھنا ہوا چلا گیا۔

اہم موت اور زندگی الٹی پر نوک بھوک کر رہے تھے۔ اکبر علی خاں اسپتال کے ادویہ مرطراز سے یہ سب کچھ من کے دل گرفتہ ہو گئے۔ میں نے ان سے پچھنا چاہا کہ انھونی کی موت کا ذمے دار کون ہے۔ اس کی بد بخت بیوی، میدا، میں یا فاضل، یا فرین کا حادثہ جس کی وجہ سے ہمیں پٹنا آنا پڑا؟ اکبر علی خاں جواب دیتے بھی تو کیا۔ اس لیے میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ موت کے کیسے بھانے ہو جاتے ہیں۔ یہ انھونی بیچ میں کسے آ گیا۔ بھینسی میں ایک موٹر کے کل پرزے اچانک خراب ہو گئے۔ بھنڈی بازار میں موٹر روکے نہری۔ فٹ بھری پرچہ لگی۔ وہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ تین ختم، چار پانچ زخمی ہو گئے۔ ان بچوں کا کیا قصور تھا۔ انہیں تو گناہ کا شعور بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو زندگی کی ابتدا ہی کی تھی۔ بس ایسے ہی موت کس وقت کسی کو بھی چن لیتی ہے اور کچھ نہیں دیکھتی کہ مرنے والے پر انحصار کرنے والے کتنے لوگ زندہ درگزر ہو جائیں گے اور انحصار کرنے والے نہ ہوں تو لوگ ایک دوسرے سے محبت بھی تو کرتے ہیں، ایک دوسرے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس بہت پیسے تھے۔ جی کرتا تھا، ابھی جا کے انھونی کی بیوہ کو کچھ دوں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اگرچہ اسی وقت تو اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑا سہارا تو مال زر کا ہوتا ہے۔ اکبر کی موت کا جہاں گیر کو ایسا علمہ نہیں ہوا ہوگا۔

اپنے آپ کو جاننے کی جستجو میں ہے۔ درختم ہی نہیں ہوتے۔ سرت در کے بعد خزانہ مل جاتا ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز کون سے در میں چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی در کے بعد در سر کرتا چلا جا رہا ہے اور اس کی حیرت کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

سہو رین نے چائے کے برتن سیلیف سے میز پر رکھے اور ہم سے دودھ اور چینی کی مقدار پوچھ کے چائے بنائی۔ اکبر علی خاں ٹھیک ہی کہتے تھے۔ موت موت ہی اٹل ہو، زندگی کی ہٹ دھرمی اپنی جگہ ہے۔ زندگی موجود ہے تو آخری لمحے تک خوش فطلیاں، خوش گمانیاں جاری رہتی ہیں۔ موت فراموش کرتے رہتا ہی زندگی ہے۔ موت اور زندگی کی آنکھ چھولی میں زندگی جیت بھی تو جاتی ہے، نیکی رشتی ہے۔ زندگی کی ان چھولی چھولی صیتوں پر موت شاید ہنسنی ہے۔ زندگی کو معلوم نہیں ہوتا کہ موت اسے ڈھیل دیتی ہے، اس سے کھلواڑ کرتی رہتی ہے اور کسی ایک دن پتنگ کاٹ دیتی ہے، کسی ایک دن پتنگ میں بری طرح دیوچ مچتی ہے۔ یہی اس کا شیوہ ہے۔ ایک دن ضرور اس کا ہوتا ہے اور چون اس کے نہیں ہوتے، وہ بھی کچھ اس کی چشم پوشی، درگزر کی سبب سے۔

دوپہر تک پولیس کا کوئی آدمی نہیں آیا۔ بھل کی بیماری کے دوران پولیس کی تفتیش سے مجھ کو اس باختم کی وحشت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی سوچ کے شاید ڈاکٹر رائے نے اپنا شبہ خود تک محدود رکھا ہو اور پولیس کو پہلے اپنے طور پر چھان بین کا موقع دیا ہو۔

ایک بوجا ہی چاہتا تھا۔ اکبر علی خاں کا ملازم بڑا سافٹن لے کے آگیا۔ ان سے کچھ کہنا کہ اس تکلف کا یہ مکمل ہے نہ اس کی ضرورت ہے، فضول تھا۔ گزشتہ رات کی طرح بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے رسم بھائی۔ ہمارے اصرار پر سہو رین بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ایسے خوش ڈاکٹہ کھانے شاید

پہلی بار کھائے تھے، مسلسل تعریفیں کرتی رہی۔ اسے کھاتے دیکھ کے بے اختیار مجھے زیریں اور خرداں کی یاد آئی۔ وہ بھی کچھ اسی انداز سے کھانا کھاتی تھیں۔ کھانا پکاتا ہی نہیں، کھانا کھانا بھی ایک ہنر ہے۔ نازک اندامی کونا نازک خیالی اور نازک اطواری بھی لازم ہے۔ قدرت نے ایسا رشیم، ایسا پھول، اتنا بھل اور تر شا ہوا بنایا ہو تو دیگر شایستہ، نرم و لطیف حرکات و سکنات سے کیا مطابقت ہو جانی ہے۔ غالباً بھی ٹھیک ہوتی ہے۔ کہتے ہیں، کسی شخص کے میزان کے لیے دسترخوان اور سفر سب سے کھری کسوٹی ہوتی ہیں۔ کچھ تو یوں بے شمار ہیں لیکن کلیوں پر زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ ایک پیسے آدمی بھی بھی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

کھانا کھاتے ہی اکبر علی خاں نشن لانے والے ملازم کو ساتھ لے کے رخصت ہو گئے۔ میں انہیں اسپتال کے مرکزی دروازے تک پہنچانے گیا۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ کی طبیعت سنہل نہیں ہے۔ ماں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز سوز و گداز سے مغلوب ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ والدہ کے پاس رہنے کی ضرورت سمجھیں تو شام کو یہاں آنے کی زحمت کیوں کریں اور براہ مہربانی یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگے اور بولے۔

”زحمت کیسی برادر۔ خدا را ایسی اجنبیت نہ برتیں۔ آپ کو معلوم ہے، خدا گواہ ہے، لگتا ہے، کوئی بچہڑا ہوا مل گیا ہے۔“

میں ان سے نہ کہہ سکا کہ میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں تو ڈھارس سی بندھ جاتی ہے۔ اس شہر میں کوئی ہے اپنا۔ وہ چلے جاتے ہیں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔

انہیں رخصت کر کے واپس کمرے میں پہنچا تو بھل کے بستر کے اطراف ڈاکٹروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، ڈاکٹر رائے اور کئی ڈاکٹر۔ ان میں گورا ڈاکٹر بھی

تھا۔ سہو رین بھی ان کے ساتھ مصروف تھی۔ میرے آنے کی آہٹ کسی کو نہ ہوئی۔ ان کے منتشر ہوجانے کے خیال سے کچھ دیر تو میں وہیں دروازے کے نزدیک کھڑا رہا۔ بھل پر ان لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا تھا اس لیے میں باہر چلا آیا۔ انہوں نے بہت دیر لگائی۔ کھڑے کھڑے پاؤں اکڑنے لگے۔ دماغ ہی پر اگندہ ہو تو دل کیا، آنکھیں کیا اور پاؤں کیا، کبھی بے جان ہیں۔ یہ جسم تو دیکھنے کا ہے۔ وہی بات ہے، آدمی تو بس دماغ ہے، حاکم مطلق۔ بانی سارا جسم تو اس کا محکمہ ہے۔ کتنی دیر ہو رہی تھی، میرا دل ڈوبا جاتا تھا دماغ ڈوبا جاتا تھا۔

انداز سے ڈاکٹر رائے کی آواز آئی تو میں نے جھانک کے کمرے میں دیکھا، ڈاکٹر بھل کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ”اوہ میرے تاراض نو جوان دوست!“ ڈاکٹر رائے نے لبتے ہوئے مجھے پکارا۔ ”کہاں ہو تم؟“

”میں..... میں یہیں تھا، باہر۔“ میری آواز بکھٹ گئی۔

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر! ہمارے معزز مہمان ڈاکٹر فرینکی نے ساری رپورٹیں دیکھ لی ہیں۔“ اس نے ستائش آمیز انداز میں پہلو میں کھڑے گورے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”شکر کرو کہ صرف اوپر کی جلد متاثر ہوئی ہے۔ وہیں سوجن ہے اور سر کوٹنے کی ضرورت نہیں۔“

میں ٹوٹن ہو گیا۔ اپنی سماعت پر مجھے شبہ ہوا اور میری دریدہ آنکھوں میں دریا اُٹھ آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیوں، کس طور ڈاکٹر رائے سے شکر گزار کیوں۔

”تمہارا بھائی دو آئیں رو نہیں کر رہا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔“ گورے ڈاکٹر نے سجدگی سے ڈاکٹر رائے کی تائید کی۔ ”یہ سزا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے نو جوان!“

میں نے مصطر باندھ کر ہلایا۔

”اور سنو!“ ڈاکٹر رائے نے مجھے متنبہ کیا۔ ”بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سرجری سے جلد نازک برآمد ہو جاتے ہیں اور جلد نازک کے لیے سرجری نہیں کی جاتی تاوقتیکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، سمجھیے۔“

”جی، جی ہاں۔“ میں نے بدحواسی سے کہا۔ ”مریض کے بارے میں نہیں معلوم لیکن اس کا یہ چھوٹا بھائی اپنے پوے بھائی میں خود سے زیادہ شائے ہے۔“ میرا بازو تھام کے ڈاکٹر رائے نے گورے ڈاکٹر سے کہا۔

”اور اسی لیے میں کہتا ہوں، مشرق میں آدمی موجود ہے۔ مغرب میں تو نہیں کھو گیا ہے۔“ ڈاکٹر فرینکی نے پرتگلت تپاک سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”تم سے مل کے خوشی ہوئی۔“ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ بکڑ لیا۔ ”امید ہے، جلد ہی تم اپنے محبوب بھائی کو صحت یاب دیکھ سکو گے۔“ گوروں کے حراج اور لہجے کی طرح ڈاکٹر فرینکی کی مسکراہٹ بھی جھٹکا تھی۔

اس کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھر آئی۔

”شام کو ملیں گے۔“ ڈاکٹر رائے منہا کے بولا اور اس نے ہاتھ پھیلا کے گورے ڈاکٹر کو چلنے کا اشارہ کیا پھر ایک رک کے مجھ سے پوچھنے لگا۔

”پولیس تو نہیں آئی یہاں؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ میرے شانے سیدھے ہو گئے۔ ”کیوں؟“

”اسکے ہے کسی وقت۔ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں وہ۔ یہ جاننے کے لیے کہ رات آنے والے اسپتال میں زیر علاج مریض یا اس کے کسی نگہ دار کی موجودگی میں تو نہیں تھے۔“

”آجائے دیجیے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کی۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میری کسی

رائے سے وہ منتشر ہو سکتے تھے۔ اچھا ہے، وہ خود ہی ہاتھ پاؤں ماریں..... دیکھتے ہیں بہر حال....." بہیم انداز میں یہ کہنا ہوا ڈاکٹر رائے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا کہ ان سے معذرت کر کے پھر دروازے کی طرف پلٹا اور سر کوئی ہیں اس نے مجھے مشورہ دیا۔" میں سمجھتا ہوں، گزشتہ رات غلط فہمی میں آنے والے پولیس افسران کا ذکر تم بھی ان سے کیوں کرو۔ یقین سے کچھ کہا بھی تو نہیں جاسکتا، کون تھے وہ۔" میرے کوئی جواب دینے سے پہلے وہ مجھ سے دور ہو گیا۔

میں نے یہ ظاہر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اسے جلدی تھی۔ اس نے مجھے موقع بھی نہیں دیا۔ اس کے جانے کے بعد در تک میں طرح طرح کے واقعوں میں گھرا گم کھڑا رہا اور جیسے کسی نے مجھے نوکا۔ اس مشفق ڈاکٹر نے ایک اور بات بھی تو کہی ہے۔ جس کے آگے تمام دور دراز اندیشے ثانوی ہیں۔ دوسرے لئے میرے پاؤں ٹھسل کے بستر کی جانب اٹھ پڑے۔ ٹھسل کے چہرے پر سکون کے آثار تھے۔ میں نے بہت دیر تک آواز میں اسے پکارا۔ اس کی پیشانی ٹھک اور ہلکوں میں جنبش ہوئی۔ ادھر سیورین نے آنکلی سے میرا شانہ تھپک کے مجھے منع کیا۔ مجھے اس کی مداخلت بہت بری لگی اور میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ کوئی اور سامنے ہوتا تو شاید میں اس سے جھگڑ پڑتا مگر وہ سیورین تھی، شاخ گل کے مانند، ذرا تیز آواز میں بات کرتے ہوئے ڈرگے، شاخ ٹوٹ نہ جائے، پھول کھلا نہ جائے۔

وہاں سے ہٹ کے میں صوفے پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد اپنے کاموں سے نمٹ کے وہ بھی میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ لمحوں تک چپ رہی پھر ہمک کے بولی۔ "آج تو آپ سے کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔"

میں نے مسکرائے کی کوشش کی اور اس شیشہ احساس نے یہ رعایت غنیمت جانی، پہلو بدل کے دل کیر لپیچ میں بولی۔ "کل رات اسپتال میں یہ کیا ہو گیا۔ انٹونی بے چارہ مارا گیا۔"

"تم جانتی نہیں اسے؟" میں نے پوچھا۔ "اسپتال میں بھی اسے جانتے تھے۔" اس نے ہاس بھری آواز میں بتایا۔ کل رات ہی تو ملتا تھا۔ ڈیوٹی ختم کر کے جا رہی تھی کہ آتنا سامنا ہو گیا۔ بہت منع کیا، نہیں مانا، بڑے دروازے تک مجھے پہنچانے گیا۔ بڑا دل چسپ، زندہ دل نوجوان تھا وہ۔ میری اس کی اچھی دوستی تھی، یوں یہاں وہ بھی کا دوست تھا۔ ہر کسی کے کام کے لیے تیار ہر وقت ہنستا، مسکراتا رہتا۔ کل رات وہ اتنا ہی زندہ تھا جتنا کوئی صحت مند اور خوش باش شخص ہو سکتا ہے..... ایک رات میں یہ کیا ہو گیا؟"

"ایک رات کیا، دوسرے مل کی خبر نہیں۔" میں نے فحی سے کہا۔ "بس یہی سمجھ ہے۔ کوئی ہم سے پہلے چلا جائے گا، کسی سے پہلے ہم چلے جائیں گے۔ پہلے کون، بعد کو کون۔ کچھ نہیں معلوم۔" انٹونی کی بیوی شیری میری رشتے دار ہے۔ خوب صورت، بڑی اچھی لڑکی۔ وہ دونوں کے دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں کے خاندانوں میں نزدیک دور کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ "سیورین آہ بھر کے بولی۔ "کیسی کہانی؟" میں نے جس سے پوچھا۔

"شیری کا باپ تھا اس عجیب ضدی طبیعت کا آدمی تھا۔ شیری کے بچپن میں اس کی ماں مری گئی۔ باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی پرورش کی اور دوسری شادی بھی نہیں کی۔ حسین ہونے کے ساتھ شیری بڑھی گئی اور بڑی سمجھ دار بھی۔ پھولی عمر میں اس کے رشتے آنے لگے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تھا اس بیٹی کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا، رشتے مسترد کرتا رہا۔ اس دوران ایک نوجوان شیری سے کچھ قریب ہو گیا

تھا۔ شیری بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ تھامس کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ شیری بے شادی کے لیے اس نے باقاعدہ درخواست کر دی تھی اور تھامس نے انکار نہیں کیا تھا لیکن اچانک ایک روز نو جوان ایسا غائب ہوا کہ آج تک نام و نشان نہیں ملا۔ اس کے والدین گیا گیا شہر میں رہتے ہیں۔ اب تو کئی سال ہو گئے ہیں۔ سنا ہے، آج تک بیٹے کی واپسی کی راہ تک رہے ہیں۔

”کیا شہر کا تھادہ؟ کیا نام تھا؟“

گیا کے نام سے میرے ہڑبڑا جانے پر سیورین نے چونک کے پوچھا۔ ”آپ کا تعلق بھی گیا سے ہے؟“

کیا ضروری تھا کہ میں اقرار کروں۔ میں نے اپنی آواز میں کہا کہ گیا شہر میں میرے عزیز رہتے تھے۔

سیورین ایک صاف دل لڑکی تھی، بھرا نہیں کی اور مجھے بتایا کہ اس نو جوان کا نام کلی فرز جون تھا۔ سب اسے جونی کہتے تھے۔

مجھے شبہ ہوا تھا کہ میرے اسکول اور کالج کے وقت کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ وہاں بہت سے عیسائی طلبہ تھے۔ جانے کیوں مجھے اس کا نام جاننے کی بے چینی ہوئی تھی۔ مجھے تو گیا چھوڑے ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔ میری دخل اندازی سے سیورین الجھ سی گئی۔

”پھر نہیں ملا وہ؟ یہاں بچے میں کیوں رہتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر شیری کی تعلیم کے لیے اسے یہاں داخلہ ملا تھا۔ یہ اسپتال بھی تو اسی کالج سے وابستہ ہے۔“

”پھر تھامس کے بچا زاد بھائی کے بیٹے کا رشتہ آیا۔ اس رشتے کے لیے تھامس پر بڑا دباؤ تھا۔ لڑکا اچھا تھا، تعلیم یافتہ، خوش شکل۔ خاندان بھی ایک ہی تھا، شیری اپنے ہی دوسرے گھر جاتی۔ تھامس ہاں یا

ناں میں جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ شاید سردی کی ایک رات لڑکے کے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس پاس کے کئی مکان لپیٹ میں آ گئے۔ لڑکے کے گھر سے پرے خاندان میں صرف اس کی ماں بچی جو بری طرح جھلس گئی تھی۔ چھ سات مہینے موت سے لڑتی رہی اور نہیں بچ پالی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کوئی شہادت نہیں بھی کہ تھامس اتنا ہولناک اور سفاک بھی ہو سکتا ہے، وہ بھی اپنے ہی خاندان کے لیے لیکن لوگوں کو وہم ہو گیا تھا اور شیری کے رشتے آنے بند ہو گئے۔ تھامس سے لوگ کنارہ کش ہونے لگے۔“

مجھے چپ دیکھ کے سیورین کو میری گراں خاطر کی احساس ہوا۔ وہ ٹھنک سی گئی۔ ”میں کیا داستان سے بیٹھی۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔ ”آپ بھی کیا کہتے ہوں گے۔“

”نہیں، بالکل نہیں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“ میں نے سنبھل کے کہا۔ ”پھر شیری، اتنی کو کس طرح ملی؟“

”وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔“ سیورین اداسی سے بولی۔

میں نے حیرت کا اظہار کیا تو میری غیر دل چسپی کی بدگمانی کہیں اس کے دماغ سے دور ہوئی۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں سن بھی رہا تھا اور جانے کہاں کہاں جھنک بھی گیا تھا۔

”بس کیا ہوا۔“ وہ کہنے لگی۔ ”ریاست رام پور کا کوئی نواب زادہ کسی کام سے پٹنا آیا تھا۔ شیری اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ نواب زادے نے کہیں اسے دیکھ لیا۔ شیری کے کوائف حاصل کرنا نواب کے لیے کیا مشکل ہوں گے۔ کسی طرح اس نے تھامس سے رابطہ کر لیا۔ یہ رابطہ دیکھتے دیکھتے گھر سے مراسم میں بدل گیا۔ تھامس کی خوش نوئی کے لیے نواب نے خفیہ تحائف کی بارش کر دی تھی۔ تھامس اتنا خوش حال تھا نہ ایسا بہ حال۔ ایک زمانے

نے وہ کئی بڑے گورے افسر کا معتقد تھا۔ سنا ہے، گورہ افسر اس کی ذہانت اور دیانت کا بڑا فائل تھا، حد سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے پٹنا کے نواح میں تھامس کو بڑا عاے میں گزر رہے کے لیے کچھ زوری زمین مل گئی تھی۔ افسر کی ترغیب ہوئی اور وہ کھلتے چلا گیا۔ اس نے تھامس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ تھامس نے معذرت کر لی۔ پٹنا اس کا آبائی شہر تھا۔ اپنے گھر سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں اس کی عزیز ترین بیوی رہتی تھی۔ دوسرے شیری تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کلکتا شہر کی گنجانی اور انفراتفری اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رہتی تھی۔ اسے اپنی شیری کا بھی خیال تھا، کھلتے میں وہ کہیں کم نہ ہو جائے۔ شیری اس کی زندگی تھی۔

نواب زادے کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ سنا ہے، اس کی جاہ و شہرت اور اثر و رسوخ سے تھامس بہت متاثر ہو گیا تھا۔ دونوں میرے شکار کو جانے لگے تھے۔ نواب زادہ باپ بیٹی کو اپنی ریاست اور زمینوں پر لے گیا۔ شیری کے کالج کی چھٹیاں انہوں نے رام پور اور بنی تال وغیرہ میں گزاریں۔ شیری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ نواب کی بہت عزت کرتا تھا مگر ایک دن نواب نے شیری کے لیے اپنے بے پناہ جذبات کا اظہار کر دیا اور منت کی کہ زندگی بھر کے لیے وہ شیری سے رفاقت کا آرزو مند ہے۔ نواب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ تھامس اپنی بیٹی کی جدائی کے خیال سے آزرده ہو جاتا ہے۔ نواب نے تھامس کو اپنے ساتھ رہنے، شیری کے لیے ایک الگ گھر، محل عیسایا ایک گھر بنانے کی پیش کش بھی کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ شیری اس کی پہلی اور آخری شادی ہوگی۔ تھامس کی کوئی شرط یا وہ کچھ اور تحفظ چاہتا ہو تو کھل کے بتائے۔ مہذب، نفاست پسند، خوش لباس، رفاقت و رفتار میں خوش ذوق، معصوری اور موسیقی کا دلدادہ، بے اندازہ دولت کا مالک اور نہایت منظم مزاج نواب زادے نے آکس نورڈ میں اعلیٰ

تعلیم حاصل کی تھی اور مشرق کی محبت میں ڈوب کے ولایت سے واپس آیا تھا۔ وجہ اور دل کش شخصیت کا حامل تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس کی رفاقت پر تیار نہ کرتی۔ نواب سے وابستگی ہر اعتبار سے بہتر زندگی کی ضمانت تھی۔ نواب کا حال یہ تھا کہ وہ شیری اور اس کے باپ کے آگے بچھا بچھا جاتا تھا۔ اپنی نوازشیں، اس قدر تپاک سے کوئی سنگ دل سے سنگ دل بھی پھٹل جاتا۔“

سیورین نے رک کے ایک نظر میری طرف دیکھا اور جیسے میرے انہماک سے مطمئن ہونے کے ذولی ڈوبی آواز میں کہنے لگی۔ ”شیری کو تو یقین تھا کہ اس بار اس کا باپ شاید انکار نہ کر سکے۔ تھامس نے یہ معقول غدر کیا کہ وہ عیسائی ہے اور رہے ہیں بھی نواب زادے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نواب نے کہا کہ اس کے مذہب میں عیسائی عورت سے شادی کی اجازت ہے اور وہ کوئی ایسا کٹر مذہبی آدمی بھی نہیں۔ شیری کو اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں کوئی اجنبیت نہ ہوگی۔ اسے شیری کے مذہبی معاملات و مشاغل سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ اسے شیری چاہیے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو وہ اپنی ساری دولت شیری کے نام کرنے کے لیے تیار ہے۔ نواب زادے کی تمام تر یقین دہانیوں اور خانتوں کے باوجود تھامس لیت و دل کرتا رہا۔ صاف انکار بھی اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ جتنا نواب سے کترانے کی کوشش کرتا، نواب کی شدت اتنی بڑھتی جاتی تھی۔ تھامس ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔“

سیورین کہہ رہی تھی۔ ”شیری نے اسے بتایا تھا۔ نواب چاہتا تو کسی اور طرح اس کے باپ کو مجبور بھی کر سکتا تھا۔ نواب کی ریاست، اس کے محل میں قیام کے دوران شیری اس کے زور و اثر کی شاہد تھی۔ خدام کی ایک فوج اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ نواب نے ایسی کوئی کارروائی نہیں کی۔ کچھ

اس وجہ سے بھی وہ نواب کا احترام کرنے لگی تھی۔ شیریں کے بقول، اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نواب کے ساتھ آنے والے دنوں کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے مگر اس کا باپ جانے کیا چاہتا تھا۔ شیریں کے لیے جانے اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ دنیا کا دستور ہے، بیٹوں کا گھر ماں باپ کا گھر نہیں ہوتا۔ پھر ایک روز تھامس کو کیا سوچیں۔ وہ شیریں کو ساتھ لے کے نکلتے چلا گیا اور چند روز بعد واپس آ گیا۔ نکلتے سے آنے کے بعد اس نے نواب سے ہاں کہہ دی اور شیریں کا تعلیمی سال مکمل ہو جانے تک کی مہلت مانگ لی۔

”پھر نواب باقی نہیں رہا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

سیوری کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئی۔

”آپ کو معلوم ہے؟“

”یوں ہی..... پچھلا سارا کچھ سننے کے بعد۔“ میں نے سر دھجکے میں کہا۔ ”اب یہ مت کہنا کہ ایسا ہی ہوا۔“

”مگر یہی ہوا۔“ سیوری بھی بھی آواز میں بولی۔ ”نواب کو اس کی زمینوں والے مکان میں کسی نے گولی مار دی۔ یہاں تو خبر بھی نہیں آئی لیکن بچنے میں نواب کے چند دوست تھامس اور اس کے روز افزوں مراسم سے واقف تھے۔ تحقیقات کرتے کرتے پولیس تھامس کے پاس آ گئی۔ نواب کی موت کے وقت تھامس، بچنے میں تھا۔ پولیس نے خاصا وقت صرف کیا اور کچھ حاصل نہ کر سکی۔ نواب زادے کا قفسہ جلد ہی پرانا ہو گیا۔“

”پھر یہ انتہی؟“ اس صورت حال میں انتہی کس طرح؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”کچھ، شیریں نے اپنے آپ سے نانا توڑ لیا۔“

سیوری نے آواز اور دھندلا گئی، کہنے لگی کہ شیریں نے بالکل اپنے آپ کو ترک کر دیا تھا۔ وہ خاموش خاموش رہنے لگی تو جوان لڑکیاں بہت خواب دیکھتی

ہیں۔ شیریں نے ساری کھڑکیاں دروازے بند کر لیے تھے۔ جب جب کالج جاتی اور گھر واپس آ جاتی کسی سے کوئی دم و راہ نہ رہتی۔ کالج کے ساگی جو بھی اس کی ایک نگاہ خوش انداز کے لیے بے قرار رہتے تھے، کچھ بچنے رہنے لگے۔ حسین لڑکیوں کے یوں بھی فسانے بن جاتے ہیں۔ آدمی نگاہوں کی زبان زیادہ سمجھتا ہے۔ کالج سے گھر، گھر سے کالج تک کئی کوچوں سے گزرتے ہوئے لوگوں کی نگاہوں سے واسطہ توڑتا ہی تھا۔ نواب کی موت کے بعد شیریں کئی روز تک کالج نہیں گئی تھی لیکن گھر بھی اسے کاٹ کھانے دوڑتا تھا، تعلیمی مصروفیات کا کوئی بہانہ تو بہر حال تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اور ایک روز انتہی دیواری طرح سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ دلیر، بے باک، سر پھرا انتہی مالی اعتبار سے کم تر تھا لیکن دل کا بڑا امیر۔ سیوری بیہوش کے بعد گریویشن کے لیے اسے شیریں کے کالج میں داخل دل گیا تھا۔ یہاں اس نے پہلی بار شیریں کو دیکھا اور پاگل ہو گیا۔

یہاں اس کے ساتھیوں نے اسے شیریں سے دور رہنے کی تلقین کی ہوگی۔ انتہی کی وارنٹیاں شیریں کو متاثر نہ کر سکیں۔ شیریں اپنے آپ سے بھی تو ڈرنے لگی تھی۔ جواں سال انتہی کو وہ اپنی بد قسمتیوں اور غریبوں کا حصہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ انتہی میں دل داری کی بڑی خوبیاں تھیں۔ شیریں کی مسلسل پہلو تھی، حد سے زیادہ بے حس بے دل برداشتہ ہونے کے بجائے وہ کچھ اور دیوانہ ہوا۔ شیریں نے ایک بار تو اسے بری طرح دھکا مار دیا تھا۔ حالانکہ یہ بھی دھندلی اس کے مزاج کے برعکس تھی۔ ثابت قدم انتہی، شیریں کو زندگی میں واپس لانے کی کوششوں میں بشار رہا۔

شیریں کو خود پر مسلط کیے ہوئے جبر سے تنہا تو بہت محسوس ہوتی ہوگی۔ جبر شعوری تھا۔ غیر شعوری طور پر کسی پناہ کسی سہارے کی ضرورت تو اسے محسوس ہوتی چاہیے۔ انتہی اپنے گداز، اپنے انکسار

پر واند وار غار کرتا رہا۔ شیریں کب تک اپنے آپ سے روٹتی رہتی۔ انکار کو بھی ایک تاب استقامت چاہیے۔ وہ تو ایک دل کیر، ایک ناتواں لڑکی تھی۔ اس نے انتہی کے آگے سر ڈال دی۔

سیوری کہہ رہی تھی کہ شیریں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ناکام ہونے کے لیے انتہی نے اس کی جانب پیش قدمی نہیں کی ہے اور وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح نہیں ہے، وہ تو کچھ اور ہے مگر جیسا کہ لوگ کہتے تھے، شیریں کا باپ، اس کا شفیق باپ! کوئی شہادت نہیں تھی کہ اس کا باپ ہی اس کی آرزوؤں اور خوابوں میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔ یہ محض ان ہونیوں کا ایک سلسلہ تھی جو ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ ایک تجربہ کار، ہوش مند اور بڑھاپا لکھا شخص ہے۔

شیریں کی ماں بچپن میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے بیروں چلنا سکھایا، وہ تو شیریں کے لیے ایک سایہ، کوئی ستون بنا رہا ہے۔ شیریں کی قسمت خراب ہے تو اس کے باپ کا کیا تصور۔ کوئی باپ، اور تھامس جیسا باپ اپنی بیٹی کے لیے کیا برا چاہ سکتا ہے۔ بے شمار ملی میز جوازوں کے باوجود شیریں کو بچپن بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے انتہی سے گزارش کی کہ بہتر یہی ہوگا کہ ان کے مراسم کے احوال سے تھامس بے خبر رہے۔ انتہی کے لیے یہی کیا کم تھا کہ اس کی کوشش رایگاں نہیں گئیں۔

شیریں کا پھر کسی طور پچھلا تو سہی۔ بالآخر اس کے اندھیرے وجود میں کوئی جوت بھی تو سہی۔

وہ ایک دوسرے سے ملنے رہے اور انہوں نے جانا کہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں، وہ تو کب سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔

وہی تو ایک دوسرے کی منزل ہیں۔ وہ انتہی ہی تھا جسے شیریں دھونڈ رہی تھی اور وہ شیریں ہی تھی جس کے بغیر انتہی ادھور تھا۔ یوں سوچے تو ہر کیا آدمی ادھور ہوتا ہے اور کوئی دوسرا ہی اس کا وجود مکمل کرتا ہے اور وہ دوسرا قسمت سے کسی کو ملتا ہے۔ کبھی

کسی کو کوئی نہیں مل پاتا اور زندگی یوں ہی اندھیرے پن میں گزر جاتی ہے۔

شیریں بھی سیوری کے کالج میں پڑھتی تھی۔ شیریں نے بہت بعد کو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں خاندانوں کا ریکی خاندانی تعلق تھا۔ شیریں کے کالج میں آ جانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئی تھیں۔ نواب کے سائے کے بعد شیریں، سیوری سے کنارہ کش رہنے لگی تھی۔ سیوری نے اس کی دل جوئی کی کوشش کی تو شیریں سر جھکا کے رو گئی۔ سیوری نے پہلے تعلیم مکمل کر لی تھی۔ کالج سے رخصت ہونے کے بعد وہ ایک دوبار شیریں سے ملنے اس کے گھر گئی لیکن شیریں نے بس جیسے پرانے تعلق کی رسم نبھائی اور سیوری نے اس کے گھر جانا بند کر دیا۔ وہ تو جب شیریں، انتہی سے وابستہ ہوئی تو اسے سیوری سے اپنی بے وضعی، بے سلوکی کا احساس ہوا۔ وہ خود سیوری کے گھر آئی اور دونوں میں جوش اور جذبے سے پرانا تعلق بحال ہوا۔

انتہی نے شیریں کی خواہش کے مطابق ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن کب تک! ایک روز توقع کے خلاف شیریں کی تعلیمی رپورٹ لینے کے لیے تھامس اپنے دوست، کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایسے وقت کالج پہنچا جب چھٹی ہونے والی تھی۔

شیریں اسے وہاں نظر نہیں آئی۔ دن کی آخری کلاس میں اسے کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔ پرنسپل سے ملاقات کے بعد تھامس اسے تلاش کرتا ہوا کالج کے اس گوشے میں جا نکلا جہاں شیریں اور انتہی ایک دوسرے میں گم تھے۔ تھامس نے دور سے انہیں دیکھ لیا تھا مگر وہ ان کے قریب نہیں گیا۔ شیریں اور انتہی کو کچھ احساس نہ ہوسکا کہ تھامس ان کا گھر اسے۔ کوئی اور باپ ہوتا تو وہاں سے چلا جاتا لیکن وہ تھامس تھا۔ وہ ان دونوں کے باہمی روابط کا اندازہ کرنے کے لیے اپنی جگہ ٹھہرا ہوا پھر آہستہ آہستہ ان کے پاس گیا۔ اسے سر پہ کھڑا دیکھ کے دونوں ہڑبڑا

گئے۔ تھامس نے ان سے کچھ نہیں کہا، ایک لفظ بھی۔ وہ شیر کی کوساٹھ لے کے گھر چلا گیا۔ شیر کی نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ دونوں باپ بی بی نے ایک دوسرے بھی اوچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ دوسرے دن تھامس نے شیر کی کو کالج جانے نہیں دیا لیکن خود کالج جا کے پرنسپل سے انھونی کو کالج سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ انھونی کو کالج سے نکال دینے کا جواز بنتی۔ پرنسپل نے انھونی کو متنبہ کرنے کا وعدہ کیا۔ تھامس نے پھر خود شیر کی کے ساتھ کالج آنا چاہا شروع کر دیا۔ وہ کالج چلنے اور بند ہونے تک اس پاس منڈلاتا رہتا۔ عین وقت پر شیر کی کو گھر لے جانے کے لیے کہیں سے نمودار ہو جاتا۔ اس نے شیر کی کو پھر ہڈی ہال کر دیا تھا۔ شیر کی نے کسی ڈر لینے سے کچھ غرمے کے لیے انھونی کو دو دور دور رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ انھونی کچھ دنوں تک تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے جرات کی اور ایک شام تھامس کے گھر پہنچ گیا اور اس نے کسی رو و قذح کے بغیر شیر کی سے چٹائی کا دعوا کر دیا۔ تھامس نے تمام تر بردباری اور تحمل سے سنا اور کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ انھونی نے اسے جتلیا کر شیر کی کی مرضی بھی یہی ہے۔ ان دونوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کیا ہے اور وہ شیر کی کے حصول کے لیے کچھ بھی کر کر سکتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ تھامس ان دنوں کی خوشی کی خاطر ہاں کر دے۔ انھونی کا تیور سرکشانہ تھا۔ تھامس کو یقیناً ناگوار ہوا ہوگا۔ جواب میں اس نے مناسبت سے کہا کہ اسے سوچنے کا وقت دیا جائے۔ انھونی کے پاس کیا چارہ تھا۔ وہ چھپے اور منچے سے تو تھامس سے اقرار نہیں کر سکتا تھا، دوبارہ آنے کا کہہ کے ناشاد و نامراد واپس چلا آیا۔

شیر کی بہت خوف زدہ بھی کہ اس کے باپ نے ایک بار پھر مہلت طلب کی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اس نے اپنی راز داں سیوریوں کے توسط سے انھونی

کو اپنا خیال رکھنے کی تاکید اور سردست خاموش رہنے کی اجازت کی۔

انھونی نے اس کے بعد صبر آزمائی و ادبت گزارا۔ تھامس غرمے سے سرکاری ملازمت میں تھا اور اپنے گھر سے افسر کا ٹکٹے تبادلہ ہو جانے کے بعد اس نے طویل رخصت لے لی تھی۔ پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں اس کا اچھا اثر و رسوخ تھا۔ کبھی واقف تھے کہ پٹنے میں ایک مدت سے تعینات گورے افسر کا وہ کس قدر پسندیدہ ماتحت تھا۔ تھامس نے انھونی کو کالج سے نکلوانے کی کوشش جاری رکھی اور نا کام ہوتا رہا، البتہ پرنسپل کو مجبور کر کے شیر کی اور انھونی پر طرح طرح کی سختیاں، پابندیاں عائد کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ پرنسپل نے دونوں کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر آئندہ شیر کی کے باپ تھامس کو کوئی شکایت ہوئی تو دونوں کو کالج سے فارغ کر دیا جائے گا۔ دونوں دور دور سے بس ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دیکھتے رہ جاتے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے، وہ قریب بھی نہیں آتے۔ ان کے گھر سے رابطہ ضبط پر تھمکا جانے والے کالج کے بعض شورہ پیش طالب علم ساتھیوں کو انھیں ستانے اور زچ کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ دونوں کی تعلیم متاثر ہونے لگی۔ کالج میں ان سے ہم دردی رکھنے والے دوست بھی تھے۔ ان کے ذریعے برائے نام نامہ و پیام کا سلسلہ ممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو آتماش کا یہ وقت گزر جانے کا آسرا دلاتے اور اپنے غزم، اپنے عہد کا اعادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی ناقص درسی کارکردگی پر ایک دن پرنسپل نے دونوں کو الگ الگ طلب کر کے سخت کہا لیکن دونوں کا کہیں دل نہیں لگتا تھا، کلاس میں، کتابوں میں، گھر میں، نہیں بھی۔ دونوں کو گروڈ پیش کا کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ دور ہو جانے کے بعد وہ ایک دوسرے کے اور قریب ہو گئے تھے۔ چھٹیاں ہوئیں تو اور قیامت

آگئی۔ شیریں گھر میں بند ہو گئی۔ کالج میں دید و باز دیکھ کر ایک رعایت تھی، وہ بھی نہ رہی۔ ناچار انتھونی نے شیریں کے گھر کے گرد چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ہمیں کسی کھڑکی، روزن، کسی اوٹ سے شیریں کی ہنسل دکھائی دے جائے۔ انتھونی، محلے والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ تھامس کی شکایت پر پولیس اسے تھانے لے گئی۔ پولیس کو جواز فراہم کرنے کا ہنر آتا ہے اور سوخون بھی محاف ہوتے ہیں۔ کئی دن تک وہ جو رستم کی مشق کرتے رہے، کئی دن تک انتھونی نے انتھونی کو روکے رکھا اور ایسی حالت کر دی کہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کئی دن لگ گئے۔

انتھونی اپنے آپ سے مجبور تھا۔ اس نے پھر حوصلہ کیا۔ اسنے آزار اور رسوائیوں کے بعد تھامس اسے اپنے گھر دیکھ کے حیران و پریشان تو ضرور ہوا ہو گا لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا اور سنجیدگی و سرد مہری سے پھر انکار کر دیا۔ اس مرتبہ اس نے وجہ بھی بتائی کہ انتھونی اس کی ماہ جمال بیٹی کے لیے کسی طور اہل نہیں ہے۔ پہلے وہ کچھ کر کے دکھائے، تعلیم حاصل کرے۔ ابھی ملازمت یا کوئی معقول کاروبار کرے تب تھامس کے پاس آئے، تھامس ہم دردی سے غور کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ بڑی کڑی شرطیں تھیں۔ دیوانوں سے کہا جائے کہ وہ ایسے ہی دیوانگی چھوڑ دیں۔ دیوانگی کا سبب بھی تو پہلے دیکھا اور دور کیا جائے۔ مایوسی میں انتھونی ہوش و حواس سے اور بے گانہ ہونے لگا۔ بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کے اس کے باپ نے تھامس کی خدمت میں خود حاضری دی اور تھامس کو راضی کرنے کے لیے پٹنا کے کئی بااثر لوگوں کو بھیج دیا۔ وہ لوگ تھامس کے پاس گئے اور انتھونی کی شرافت، سچائی، دیانت، جواں سانی اور شیریں سے اس کی وابہانہ شینگی اور شیدائیت کے واسطے دیے۔ تھامس اس سے مس نہ ہوا۔

کالج کھلنے پر انتھونی اور شیریں نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ تھامس کا وہی معمول تھا۔ صبح بیٹی کو کالج پہنچانے جانا اور کالج بند ہو جانے پر ساتھ لے جانا۔ شیریں اور انتھونی کی حالت سے متاثر ہو کے ان کے چند قریبی دوستوں نے کالج کے اوقات کے دوران دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ شیریں اور انتھونی بہت سہ چکے تھے۔ اب انہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کا پارا نہیں تھا۔ ساتھیوں کے تعاون سے وہ کسی طرح ایک دن کالج سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

پھر تھامس کی بار انتھونی، شیریں کے ساتھ تھامس کے گھر گیا اور اس نے بتایا کہ انہوں نے چرچ میں شادی کر لی ہے۔ بہتر ہے، تھامس خوش دلی سے انہیں قبول کر لے۔ شیریں ثواب انتھونی کے ساتھ اس کے گھر جا رہی ہے، اپنے گھر، جواب اس کا اصل اور مستقل گھر ہے۔ ماں باپ کے گھر سے ہر لڑکی کا تعلق عارضی ہوتا ہے۔

تھامس تنگ رہ گیا، کچھ نہ کہہ سکا، پاس بھری، حسرت بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا کیا۔ شیریں کی خاموشی اس کے لیے اور تازہ پانہ ہوئی۔ شیریں، انتھونی کے گھر آگئی۔ دونوں کو توقع تھی کہ اب تھامس کی باری ہے، وہ اپن کے پاس ضرور آئے گا اور آخر کار ان پر اپنی سختییں ارزاں کرے گا۔ وہ نہیں آیا۔ دو تین روز ہی گزرے ہوں گے انہیں معلوم ہوا، تھامس ختم ہو چکا ہے۔ اس نے خود کو آگ لگا لی تھی۔ اس کے ساتھ مکان کا کچھ حصہ بھی بل گیا ہے۔ جس وقت بڑی پینچ، مکان تو انہوں نے بچایا، تھامس کو نہ بچا سکے۔

شیریں کو اپنے باپ سے ایسی سفاکی کی امید نہیں تھی۔ وہ تو ذہیر ہو گئی۔ وصیت کے مطابق، آبائی مکان، زرعی زمین، نقدی کی شکل میں عمر بھر کی تنخواہ، شیریں کی ماں کے زیورات، سارا کچھ چرچ کے نام، چرچ کی نذر کر دیا گیا تھا۔ پادری کو علم تھا

کہ شیریں، تھامس کی اکلوتی اولاد، وہی اس کی جائیداد کی اصل وارث ہے اور شیریں کے سسرال کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہے، شیریں کچھ بھی ساتھ لے کے سسرال کے گھر نہیں گئی ہے۔ اسے اختیار تھا وہ تھامس کا عہد قبول کر لے یا مسترد کر دے۔ اس نے آدمی ملکیت شیریں کو واپس کرنا چاہی۔ شیریں نے پادری کی پیش کش منظور نہیں کی۔ پادری نے اپنے نائبین سے صلاح و مشورہ کر کے تمام تر جائیداد شیریں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیریں نے اسے بھی مسترد کر دیا اور انتھونی کے ساتھ حسرت کی زندگی کو ترجیح دی۔ اب انتھونی کے جانے کے بعد گھر میں صرف ایک مرد رہا ہے، انتھونی کا چھوٹا بھائی، اور وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔

مجھے کیا کہنا چاہیے تھا، کچھ نہیں معلوم تھا۔ سیوریہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ آنسو بڑی راحت ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں تو آنسوؤں سے بھی عاری نہیں۔ ایسا لگتا تھا، جیسے سیوریہ نے جان بوجھ کر مجھے ہکھ بھلا نا چاہا ہو۔ میں اس سے کیا کہتا، ایک انتھونی اور ایک شیریں کیا، جانے کتنے ایسے ہی بس ایک آدمی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی، وہی مستعد، وہی محور، وہی منزل۔ ہر راستے میں انہیں وہی ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ ایک آدمی نہ ملے تو کیا مال و زر، کیا طاقت و اقتدار، کیا علم و ہنر، سب بچ، سب بچہ، سب مٹی ہے۔ ایک آدمی ہی سبھی مٹی کے لیے سب سے بڑا خزانہ ہوتا ہے۔ وہ خزانہ مل جائے تو اسے اپنی زندگی مل جاتی ہے، اسے دنیا مل جاتی ہے۔ ایک آدمی، ایک آدمی کا حاصل، باقی سارا کچھ بے معنی ہے، بے جواز، لا حاصل۔ ایسا کیوں ہے اور کیا ہے یہ سب کچھ۔ یہ کچھ وہی جانتا ہے جو اپنے مطلوب کے زنداں کا امیر ہے اور مطلوب اس کے زنداں کا۔ وہ جو دو آدمی، الگ چہروں، الگ رنگوں کے نظر آتے ہیں، وہ تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا

ناکمل، پہلا بھی ناکمل، دوسرا بھی ناکمل۔ ان کی تکمیل یک جہتی کی صورت ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ "شیریں تو مر جائے گی۔" سیوریہ بین بستی آواز میں بولی۔ "اس کا ثواب کوئی نہیں رہا۔ وہ تو لٹ گئی ہے۔"

"تم۔۔۔ تم اس کے پاس جاؤ تو کہنا کہ زندگی یہی تماشا، یہی سجدہ بازی کرنی رہتی ہے۔ کچھ نیا نہیں ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔"

"تمہیں تو زیادہ سے زیادہ اس کے پاس ہونا چاہیے۔" "میں چلی بھی جاتی لیکن ڈاکٹر رائے۔۔۔ وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ کچھ بھی ہو جائے، زمین مل جائے، آسمان پھٹ پڑے، ان کا حکم ہے کہ ڈیوٹی پر حاضر رہو۔" سیوریہ بین باتوالتی سے بولی۔ "اور ان سے اجازت لے بھی لیتی تو وہاں جا کے کیا کرتی، شیریں سے کیا کہتی، اسے کیا دلا سادہائی کہ انتھونی واپس آ جائے گا۔"

"کوئی واپس نہیں آتا مگر جو لوگ موجود ہیں، جو اپنے ہیں، وہی دیکھ درد جاتے ہیں۔ ان کی موجودگی بھی دلاسا ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر رائے ایسے سخت آدمی بھی نہیں ہیں۔"

"مگر میں۔۔۔ مجھ سے شیریں کی حالت دیکھی نہیں جائے گی۔ میں نے وارڈ بوائے سے پوچھا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ تو کچھ ہلکتی ہے نہ سنتی ہے، نہ پھینکے ہوئے کھاتی ہے۔ کسی کو پہچان نہیں رہی ہے، وہ تو۔۔۔" سیوریہ بین پھر سسکتے لگی۔ "یہ انتھونی۔۔۔ کیا ضرورت تھی اسے ان لوگوں کا پیچھا کرنے کی۔ بالکل پاگل۔۔۔ پاگل آدمی تھا وہ۔"

میں چپ رہا۔ "شیریں کے لیے انتھونی، تھامس کو پسند نہیں تھا۔ جو تھامس کو پسند نہیں آتا تھا، اس کا بھی انجام

ہوتا تھا۔ تھامس کی روح تو بے کھل ہوگی۔“
سیورین نے سارا الزام روح پر ڈال دیا تھا۔
یہ روح کا عذر بھی انسانوں نے خوب وضع کر لیا
ہے۔ اسے کیا معلوم تھا، جس ایسی جانتی تھی کہ وہ
لوگ، رات کے آخری پہر آنے والے لوگ کس
ارادے اور کس تعاقب سے آئے تھے۔ انھونی تو
چارابن گیا۔ میں اسپتال میں نہ ہوتا تو وہ لوگ اس
طرف کا رخ کیوں کرتے۔ انھونی میں بڑا جوش اور
جذبہ تھا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی جگہ میں
ہوتا تو یہی کرتا۔

”تم شیری کے پاس جاؤ تو.....“

میری بات پوری ہونے سے پہلے سیورین
ڈوٹنگی آواز میں بولی۔ ”ہاں میں جاؤں گی اس کے
پاس..... مجھے جانا ہی ہوگا۔“

”اس سے کہنا کہ انھونی واپس نہیں آسکتا۔
انھونی کی دو بہنوں اور بھائی کی ذمہ داری ہے اس
پر۔ وہی اب گھر سنبھال سکتی ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی
لڑکی ہے۔ اور.....“

”مگر شیری کے پاس اب کیا رہا ہے۔“
سیورین مایوسی سے بولی۔ ”کچھ بھی نہیں بچا۔“
”ایک بات کہوں تم سے؟“ میں نے آہستگی
سے کہا۔

”ہاں ہاں۔ وہ بے تابی سے بولی۔
”ایک صورت ممکن ہو سکتی ہے۔ جو میں کہنا
چاہتا ہوں، اسے غور سے سننا اور پہلے سن لینا، پھر
کچھ کہنا۔“

”کیا بات ہے؟“ وہ ہر بڑا سی گئی۔
”شیری کو زندگی گزارنے، یہ برا وقت نالنے
کے لیے اتنی رقم دی جا سکتی ہے کہ اسے کوئی پریشانی
نہ ہو۔ یہ اسپتال کا مکان بھی اس سے بچھن جائے
گا۔ کیوں کہ انھونی کے چلے جانے کے بعد وہ یہاں
زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ وہ دنیا مکان خرید لے۔ کم از کم
آئندہ پانچ سال تک کے لیے اس کی بہتر گزر بسر کا

انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس مدت میں وہ یقیناً اس
قابل ہو جائے گی کہ اپنے آپ بھی کچھ کر سکے، اپنی
ادھوری تعلیم مکمل کر سکے۔ انھونی کے چھوٹے بھائی
کی تعلیم، اس کی بہنوں کی شادی کر سکے۔ یہ مالی قسم
کے سہارے بڑی تسلیم ہوتے ہیں۔ ذرا اس کی
حالت سمجھنے تو اسے یہ بتا دینا اور میرا نام کسی طور نہ
آئے تو مناسب ہوگا۔ یہ رقم کسی وقت بھی ادا کی
جا سکتی ہے۔ باقی شیری اور اس کے خاندان کو کسی
اور چیز کی ضرورت ہو تو کسی ذریعے سے مجھے مطلع
کیا جا سکتا ہے۔ میرے دوست اکبر علی خاں بچنے ہی
میں رہتے ہیں، وہی جن کے ساتھ دو پہر ہم نے
کھانا کھایا تھا۔ وہ ایک بڑے وکیل ہیں اور بہت
نفیس آدمی۔ میری درخواست پر وہ شیری اور اس
کے گھر کی ضرگیری کر سکتے ہیں، اگر تم اس معاملے
نے اگک رہنا چاہو۔“

سیورین مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔
”مجھے شبہ ہے، ایک خود دار لڑکی کو یہ سارا کچھ
قبول کرنے میں تامل ہوگا مگر اسے یقین دلانا تمہارا
کام ہے کہ میری کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں
ہے۔ میں تو یہاں رہوں گا بھی نہیں۔“ میں نے
کہا۔ ”وہ آمادہ ہو جائے تو مجھے خوش ہوگی۔ اس
بد نصیب سے کہنا کہ کوئی بھی ایسی اعانت انھونی کے
نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی مگر اب انھونی نہیں
ہے۔ اس کے بغیر زندگی تو گزارنی ہے۔ اور سنو!
شیری سے ہم دردی اپنی جگہ ہے لیکن یہ میرے اپنے
اعمینان، اسے سکون کی بات ہے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ سیورین سراپہ
انداز میں بولی۔
”تم نے جو سنا، وہی میں نے کہا۔“ میں نے
نہی کی آواز میں کہا۔

سیورین آگے کچھ نہ بول سکی اور مجھ سے بھی
کچھ نہ کہا جا سکا۔

اس سے پہلے کہ سیورین مجھ سے غیر ضروری

سوال کرتی، ایک نظر ٹھٹھل کود کچھ کے میں کمرے
سے باہر آ گیا اور اسپتال کے مرکزی عمارت تک چلا
گیا۔ شام کو مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع
ہو چکا تھا۔ صدر دروازے سے مریضوں کے
دوست اور اعزاء کے دستے اسپتال میں داخل
ہو رہے تھے۔ عمارت کے سامنے کے سبزہ زار میں
دو پہر فٹسی بھیڑ نہیں تھی۔ انھونی کی تدفین میں
شریک ہونے والے اب وہاں نہیں تھے۔ انھونی کا
جنازہ اٹھایا جا چکا ہوگا۔ ممکن ہے، انہوں نے اسے
خاک کے سپرد بھی کر دیا ہو۔ مجھے یاد نہیں، کہیں بڑھا
تھا، جو کچھ اس دنیا میں نظر آتا ہے، سب مٹی کی شکنیں
ہیں۔ اپنی عمر پوری کرنے کے بعد ساری شکنیں مٹ
جالی ہیں اور سب مٹی ہو جاتا ہے۔ اور کسی نے کہا
تھا، آدمی کی ساری زندگی فریب کی زندگی ہوتی ہے،
زندہ رہنے کا فریب، دیکھنے، سننے اور بولنے کا
فریب۔ جس کا انجام فنا ہے، اس کا دیکھنا، سننا اور
بولنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سب سنا ہوا مٹی، سارا دیکھا
ہوا مٹی، سارا بولا ہوا مٹی ہے۔ انھونی مر گیا۔
لو جوانی میں مر گیا۔ کچھ اور وقت زندہ رہنا تو بھی
مر جاتا۔ لوگ اسے دفن کے قبرستان سے لوٹ رہے
ہوں گے۔ انہیں چلدی بھی ہوگی زندگی کی طرف
لوٹنے کی۔ جانے کتنے ادھورے کام یاد آ رہے
ہوں گے۔ قبرستان سبھی کو برا لگتا ہے حالانکہ
سارے راستے اسی کی طرف جاتے ہیں قبرستان یا
ششمان لگات یا برج خوشاں یا کوئی اور۔ وہی ایک
سوال، آدمی پیدا کیوں ہوتا ہے کہ مر جاتا ہے۔ کسی
کے پاس اس کا جواب نہیں۔ موت پر سب کا انتظام
ہو، اس زندگی پر کیا ناز، کیسا افکار، کس بات کی
محنت، زندگی سے بڑا طلسم شاید کوئی نہیں، اور کوئی
طلسم مستقل نہیں ہوتا۔

مرکزی عمارت سے دائیں طرف راہ داری
میں جاتے ہوئے مجھے چند پولیس والے بھی نظر
آئے۔ وہ ابھی تک اسپتال کے کونے کونے ٹول

بازی گرا 143

رہے ہوں گے۔ کتنے ان سے زیادہ چست ہوتے
ہیں، بوسوگھ تو لیتے ہیں۔ ان کی نظروں میں آنے
سے میں نے پہاڑ بھی کی اور ادھر ادھر گھومتا رہا۔ میرا
دل گھبرا رہا تھا۔ جانے کیوں، جیسے میں کچھ بھول رہا
ہوں، مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہو، کچھ ہونے والا
ہے جیسے۔ دھوپ کے آثار رہ گئے تھے کہ میں کمرے
میں واپس آ گیا اور یہ دیکھ کے مجھے اپنی آنکھوں پر
یقین نہیں آیا۔ ڈاکٹر رائے اور ایک نوجوان ڈاکٹر
ٹھٹھل کے بستر کے گرد موجود تھے اور ٹھٹھل بیٹھا ہوا
تھا۔ بستر کے سرہانے، تکیوں سے ٹیک لگائے،
آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، سیورین جیسے سے اسے کوئی
مشروب پلا رہی تھی۔ میں جھپٹتا ہوا ان کے پاس
پہنچا۔ ٹھٹھل نے نگاہیں گھما کر ایک ٹاپے کے لیے
مجھے دیکھا اور نقاہت سے نظریں جھکا لیں۔ میرے
جی میں آیا، ڈاکٹر رائے کے ہاتھ چوم لوں، کس
طرح اس سے ممنونیت کا اظہار کروں۔ ڈاکٹر رائے
ٹھٹھل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور ٹھٹھانی
آواز میں اس کی استقامت کی داد دے رہا تھا۔ معا
اسے خیال آیا اور اس نے ہندوستانی میں کہا۔ ”تم
ایک اچھا لڑکا (جنگ باز) ہے، بہت اچھے، بہت
اچھے۔ اپنے بھائی کو دیکھا؟ اسے اب بھی شبہ
ہے۔“ آخری جملہ اس نے پھر انگریزی میں کہا۔
ٹھٹھل کو جواب دہی کا پارا نہیں تھا لیکن اس کا
چہرہ میرے سامنے تھا۔ چہرہ تیار ہوا تھا کہ وہ سب کچھ
سن رہا اور دیکھ رہا ہے۔ جس سیورین بہت توجہ اور
نفاست سے اسے مشروب پلا رہی تھی۔

”کیا حال ہے اب؟“ میری آواز ساتھ نہیں
دے رہی تھی۔ ٹھٹھل نے سن لیا تھا، آنکھوں پر
سے اطمینان کی تکیوں کی۔ ”ٹھٹھل تو ہوم؟“ میں نے
ہذیبی انداز میں پوچھا۔

ٹھٹھل نے ڈاکٹر رائے کو اشارہ کیا تھا یا ڈاکٹر
ٹھٹھل کو کسی افسر اب سے دو چار کرنا نہیں چاہتا تھا،
میرا بازو پکڑ کے وہ مجھے اس کے بستر سے دور لے

بازی گرا 144

آیا۔ ڈاکٹر کی ناراضی کے خیال سے میں نے بہ جبر قبول کی۔

ڈاکٹر رائے دروازے کے پاس آ کے رک گیا اور اس نے پلیٹ کے سیورین کو ہدایت کی کہ وہ نھل کو دوبارہ لٹا دے۔

سیورین نے پیٹا گھما کے بستر کا سر حانا نیچے کر دیا۔

ڈاکٹر رائے پھر میری طرف متوجہ ہوا اور پچھتی آواز میں بولا۔ ”کہاں تھے تم اتنی دیر سے؟“

”نہیں نہیں، یہیں اسپتال میں۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسے ہی اسپتال کا ایک چکر لگا کے آ گیا۔ کیا حال ہے اب ان کا ڈاکٹر صاحب؟“

”تم نہیں دیکھ رہے؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

”مجھے تو..... مجھے تو.....“ میں نے بے رطلی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ فرشتہ آدمی ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں.....“

”تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔“ وہ ہمیری بات کاٹ کے بولا۔

”آپ کو معلوم نہیں، میں..... میں کس قدر.....“

اس نے پھر مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔ دیکھ رہا ہوں تمہیں اچھی طرح اچھے لڑکے۔“

اس نے عادت کے مطابق میری کمر جھکی۔

”رات کو آؤں گا پھر..... اور سناؤ! نہیں پہلے سے بہتر دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ تمہیں بھی انکیشن لگانا پڑے گا۔“

”ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ دیر بیٹھیں نا۔“ میں نے دائرہ لگی سے کہا۔

”نہیں، مجھے جانا ہے، اسپتال میں سب سبے ہوئے ہیں، مجھے معمول سے زیادہ وقت دینا پڑ رہا ہے اور اٹھوٹی! اس نوجوان کے گھر بھی جانا ہے۔ سنا ہے، اس کی بیوی ٹھیک نہیں ہے، وہ حاملہ ہے،

دیکھتے ہیں، اسے شاید اسپتال میں داخل کرنا پڑے۔ بے چارہ اٹھوٹی۔“ ڈاکٹر رائے افسردگی سے بولا۔ ”تم نہیں جانتے، وہ کتنا پیارا لڑکا تھا۔“

مجھ سے سر اٹھایا نہیں گیا۔ ڈاکٹر رائے اپنے نوجوان ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سیورین کسی موج کی طرح میری طرف لپکی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، شگفتہ آواز میں مبارک باد دیتے تھی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا، اپنا اختیار ہی نہیں رہا۔ میں نے بڑھ کے ہاتھ پھیلائے اور اسے گلے سے لگالیا۔ دوسرے ہی لمحے سیورین کی کسمپاس سے مجھے احساس ہوا۔ میرے بازو اٹھنے لگے اور میں فوراً اس سے جدا ہو کے پیچھے ہٹ گیا۔

سیورین کے چہرے پر اپنا ک آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور اس کا دھان پان سراپا لہرا گیا تھا۔ مجھے بڑی سخت ہوئی اور سیلف سے معافی بھی نہ مانگی جاسکی۔

وہ ایک اعلا طرف لڑکی تھی، مسکرا کر رہ گئی اور مجھے ہدامت سے بچانے کے لیے کہنے لگی۔ ”کیا خیال ہے، گر باگرم کافی پی جاتے۔“

میں نے کسی پائل کی طرح بے تابانہ سر ہلا کے اقرار کیا۔

نرس ایکی وقت پر آ گئی تھی۔ سیورین چلی گئی، ایکی کی آمد کے خاصی دیر بعد نھل کے دن بھر کے احوال، ڈاکٹروں کی آمد اور ہدایات، روادوں کی تبدیلی سے آگاہ کرنے کے بعد۔ چلتے وقت اس نے مجھ شرم سار کو خدا حافظ کہا اور اپنا خیال رکھنے کی رسمی نصیحت بھی کی۔ میں خالی بیٹھا تھا، اسے صدر دروازے تک پہنچانے کا خیال آیا تھا لیکن میرے قدم کسی نے روک لیے۔

”آٹھ بجے، رات پوری طرح کھل چکی تھی۔ ایکی جھٹ پٹ اپنے کاموں سے صحت کے میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور ٹیلی آواز میں بولی۔ ”کیا حال ہے

اب؟“

میرا حال کیا، میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا ہوا ہے۔“ میں نے نھل کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ”حال تو ان صاحب کا دیکھو، ان سے پوچھو۔“

”تمہارا حال اس سے بندھا ہوا ہے۔“ وہ چمک کے بولی۔ ”تم دونوں ہم زاد ہونا۔“

”تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔“ میں نے مصنوعی زحشی سے کہا۔

”میں نے سارا کچھ دیکھ لیا اور سیورین نے مجھے بتایا ہے، سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ ایکی مخاطب انداز میں باتیں کرتی تھی، کہنے لگی۔ ”اب اور بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔“

”شکر ہے، تم بھی پر امید ہو۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔

”تم نے ویسا کیوں کہا۔“ اس کی تیوری پر ہل آگئے۔ ”تم سے میں نے کہا تھا، میں ہمیشہ پر امید رہتی ہوں۔“

”مگر اظہار میں خاصی سنجوس ہو۔“ میں نے اندازہ لطف کہا۔

”اوہ..... اوہ، تم شرارتی بچے۔ اب تم کسی بدلی بدلی باتیں کر رہے ہو۔“ وہ میرے شانے پر آہستہ سے مکا مارے ہوئے بولی اور اچانک سنجیدہ ہو گئی، کہنے لگی۔ ”معلوم ہے، دن بھر میں پریشان رہی ہوں۔ رات کا واقعہ کیا ہوں تاک تھا۔ دن بھر تمہارا خیال رہا، پھر تم کسی مصیبت میں نہ گھر جاؤ۔ آتے ہی میں نے سیورین سے غیریت دریافت کی۔ اس نے ایسا ویسا کچھ نہیں کہا تو سکون آیا۔ تم تازہ پھر کوئی ادھر آیا تو نہیں۔“

”ابھی تک تو نہیں، اسپتال میں پولیس بیٹھی ہوئی ہے اور خاک چھان رہی ہے۔“ میں نے تندہ سے کہا۔

”تمہارے پاس تو نہیں آئے وہ؟“ ایکی نے

فکرمندی سے پھر وہ کی۔

”نہیں آئے تو آ جائیں گے۔ اس طرف، ان خاص کمروں کی طرف، رخ کرتے ہوئے ان کے قدم اکڑتے ہوں گے۔“

”تم نے سیورین کو تو کچھ نہیں بتایا؟“

”اسے کیوں پریشان کرنا، وہ تو تمہاری دشت دور کرنے کے لیے تمہیں سارا ماجرا بتانا پڑا۔“

”تم نے اچھا کیا ورنہ کیسے کیسے دوسوں، وہم دگمان میں گھری رہتی۔ ایکی کو بھر جھری آگئی۔

”دن بھر سو جی رہی، اگر مجھ سے غلطی ہو جانی، دروازہ کھول دیجی میں؟“

”نہیں کھولیں تم۔“

”اتنے یقین سے تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”چوں کہ میں جاگ رہا تھا۔“

”اور اگر دروازہ کھلا ہوتا؟“

”وہ ایسے اندر نہیں آ جاتے، پہلے پوچھتے ضرور۔ ان کی نیت بھرمانہ تھی۔ ایسی صورت میں پھونک پھونک کے قدم اٹھایا جاتا ہے۔“

”لیکن..... لیکن.....“ ایکی کی آواز پر خوف غالب تھا۔ ”بس خداوند نے کرم کیا، میں تو یہی کہتی ہوں۔“ اس نے سینے پر کراس بنایا۔

”چھوڑ دو بھی اب، کچھ مت سوچو۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”آگے کی طرف دیکھو۔“

”آگے کی طرف! ایکی کا چہرہ اور گھیسر ہو گیا۔ ”آگے کا ہی تو سوچ سوچ کے دل ہولنا ہے۔“

”اور کیا اختیار ہے ہمارا آگے پر؟“

”خاطر ہے، نہیں ہے۔“ ایکی اظہاری انداز میں بولی۔ ”تو فکر کا ہے کی، ہم اپنی طرف سے احتیاط کی پوری کوشش کریں گے۔ یہی کر سکتے ہیں۔“

”تم بہادر بچے ہو۔“

”بہادر دہادور کیا۔ ہتھیلی پر جان تو ہوں بھی ہر ایک کی رہتی ہے، میری تمہاری، سبھی کی۔ تمہیں یقین سے کہ کل تم موجود ہوگی؟“ اس کی آنکھیں بچھ ہیں۔

”تو پھر کیا.....“ میں نے بے زاری سے کہا۔

وہ چپ ہوئی اور دیر تک چپ رہی، پھر اس نے خود کو جمع کیا کہ سر دست تو زندگی جاوگی گی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بچال ہوئی اور وہ پختہ کار عورتوں کی طرح ترپھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تم نے سیورین پر کیا جادو کر دیا؟“ ”کیسا جادو؟“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”خبر ہے، وہ کیا کہہ کے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، یہاں دوسری ہیں۔ حکم دے کے گئی ہیں کہ مجھے دونوں کا خیال رکھنا ہے۔ دونوں پر نگاہ رکھنی ہے، اور بتاؤں کیا کہہ رہی تھی وہ.....! ابی کہتے کہتے رک گئی۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟ میری شکایت کر رہی ہوگی، مجھ سے بھول ہوگی۔“ میں نے پتہ پائی سے کہا۔

”کیسی بھول؟“ اس نے چونک کے پوچھا۔ میں کیا کہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیورین نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں چپ رہا کہ خاموشی ہی سب سے موثر جواب تھی۔

”کیا تلاؤں، کہہ رہی تھی کہ تم بہت الگ لڑکے ہو، بہت پیارے اور دلی کے بڑے۔ وہ کسی کے بارے میں ایسی رائے کم دیتی ہے۔ کافی عرصے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ بہت ہتھیلی ہوئی رہتی ہے وہ۔“

”وہ ایک مہربان لڑکی ہے..... سمجھ دار، برا اعتبار سے اچھی۔“

”اور میں! میں بری لڑکی ہوں؟“ وہ ہنس کے بولی۔

”تم.....!“ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ ”تم ایک بہت پیاری بچی ہو، گڑیا جیسی۔“

اسی وقت دروازے پر اکبر علی خاں نمودار ہوئے۔ کسی لمحے بھی میں ان کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے مجھے نعرہ بلند کیا۔ ”مجھے یقین ہے، کچھ اچھی خبریں سننے کو ملیں گی۔“

میں صوفے سے اٹھ گیا اور لپک کے ان کے پاس جا کے میں نے ان کے ہاتھ جکڑ لیے۔ اور جلدی جلدی ساری روداد سنائی کہ ابھی شام کو ڈاکٹر آیا تھا تو اسے دنوں میں پہلی بار ٹھنک اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کچھ مشروب وغیرہ بھی نوش کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز دگمگائی۔ اکبر علی خاں نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا اور میرا حوصلہ فزون کرنے کے لیے طرح طرح کے لفظ وضع کرتے رہے۔ اکبر علی خاں کے ساتھ ان کا ملازم لڑکا بھی نقن اٹھائے ساتھ آیا تھا۔

”آنے میں دیر ہوں ہوئی کہ امی جان کی طبیعت شام کو کچھ بہتر ہوگی۔“ اکبر علی خاں کی آواز سے سرت اٹھک رہی تھی۔

”یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔“ میں نے خوشی دلی سے کہا۔

”بس، بٹھالیا پاس اپنے۔ میں بھی منتظر تھا کہ کسی طرح ان کی طبیعت کچھ بہتر ہو تو ایک معاملے میں ان کا عندیہ معلوم کروں۔“

”کیسا عندیہ؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ابھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”بتاؤں گا، میرا خیال ہے، کھانا گرم سے کیوں نہ پہلے نقن کشائی کی جائے..... اور آپ اطمینان رکھیں، آج زیادہ کھانا نہیں ہے۔ نزہت کہہ رہی ہیں، سارا تو واپس آ جاتا ہے۔“

”آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں۔“

”واہ صاحب، آپ نے پھر وہی غیرت والی بات کر دی۔ ایسا مت کہیے، دل بوٹھل ہو جاتا ہے۔“

میں نے معافی چاہی اور عذر کیا کہ گھر میں

والدہ کی بیماری کی حالت میں یہ تکلفات مناسب نہیں لگتے۔ یہاں اسپتال میں کھانے پینے کے اچھے انتظامات ہیں۔

”ہوا کر سیں لیکن گھر موجود ہوتے ہوئے آپ باہر کا کھانا کھائیں خواہ کتنا ہی اچھا ہو۔ کم از کم مجھے گوارا نہیں ہے۔“

میرے پاس سر جھکانے کے سوا کیا رہ جاتا تھا۔ ”دو پہر آپ نے سادہ شیشے چاولوں سے رغبت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے نزہت سے کہا۔ ان سے بس کہنے کی دیر ہوئی ہے..... شاید آپ کو پسند آئیں۔“

مجھی سے غلطی ہوئی دو پہر کسی وقت ایسے ہی شیشے چاولوں کی بات میرے منہ سے نکلی گئی تھی۔

”آپ چائیں، نزہت اختراعات کی ماہر ہیں، سادہ چاولوں میں زعفران کی آمیزش کر دی ہے۔ شکر پسند ہو تو شکر کے ساتھ، ورنہ شہد بھی ہے۔ دودھ اور بالائی تو ہے ہی ایک چھچھو لیا تھا میں نے۔ واقعی، شہد اور بالائی کے ساتھ ذائقہ ہی کچھ اور نکھر آیا۔“

”پھر تو خامے کی چیز ہوگی لیکن ذائقہ رائے نے کہا تھا، رات کو بھی آئیں گے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اگر.....“

”کوئی مضائقہ نہیں۔“ وہ کشادہ دلی سے بولے۔ ”اصل میں لڑکا، رات کو اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے، اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ نقن میں لے جاؤں گا۔“

”آپ کیوں لے جائیں گے، نقن صبح بھی واپس جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

ابھی ٹھنک کے بستر کے نزدیک چیزوں کی درستی میں مصروف ہوئی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے ہم سے باہر جانے کی درخواست کی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ میں اور اکبر علی خاں باہر آ گئے۔ ابھی نے کمرہ بند کر کے دروازے پر پردہ کھینچ دیا۔ ہم دونوں راہ داری میں غلطی سے رہے اور اکبر علی خاں شہر کے کشیدہ

حالات کے بارے میں بتانے لگے۔ ”شہر پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ جانے کیوں لوگ سب سے سب سے نظر آتے ہیں یا یہ میرا گمان ہے۔“ انہوں نے ہماری آواز میں کہا۔ ”میں ہی شاید کچھ زیادہ محسوس کر رہا ہوں، شاید اس وجہ سے کہ شہر میں جگہ جگہ پولیس کی ٹولیاں گھوم رہی ہیں۔ بازار بھی آج جلد بند ہو گئے۔“

”تم قسم کی چھ میگوئیاں شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ شہر میں عموماً ایسا کچھ ہوتا نہیں، کل وخن کے واقعات بے شک کبھی کبھار ہو جاتے ہیں لیکن اس بار لوگ کچھ ہراساں سے، حیرت زدہ سے نظر آتے ہیں۔ انٹونی کی موت کا بڑا شہرہ ہے۔ شہر میں جیسا یوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ تو جوان انٹونی کچھ زیادہ ہی مقبول تھا۔ کچھ اس کی مقبولیت، کچھ اس کی جاں بازی، اس کی وردنک موت کی نوعیت سے لوگوں کو بڑی ہم دردی محسوس ہوئی۔ سنا ہے، اس کے جنازے میں بھی شریک تھے، کیا ہندو، عیسائی اور کیا مسلمان۔ انہوں کا تو آپ جانتے ہی ہیں، پر لگے ہوتے ہیں اور سر بیز نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں افواہ طرازی سب سے مرغوب مشغلہ ہے۔ ناواقیت، جہالت اور افواہ کا شاید کوئی گہرا تعلق ہے۔“

میں سنتا رہا۔ جب تک ابھی نے باہر آ کے ہمیں اجازت نہ دی، ہم راہ داری میں گھومتے رہے۔ کمرے میں آ کے صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر ٹپ ٹپ چل ہوئی، ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ ابھی بھی سیدھی ہوئی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھے۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر ڈاکٹر گوجر بھی تھا۔ اسپتال میں پہلی رات میری اس سے اچھی شناسائی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر رائے نے پرتاک انداز میں اکبر علی خاں سے مصافحہ کیا۔ جواباً اکبر علی خاں نے میری جانب سے ٹھنک پر اس کی خاص توجہ کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر رائے ہنس کے بولا، ”الٹا وہ اکبر علی خاں کا شکر گزار ہے کہ اس اچھی شہر میں ان کا ساتھ میرے لیے

استقامت کا باعث بنارہا۔ دونوں میں چند لمبے نوک جھونک اور خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر رائے نے اکبر علی خاں سے فراغت میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی دعوت ایسی رکی نہیں تھی۔

ڈاکٹر رائے نے نھل کا شانہ جھنجھوڑ کے اسے بیدار کیا۔ نھل کسی قدر اکراہ کے بعد گوگلے اور ایمی کے سہارے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا ہاتھ تمام لیا اور گرم جوشی سے حال دریافت کیا تو نھل نے سر کی ہلکی جنبش سے جواب دیا۔ اس نے بد بدلتے ہوئے کچھ کہا بھی۔ یہ دیکھ کے میں اور اکبر علی خاں اس کے بستر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کے خیال سے ہم نے فاصلہ رکھا۔ میں نھل سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس بار ڈاکٹر گوگلے آڑے آگیا۔ نھل نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آنکھیں بند کر کے اس نے مجھے مہرہ ضرب کی تاکید کی ہے۔

ڈاکٹر رائے کے اشارے کے لیے تیار کھڑی ایمی نے نھل کا ہنہردہاں سے ڈھانپ دیا اور بستر کے پہلو میں رکھی کھلی الماری سے پیالہ اٹھا کے پیچھے بھر بھر کے اسے کوئی چیز پلانے لگی۔ مجھے تو گوگلے نے وہاں سے ہٹا دیا۔ اکبر علی خاں نے بھی گوگلے کا ساتھ دیا، میری کمر سہلاتے ہوئے وہ مجھے نھل کے بستر سے دور لے آئے۔

سب توازن کی بات ہے۔ ایک ذرا توازن منتشر ہو جائے تو آدنی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آدنی بچہ ہو جاتا ہے، آدنی بوڑھا ہو جاتا ہے، آدنی معذور ہو جاتا ہے، آدھا آدنی، پوتا آدنی، دیکھنے کا آدنی۔ آدنی سے اور آدنی نہیں بچتی۔ آدنی کا اپنا اختیار نہ رہے تو پھر آدنی ہی کیا ہے۔ بیماری سے بڑی مفاہمت شاید کوئی نہیں ہے۔ کہتے ہیں، سب سے بڑی ذلت غربت ہے لیکن یہ بیماری بھی کچھ کم ذلت نہیں۔ اور ایسی بیماری کہ آدنی بے دست و پا ہو کے

رہ جائے۔ آدنی کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی ہے۔ نھل کو کیا محسوس ہو رہا ہوگا، یہ کچھ دہی چانتا ہوگا۔

”آج رات گہری نیند لینے کا ہے، سمجھا کچھ؟“ میرے کانوں میں ڈاکٹر رائے کی آواز آئی۔ وہ حاکمانہ انداز میں نھل سے مخاطب تھا۔ کبہ رہا تھا کہ کل سے دوائیاں کچھ بدل دی جائیں گی اور کچھ کم بھی کر دی جائیں گی۔ اب نھل کو آہستہ آہستہ غذا کی طرف لوٹنا ہے کیوں کہ غذا سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ زیادہ سوچنا نہیں، وہ خاطر جمع رکھے کہ اس کا محبوب بھائی ہر وقت اس کے پاس ہے۔ یہ شہر کا بہترین اسپتال ہے۔ اسپتال کی تجربہ کار نرسیں اس کی خدمت پر مامور ہیں اور ماہر ڈاکٹر بھی دور نہیں ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ نھل کی بیماری کے دوران دنیا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور اس کی محنت پائی تک وہ اپنے نور سے ہٹ نہیں جائے گی۔ ادھر بے کام آنے والے کل پورے ہو جائیں گے۔ زندگی کے سارے معاملات تن رفتی سے مشروط ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے وہی کچھ کہا جو کل رات ہم، میں اور اکبر علی خاں پاتیں کر رہے تھے کہ زندگی سے موت کا فاصلہ بہت قریب ہوتا ہے۔ موت ہر لمحے وار کرتی رہتی ہے اور یہ کیا کم ہے کہ نھل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

نھل نے منہ پھیر لیا تو ایمی نے بھی ہاتھ روک لیا اس دوران ڈاکٹر رائے مسلسل نھل سے مخاطب رہا اور ایسے ایسے کلمات تر اشتار با جو بظاہر دواؤں سے زیادہ جان فزا تھے۔ اس کی ہدایت پر ایمی نے نھل کے بازو میں سولی گھونپ دی اور ڈاکٹر رائے اس وقت تک ٹھہرا رہا جب تک ایمی نے نھل کا سر حنا نیچے نہیں کر دیا اور نھل کی آنکھیں منڈیاں نہ لگیں۔ پھر وہ ایک لمبے بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔ اکبر علی خاں نے ازارا وضع اسے کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ ڈاکٹر نے شکر یہ ادا کر کے مضرت

چاہی کہا سے ابھی آں جہانی انتھونی کی بیوی شیری کو دیکھنے جانا ہے۔ اس کی حالت نہایت شکستہ ہے۔

ڈاکٹروں کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ انہوں نے سیمانی کا جیسے ٹھیک لیا ہوتا ہے۔ آندھی ہو یا طوفان، مرلیش دہائیاں دیتے ہیں، فرض اور انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں، ڈاکٹروں کو آنا پڑتا ہے، ڈاکٹر بھی دوسرے جیسے پیشہ ور ہوتے ہیں مگر سر کی پیشہ میں ایسا جبر نہیں ہوتا یا ایسی مجبوری نہیں ہوتی یا ایسا احتیاق جتایا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر رائے کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے نھل کو بل دیا۔ ایمی نے کسی وارڈ بوائے کو بلا کے رکھیاں وغیرہ میز پر رکھوانے کا اہتمام کیا۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وارڈ بوائے کھانا گرم کر لایا۔ میں نے اسے کچھ روکے کی بھیٹ کی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر ایمی کی سفارش پر آمادہ ہو گیا۔ پھر تو اس کا انداز ہی بدل گیا۔ پیسے کی کیا کرامت ہوتی ہے۔ آدنی موم بن جاتا ہے، آدنی جلی بن جاتا ہے، آدنی دھرا ہو جاتا ہے۔ ایمی گھر سے کھانا کھا کے آئی تھی۔ اکبر علی خاں کے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی اور دوپہر جس طرح سیورین پر حیرت طاری ہوئی تھی، ایمی بھی چند لمحوں کے بعد تکلف کی نھل نہ ہو سکی۔

اکبر علی خاں کا لازم الزام کب کا چاچکا تھا۔ دس بج چکے تھے۔ ان کے یہ قول شہر کے حالات کشیدہ تھے، میں نے ان سے کہا بھی کہ اب وہ گھر چلے جائیں، رات بہت ہو گئی ہے، کچھ وقت راستے میں گئے گا لیکن وہ نہیں مانے، کہنے لگے۔ ”زہمت سے کہہ کے چلا تھا، دیر ہو سکتی ہے۔“

ایمی نے ان کے لیے کافی تنکوالی اور باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوا دیں۔ سبزہ زار میں خوش گوشت کھلی تھی۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات کی رانی کی مہک سبزہ زار میں کھلی ہوئی تھی۔ اکبر علی خاں گہری گہری سانسیں لے کر تازہ خوشبودار ہوا سینے میں بھر رہے تھے۔ ایمی نے کافی بنائی۔ کافی بنا

کے وہ کمرے میں چلی گئی تو اکبر علی خاں کسمائے ہوئے بولے۔ ”اب آپ نے کیا سوچا ہے۔ آگے سفر کریں گے یا.....“ وہ رک گئے اور میری شکل دیکھنے لگے۔

”ابھی کچھ بے نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے گھر واپس چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ آگے سفر کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔“

”ہاں مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے۔“ انہوں نے تاکید کی۔ ”لیکن میری بات مانیں تو کچھ عرض کروں۔“

”ضرور، ضرور۔“ میں نے کہا۔

”بھائی صاحب کی طبیعت بحال ہو جائے تو سفر کرنے کے بجائے کیوں نہ کچھ دنوں کے لیے غریب خانے پر قیام کریں۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں، کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ آپ کو گھر جیسا آرام ملے گا، ظاہر ہے، احتیاطاً کچھ عرصے اسپتال سے قریب ہی رہنا چاہیے۔ گھر میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

”آپ کی محبت اور مہربانی۔“ میں نے ہلکے کے کہا۔ ”دیکھتے ہیں بھائی صاحب کی مرضی کیا ہے۔“

”ہاں، ہاں، بے شک، بے شک۔“

”آج رات یا کل صبح نکلنے سے ضرور کوئی آجائے گا۔ تار سے وہ کھٹک تو گئے ہوں گے لیکن شاید نھل بھائی یا میری طبیعت کے بارے میں ان کے ذہن میں کچھ نہ آئے۔“

”یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کے عزیز یا دوست؟“

”کیا کہوں، اس سوال کا جواب مشکل ہے۔“ میں نے کسمائے کے کہا۔ ”وہ عزیزوں اور دوستوں سے نہیں بڑھ کے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کیا بتاؤں آپ کو۔“

”کچھ تو..... اگر مناسب ہو۔“
 ”پھر کبھی.....“ میں نے بے چارگی سے کہا۔
 ان کی آنکھوں میں خیریت جو پیدا ہوئی اور انہوں نے جھٹ نہیں کیا، کہنے لگے۔
 ”بہر حال.....“

”آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔“ میں نے ان کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔ ”آتے وقت آپ نے کہا تھا، آپ بعد میں کچھ بتائیں گے۔“ خیر تو ہے؟
 ”ہاں.....“ ان کا لہجہ بدل گیا، اداسی سے بولے۔ ”آپ سے ایک ذاتی کچھ گھر بلو قسم کے معاملے میں بات کرنا تھی۔ کچھ عجیب سی شس شس ہے۔“

”کیا بات ہے؟ مجھے بتائیے۔“
 ”دو ایک دن کی ملاقات میں جانے کیا کرشمہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے، مجھے آپ سے کوئی غیرت محسوس نہیں ہوتی۔ اتفاق سے کل ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بات تو دونوں سے چل رہی تھی لیکن کل ان کا تقاضا آ گیا۔“ وہ چپ ہو گئے جیسے کھوسے گئے ہوں۔
 ”کیا تقاضا؟“ میں نے پتائی سے پوچھا۔

ان کا چہرہ بھاری ہو گیا۔ آواز بھی۔ انہوں نے بتایا کہ بھوپال کے ایک صاحب حیثیت اور با اثر نواب خاصے عرصے سے بچے میں متیم تھے۔ کسی تقریب میں نواب کے خاندان والوں نے ان کی بڑی بیٹی سلطو کو دیکھ لیا تھا۔ نواب نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگ لیا۔ پھر حیدر آباد میں متیم ان کے بڑے بھائی بھی اپنی بیٹی کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔ بڑے بھائی کے بیٹے کو انہوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہے۔ برس گزر رہے، وہ حیدر آباد گئے تو ہتھیار تعلیمی سلسلے میں علی گڑھ تھا۔ کہنے لگے کہ انہیں بچپن کے مزاج اور عادت اطوار کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ بڑے بھائی بھی اب غیروں کی طرح ہیں۔ وقت گزر جاتا ہے، ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ ادھر آتے نہیں اور اکبر علی خاں کا

بھی جانا نہیں ہوتا۔ ان کی والدہ کچھ وقت کے لیے بڑے بیٹے کے پاس حیدر آباد گئی تھیں۔ جی نہیں لگا تو جلد ہی واپس اپنے آگئیں۔

وہ اپنے گھر کے اتنے ذاتی معاملے پر مجھ تازہ شناسا سے بات کر رہے تھے۔ مجھے سوچ سمجھ کے کوئی ذمہ داران مشورہ دینا چاہیے تھا۔ میں نے دلی آواز میں پوچھا۔ ”تو آپ کے خیال میں ہمیں اور رشتہ منظور کر لینے سے بھائی صاحب ناراض ہو سکتے ہیں؟“

”یہ ممکن ہے، حالاں کہ بچپن کا حال احوال دیکھے بھالے بغیر، چاہے وہ کتنا ہی اپنا خون کیوں نہ ہو، مجھے رشتہ کسی طور منظور نہیں ہے۔ اور یہ۔۔۔ بھائی صاحب کی خواہش ہے، ضروری نہیں کہ ان کے فرزند بھی آمادہ ہوں۔“

”تو اس میں ایسی الجھن کیا ہے۔“ میں نے شائستگی سے کہا۔ ”آپ پہلے بڑے بھائی صاحب کو ترجیح دیجیے کیوں کہ بہر حال وہ آپ کے بھائی ہیں۔ حیدر آباد جا کے بچپن کے طور اطوار سے تسلی کر لیجیے۔“ شفافی نہ ہونو پھر نواب صاحب کے رشتے پر غور کیجیے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے میاں!“ وہ بالوں سے بولے۔ ”میں نے آپ کو پوری بات ابھی کہاں بتائی ہے۔ صرف اتنا تو نہیں ہے، دو جگہ سے لڑکی کے رشتے آئے اور کسی ایک کو منظور کر لیا یا مسترد کر دیا، مسئلہ تو اپنے گھر کا بھی ہے۔“

”اپنے گھر کا؟“ میں نے چونک کے پوچھا۔
 ”بھائی! فریق تو ہم دونوں ہیں۔ ہمیں خود کو بھی تو دیکھنا ہے۔ اپنے گھر، گھر کے مزاج، اپنی بیٹی کی پسند ناپسند، رشتان طبع وغیرہ کو۔ میری بیٹی سلطو عام لڑکیوں سے الگ ایک لڑکی ہے بلکہ ہمارا سارا گھر بھی، ہزاروں لاکھوں، بہت سوں سے مختلف گھر ہے۔ اور یہ سلطو، یہ تو بڑی ذہین اور حساس بچی ہے۔ معلوم ہے، ہمیشہ اول آتی رہتی

ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو، لگتا ہے، کوئی بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہے کچھ نظر کچھ اور آتی ہے۔ ایسی بچی عمر میں اتنی گہری باتیں..... اور باتوں آپ کو، وہ بڑی سہیلی ہے۔ میں نے اس کے ہاں سر کی ایسی فراوانی، قوت اور تگن دیکھی ہے کہ خدا کی پناہ..... اس کا ذوق و شوق دیکھ کے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کے لیے ایک استاد کا ہندو بست کر دیا تھا۔ کمر بند کر کے، اس پاس میں سرکار ہر رسا نہ ہو سکے، ایک سنگیت سرائے اسے تربیت دیتا رہا مگر روز اس کے گھر آنے جانے سے محلے والے کھٹک گئے۔ انہوں نے جستجو..... شروع کر دی۔ یہ ملازم وغیرہ بھی اچھے خاصے غیبت گو ہوتے ہیں۔ خبر پھیل گئی کہ اکبر علی خاں کی بیٹی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ایک ہندو پنڈت روزانہ آتا ہے۔ بس صاحب، لاکھ غدر پیش کئے، ایک بنگامہ ہو گیا۔ استاد کا سلسلہ نور آئندہ کر دیا۔ کیا بتاؤں، موسیقی کا شوق کیا ہوا، زندگی اجڑن ہو گئی۔ کیا موسیقی سے رغبت ایسی بری بات ہے؟“

”جو برا سمجھتے ہیں، ان کے لیے تو برا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے قتلاہ لہجہ میں کہا۔

”آپ نے بالکل سچ کہا۔ یہی بات تو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ رہنا تو ہمیں اپنے محلے اور انکی لوگوں کے درمیان تھا۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ معاملہ دب گیا۔ جیسے واقعی یہ کوئی غیر معمولی مسئلہ تھا۔ آدمی کو یہاں انفرادی آزادی نہیں ہے۔ ہم اپنی پسند، اپنی مرضی کی زندگی نہیں گزار سکتے۔“

”شاید کہیں بھی نہیں۔“ میں نے زیر لبی سے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بے قرار سے ہو گئے۔ ”سے فک، کہیں بھی نہیں لیکن اتنا اور ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ولایت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ وہاں بڑی انفرادی آزادی ہے لیکن مادر پدر

نہیں۔ وہاں بھی اپنی روایتیں ہیں اور گورا تو بڑا روایت پرست، قدامت پسند ہوتا ہے لیکن یہ روایتیں آدمی کو اتنا مجبور نہیں کرتیں، اپنی فکر، اپنی رائے، اپنی طرز کی زندگی کی رعایت۔ وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ لوگ کام کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ایک دنیا پر ان کی حکمرانی ہے۔“

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے انہیں ٹوکا۔ وہ باتوں باتوں میں بہت دودھل گئے تھے۔ ”معاف کرنا میاں! اتنی باتیں بھری ہوئی ہیں دماغ میں، کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ آئی ایم ساری۔“ وہ پشیمانی سے بولے۔ ”آپ نے اچھا کیا، مجھے ٹوک دیا۔ میں کہہ رہا تھا، ابھی تو سلطو تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہ رشتے وغیرہ کی بات تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد ہی مناسب ہوگی۔ لیکن ایک مسئلہ اور بھی ہے۔“ وہ بڑھمری سے بولے۔

کوئی سوال کرنے کے بجائے میں خاموش رہا۔

کچھ وقف کے بعد وہ خود ہی بولے۔ ”اصل میں خوش فہم بچوں کے رشتے، آپ جانتے ہیں، ان کے رشتوں کی کمی نہیں مگر ہمارے گھر کے معاملے میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”دیکھیے کچھ عجیب معاملہ ہے میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہمارا گھر اپنی خاص بود و باش بلکہ اپنی فکر، سوچنے کے انداز سے اجنبی ہو گیا ہے۔ خاندان برادری والے ہم سے ملنے میں کھڑاتے ہیں۔ کچھ آزاد خیال سمجھتے ہیں، کچھ کو ہمارے طور طریقے پسند نہیں، میری اور نرہت کی تعلیم، ولایت میں ہمارا قیام، بے پردگی وغیرہ۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہم ان سے دور ہو گئے ہیں۔ بس ایک دسی سائنقی رہ گیا ہے۔ اور بات یہ ہے، ہمیں بھی یہ لوگ پسند نہیں۔ ایک تو ان

کی طرف سے کوئی رشہ آنے سے رہا، دوسرے ہم خود بھی نہیں چاہتے کہ ان کی طرف سے ایسا سلسلہ چلائی ہو۔ ایسے لوگوں میں بیٹی بیانی جائے؟ ان گھروں میں تو بچی گھٹ کے رو جائے گی۔ سلطوت کا اپنا ایک وجود ہے، شادی، مرد کی حکمرانی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کیا ہے۔ شادی کے بعد ایک عورت پر مرد کا تسلط ہو جائے۔ نکاح کے دو پولوں سے عورت کا ثابت و سالم وجود کسی ایک مرد کی قلم و ریں شامل ہو جائے یا اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ نہیں صاحب، ہمیں قبول نہیں۔ ”اگر علی خاں کی آواز سننا گئی، کہنے لگے۔“ یہ تو آپس میں محبت بائٹے، دکھ سکھ میں ساتھ رہنے، ایک دوسرے کا خیال رکھنے، ایک کو دوسرے کی جائز خواہشوں، رغبتوں کو آواز دینے کا تعلق ہے۔ تم از کم میں تو یہی سمجھنا ہوں۔ شادی کی تالی ایک ہاتھ سے نہیں کھنی چاہیے۔“

”مگر کوئی جی گھر ہو، بالکل آپ صہیا تو نہیں ہوگا۔ دوسرا گھر تو دوسرا ہی ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو نئے گھر سے مفاہمت تو کرنی پڑتی ہے۔“ میں نے ہنسی سے ہنسا دیا۔

”صرف لڑکی ہی کیوں؟ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو بھی گھر میں نوادار لڑکی کے مزاج اور مرضی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔“ ان کے کچھ میں ترش آگئی پھر اداسی سے بولے۔ ”اصل میں کچھ غلطی ہماری بھی ہے۔ جہاں سارے پڑھے لکھے ہوں، وہاں ایک جاہل، بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں سارے جاہل ہوں، وہاں ایک پڑھا لکھا بچہ بن جاتا ہے۔ سارے امیر ہوں تو ایک غریب خود کو کیسا ناخوار و نا بکار محسوس کرتا ہے۔ سارے غریب ہوں تو ایک امیر اپنے لوگوں سے کٹ جاتا ہے۔ عجب گورکھ دھندا سا ہے۔ شاید ہم اپنے خاندان برادری والوں سے آگے نکل گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں۔ سو چاہی نہیں کہ گھر میں بیچیاں بھی ہیں اور بڑی بھی ہو رہی ہیں اور انہیں مستقل

شہروں سے اتنا نہیں، جتنا ان لوگوں سے فرق پڑتا ہے، جن کے درمیان آب رہتے ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ ابھی قسمت سے، ابھی تلاش کر کے۔“

”آپ تو میری زبان بول رہے ہیں میاں۔“ وہ مسکرا کے بولے۔ ”اسی لیے تو میں کہتا ہوں، میرا کوئی ہم نفس، ہم زبان، کوئی بھڑا ہوا مل گیا ہے۔“

”چیتا میاں! ہم نہیں بھی رہ سکتے تھے۔ سال میں دو ایک ماہ یہاں سے اکٹرا کے، کچھ منہ کا حراہ بدلنے کے لیے بھی، ہم ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن کئی باتیں ہیں جو لوٹ کے یہاں آنا پڑتا ہے۔ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ ایک خاص لگاؤ ہوتا چاہیے مجھے اس شہر سے، پھر والدہ صاحبہ کا دل کہیں نہیں لگتا۔ یہاں انہوں نے ساری زندگی گزاری ہے۔ بچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک میں بھی نہیں وکالت کر رہا تھا۔ وکالت پڑھانا تو اب بھی ہوں۔ فزہت بھی یہیں پڑھاتی ہیں۔ بھائی صاحب تو حیدر آباد جا کے ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے۔ آبائی زمینیں، جائیداد، اور وہ بھی اچھی خاصی۔ سب کچھ یہیں ہے۔ ان کا انتظام، پھر..... کیا بتاؤں آپ کو۔ اباجان مرحوم کے زمانے سے بہت سے گھرانے ہمارے گھر سے وابستہ ہیں۔ یہ غریب لوگ، زمینوں پر کام کرنے والے اور ہمارے مکانات میں رہنے والے۔ ان کی شادی بیاہ، تعلیم، خوشی اور غم، یوں سمجھئے، دادا پر دادا کے وقت ہے ان کی نگہ بانی ہمارا کام ہے۔ گاؤں میں بچوں کی تعلیم کے لیے ہم نے اسکول بھی کھولا ہے۔ فزہت ہر چند کہ میں دن بعد وہاں جاتی ہیں۔ ابھی کھائی ہے میاں..... ابھی ارد گرد کے لوگوں کے ملاؤں سے تنگ آ جاتے ہیں تو باہر نکلنے کی سوچتے ہیں اور یہ فزہت ہیں..... فزہت میں ہی ہیں میاں، یہ..... یہ کوئی فیصلہ، کسی فیصلہ کرنے ہی نہیں دیتیں۔“

”میں کیا رائے زنی کرتا، چپ رہا۔“

”چھوڑیے ان باتوں کو۔“ وہ ہالوسی سے بولے۔ ”سردست تو مسئلہ نواب صاحب کا ہے، انہیں کیا جواب دیا جائے۔ ان کا گھرانا شہر میں بڑا باعزت گھرانہ ہے۔ یہ ظاہر انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ میں نے ساری روداد آپ کو اس لیے سنائی کہ نواب کے گھر میں دنیا کی ہر آسائش میسر ہوگی لیکن سلطوت کی شخصیت بالیدگی نہیں مرجھانہ جائے۔ وہ تو رنگوں سے بھٹی ہے، سروں سے، کتابوں سے بھٹی ہے۔ وہ تو بہت خواب دیکھتی ہے اور وہ تو سب سے آگے نکل جانے کی جستجو میں رہتی ہے، اور اسے دولت وغیرہ کی کوئی حرص نہیں۔ اپنی اولاد کی بات نہیں کہ ہر ایک کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ وہ تو ایک مثال ہے۔ نواب صاحب کے محل دو محلوں میں کہیں..... یہ نواب لوگ بڑے روایتی ہوتے ہیں۔ دولت مندی سے مراد روشن کاری نہیں ہے۔ جس طرح روشن کاری سے مراد آوارگی نہیں ہے۔ وہاں جا کے قریب سے ان کے طور طریقے دیکھتے بغیر ہاں، کیسے کی جاسکتی ہے اور سلطوت کو بھی تو اپنے ہونے والے زندگی بھر کے ریش کو برکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ پرکھنے کا نہیں تو کم از کم دیکھنے، اندازہ لگانے کا۔ میری باتیں آپ کو عجیب لگ رہی ہوں گی لیکن کیا ان میں معقولیت نہیں ہے؟ بتائیے۔“

”نہیں بالکل نہیں، پر یہاں ایسا کہاں ہوتا ہے۔“

”نہیں ہوتا، ہونا چاہیے۔ نواب زادے کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کے ایک ایسی لڑکی سے زندگی بھر کے رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہونا چاہیے جسے اس نے بھی دیکھا اور ٹھوڑا بہت سہی، جانا بوجھانہ ہو۔ کہتے ہیں، شادی دو خاندانوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن اصل فریق تو دو افراد ہوتے ہیں۔ ان افراد کی نہ بے تو خاندان والے کیا کر سکتے ہیں۔ یہی ہوتا ہے؟“

”ہاں، ہوتا ہے یہی کچھ۔“ میں نے کہا۔ ”مگر نامنتہی تو مشکل ہی سے ملیں گی۔ شادی سے پہلے کی پسندیدگی بعد کو ناپسندیدگی میں بھی تبدیل ہوتی ہے۔“ کوئی شہانت نہیں، بے شک کوئی نہیں۔ ”اکبر علی خاں بھی سے بولے۔“ دوستوں کے درمیان کاروباری معاہدے میں مل آ جاتا ہے۔ شادی کے معاہدے میں بھی تمام تر اطمینان کے باوجود کشیدگیاں اور کدورتیں ہو جاتی ہیں۔ پھر تو انجام علیحدگی کی صورت برآمد ہوتا ہے یا ساری زندگی کے عذاب کی شکل میں لیکن یہ طال تو نہیں رہتا کہ فریقین نے ایک دوسرے کو سمجھا بوجھا دیکھا بھالا نہیں تھا۔ شادی جوئے کا کھیل نہیں ہے۔“

”اس صورت میں تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نواب صاحب کو انکار کر دیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ ہوتے تو ضرور کہہ دیتے۔ آپ ایک جرأت مند آدمی ہیں، آپ وہ آدمی ہیں جو میں نے ہونا چاہا تھا اور میں ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے استاد میدا کے ٹھکانے پر جانے کا فیصلہ چنگی بجانے کے دورانیے میں کر لیا تھا۔ نواب صاحب سے عروت کا ایک سلسلہ برسوں سے قائم ہے۔ ان کے گھر سے رشتہ آئے اور منع ہو جائے۔ یہ ان کے لیے بڑی سبکی کی بات ہے۔ جس طرح چنگی کہوں، محسوس کر لیں گے۔ وہ ایک بااثر آدمی ہیں۔ بااثر آدمی کے دل میں کینہ جلدی بیٹھتا ہے۔۔۔۔۔ اور سوچتا ہوں، اس شہر سے تو پھر سطوت کے رشتے آنے سے رہے۔ نزہت کے ستار بجانے کا شوق، ان کی اعلیٰ تعلیم، لوگوں لڑکیوں کے مشترکہ کالج میں درس و تدریس۔ میری ان کی شادی کی بھی ایک داستان ہے۔ یہاں بھی واقف ہیں۔ وہ یہاں کی نہیں ہیں۔ شادی کے بہت دنوں کے بعد تو آپس پاس کے لوگوں نے ان سے بات چیت شروع کی تھی۔“

”انکار کی صورت میں کیا آپ کو نواب صاحب کی جانب سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے؟“

”سب سے بڑا نقصان تو تعلق خاطر کا ہے میاں۔“

”کچھ تو آپ کو ہنگامتی ہو گا۔ عذر تو بہت سے کیے جاسکتے ہیں اور کیا غلط ہوں گے۔ کہہ دیجیے کہ آپ کو کچھ دقت چاہیے۔ آپ کے بڑے بھائی نے بھی خواہش ظاہر کی تھی۔ پہلے ان کی جانب سے بات صاف ہو جائے۔ ادھر کی تعلیم کا بھی عذر کیا جاسکتا ہے کہ سطوت بی بی پہلے احلیم مکمل کرنا چاہتی ہیں۔“

”نواب صاحب ایک جہاں دیدہ آدمی ہیں، سمجھ جائیں گے۔“

”سمجھا کریں۔ وہ کوئی بادشاہ سلامت ہیں کیا۔ نا آماجی میں ایسے ہی عذر کیے جاتے ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ نواب زادے کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہوگی۔ آپ کو اختیار ہے۔ ہر باب کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے، اپنی بی بی کے بہتر مستقبل کا فیصلہ کرے۔ رہی پٹنا شہر میں آپ کے خاندان برادری والوں کی طرف سے رشتے آنے کی ناامیدی، تو کیا ہوگا۔ سطوت پڑھتی رہیں، پڑھتی رہیں۔ اس دوران کوئی نہ کوئی انہیں خود بھی پسند آسکتا ہے۔۔۔۔۔ مگر پھر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا؟“

”باکھل نہیں جناب، قطعاً نہیں۔ ہم سنجیدگی اور کشادہ دلی سے غور کریں گے۔ ہمیں خاندان ذات برادری سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو سطوت کے پسند کے ہوئے فرد سے غرض ہوگی کہ وہ کیسا ہے اور سطوت کی پسند ایسی ویسی نہیں ہوگی۔“

”اور کیا شادی ایسی ہی ضروری ہے؟“ میری زبان بہک گئی۔

اکبر علی خاں چونک پڑے اور کچھ تو نفحے بعد بولے۔ ”ہاں میاں، یہ بھی غور طلب بات ہے۔“

شادی وادی کا رواج تو ابھی ابھی کا ہے۔ زندگی تو گروڑوں سال کی ہے۔ ہماری تو دس ہزار سال پہلے کی آگ، دھم و قیاس، آثار و قرائن کی بنیاد پر ہے۔

”مگر شادی غالباً یوں ضروری ہے کہ اس زمانے کا دستور ہے۔ ہر زمانے کا اپنا ایک دستور ہوتا ہے۔ اور وہی بات ہے، آدمی نہ ماضی میں رہ سکتا ہے نہ مستقبل میں۔ وہ تو محض اپنے حال میں رہتا ہے۔ ہر موجود زمانہ اس کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے قواعد، قوانین، ضابطوں اور مطالبوں کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ہر موجود زمانے کے اپنے لہجے، زبان، لباس اور اپنا ایک رہن سہن ہوتا ہے۔ ہر موجود زمانے کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ جو کچھ جس عہد میں ہے، وہی منطق ہے۔“

آپ نے خود ہی سوال اٹھایا اور خود ہی جواب دے دیا۔ ”وہ شافقی سے بولے۔“ یہ مگر یہی آدمی کو بھڑکانے پر اور گہری راستہ دکھاتی ہے۔ بہر حال آپ کا مشورہ صائب ہے۔ مجھے بوجہ یہ دونوں رشتے منظور نہیں ہیں تو کوئی عذر تو پیش کرنا ہی ہوگا۔ آپ سے بات کر کے میرا سینہ ہلکا ہوا اور مجھے حوصلہ ملا۔

انہوں نے کافی کے چند ہی گھونٹ لیے تھے اور اپنی باتوں میں گم ہو گئے تھے۔ کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ بہت دیر بعد ایسی نے سبزہ زار کا رخ کیا تو اس نے ہم دونوں کو دوبارہ گرم کافی بنا کے دی۔ مجھے کافی ایسی مرغوب نہیں تھی لیکن اکبر علی خاں کے سامنے منع نہ کیا جاسکا۔ ختم اب محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دروازہ داری میں وقفے وقفے سے قدموں کی آہٹ گونجنی اور خاموشی میں ڈوب جاتی۔ میرا کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ اکبر علی خاں کو گھر واپسی کا کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد جیب سے انہوں نے گڑھا ہوا ریشمی کپڑے کا ہوا نکالا۔ ”میں دھینے سے شوق کریں گے؟ پان

مجھے اچھا لگتا ہے لیکن نزہت کو پسند نہیں۔ اور انہیں نہیں تو مجھے بھی۔“ انہوں نے ہوا میرے آگے کر دیا۔ ”یہاں تو اسے بن دینا چاہتا ہے، کئی چروں کا مرکب ہے، منہ میں خوشبو بکھر جاتی ہے۔ معلوم نہیں، آپ اسے کیا کہتے ہیں؟“

میں نے ایک دو چٹکیاں لیں۔ عموماً شادی کی تقریبات میں جو مہمان پان نہیں کھاتے، انہیں یہ مسالا پیش کیا جاتا ہے۔ واقعی خوش ذائقہ تھا۔ ”کیسا لگا؟“ انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”دل چسپ ہے۔“

”دل چسپ کی خوب کہی۔“ وہ ہنس پڑے۔ ”یہ نزہت میری بیوی کے علاوہ، میری گھراں بھی ہیں۔ ایسا خیال رکھتی ہیں کہ خود پر میرا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ ہر وقت انہیں یہ خبر دیتا رہتا ہے کہ مجھ سے کوئی چوک ہو جائے گی، اور ہوتی بھی ہے۔“

”آپ بھی کیا کم ان کا خیال رکھتے ہوں گے۔“

”بھئی سچی بات یہ ہے، بڑے جتن کر کے انہیں حاصل کیا ہے۔ مشکل سے حاصل کی ہوئی چیز کی قدر بھی بہت ہوتی ہے، پھر نزہت تو ہیں ہی قابل قدر، قابل ستائش۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ میرے لیے انہوں نے بڑی دیواریں پھلائی ہیں انہیں لگتا ہے کہ میرے بغیر وہ، اور ان کے بغیر میں، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔“

”ایسا گم ہوتا ہے۔“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”اس لحاظ سے آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنا کوئی مطلوب مل گیا۔ کسی کو اس کا اپنا مطلوب مل جائے تو دنیا مل جاتی ہے۔“

”میں واقعی خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔“

”خدا کرے، آپ دونوں میں یہی یکا گنت رہے۔“ مجھے شاید یہی کہنا چاہیے تھا۔

”ہاں۔“ ان کا لہجہ حسری سا ہو گیا۔ ”اس دعا کریں، ایسے ہی سارا کچھ بنا رہے۔“

”انہوں نے دتی گھڑی دیکھی اور انگڑائی سی لے کے بولے۔“ میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے، آج میں سوچ کے آیا تھا کہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھوں گا مگر کچھ پوچھتے تو جی بھر نہیں۔“

”تو بیٹھے نا کچھ دیر اور۔“ میں نے بہ ظاہر نکلتا کہا، خود میرا جی بھی ان کی باتوں میں لگ رہا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد تو مجھے اپنے ساتھ ہی رہنا تھا اور جانے کیوں میں اپنا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”آپ تو اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں۔ میں ہی فضول گوئیاں کرتا رہتا ہوں۔“ ان کے دکھائی لگے میں تا زبرداری بھی شامل تھی۔

”کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟“

”بہت سے سوال دماغ میں اٹھتے ہیں۔“

”مثلاً کیا کیا؟“

”یہی کہ میاں۔ اب ایسی بھی آپ کی عمر نہیں ہے۔ ماشاء اللہ جو ان ہیں مگر ایک عجیب پیش ی، ایک تاملم سا کچھ میں نے آپ کے چہرے پر محسوس کیا ہے۔“

”میں۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں اس خامی پر۔“

”نہیں جناب، یوں نہیں، ایسے مت نا گئے۔ یہ اضطراب بے سبب تو نہیں ہوگا۔ ہو سکے تو کچھ بتائیے، اور اگر ناگواری کا باعث ہو تو بخدا بالکل نہیں۔ آپ سے میرا حلق آپ کے بارے میں میری واقفیت سے بندھا ہوا نہیں ہے۔“

”یہ تو آپ کی بڑائی ہے۔“

”بڑائی کیا۔“ وہ بے بسی کے سے انداز میں بولے۔ ”کوئی اچھا لگ جائے، پھر اور کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا لگنے نہ لگنے کا معاملہ تو دل کا ہے، دماغ کا نہیں۔ اور کچھ جاننے کا اشتیاق تو فطری ہے لیکن لازم نہیں، کم از کم میرے لیے۔“

”کیا بتاؤں؟“ میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

”کچھ نہ بتائیں۔“ انہوں نے سر جھٹک کے کہا۔ ”جائے دیجیے۔“

”بتانے کو کچھ اچھا نہیں ہے۔“

”برا بھی نہیں ہوگا۔“

”شاید اسی کو حسن ظن کہتے ہیں۔“

”نہیں، یقیناً ہے، برا کچھ نہیں، مختلف ضرور ہوگا۔ کچھ الگ ہوگا صاحب۔“ ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”میں تو کہوں گا، میں نے آپ جیسا نو جوان نہیں دیکھا۔۔۔ اور ایسا نہیں کہ دنیا نہیں دیکھی، دنیا کو بھی اچھا خاصا دیکھا، بڑھا اور سنا ہے۔ وکالت میں تو آئے دن حیران کن واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن۔۔۔“

میں چپ رہا اور سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں۔

”یہ آپ کے سفر کا مشغلہ ہے جواز تو نہیں ہونا چاہیے۔“ میری خاموشی پر انہوں نے جیسے مجھے تنکا چھوایا۔

”سیر و تفریح بھی تو ایک جواز ہوتی ہے۔“

”تو کیا میں یہی۔۔۔؟ نہیں صاحب نہیں۔“

”کسی کی تلاش ہے۔“ میں نے سانس بھر کے کہا۔

”تلاش؟“ ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”ایک صاحب کی۔۔۔ ان کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔“

”مولوی محمد شفیق؟“ انہوں نے تجسس سے دہرایا۔ ”کس وجہ سے؟“

”ان کے پاس ایک امانت ہے۔“

”امانت۔۔۔ اردو بے پیسے کی تو نہیں ہوگی۔“

ان کے دھڑکنے پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے سر ہلا کے تائیدی۔

”کب سے۔۔۔ وہ کھوئے ہوئے ہیں۔؟“

”دس سال سے اوپر ہو گئے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اور..... اور دس سال سے آپ انہیں
 دھوڑ رہے ہیں؟“
 ”نہیں..... کوئی تین چار سال سے۔ سات
 سال میں نے جیل میں گزارے تھے۔ اس لیے
 انہیں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔“
 ”جیل میں؟“ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔
 ”کیا، کیا کہہ رہے ہیں میاں آپ.....؟ کس جرم
 میں؟“ سات سال کا مطلب ہے کوئی بڑا جرم.....؟“
 ان کی آواز ہل گئی۔
 ”دہرے قتل کے جرم میں۔“ میں نے سر جھکا
 لیا۔
 ان کا جسم بل کھا گیا۔ ”آپ مذاق کر رہے
 ہیں۔“

میں نے قتل کی وجہ اور سزا کاٹنے کے بارے
 میں مختصر انہیں بتانا شروع کیا تو ان کے چہرے کا
 رنگ بدلتا رہا اور وہ گنگ بیٹھے رہے۔ میں نے
 تفصیل سے اہتساب کیا تھا لیکن ان کی حالت غیر
 ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ گم سم مجھے دیکھا کیے۔ ”آپ کا تعلق
 گیارہویں ہے؟“ انہوں نے مضطرب آواز میں
 پوچھا۔
 ”بھئی تھا۔ اب تو کئی شہروں سے ہے۔ اور گھر
 میں رہنے کا موقع تو کم ہی ملتا ہے۔ بس گھومتے
 رہتے ہیں، شہروں شہروں، گلی گلی..... اور مولوی
 صاحب کے نام کی صدا میں لگاتے پھرتے ہیں۔“
 میری آواز بیٹھنے لگی۔

”اوہ، اوہ۔“ انہوں نے جھرجھری لی۔
 ”اور..... اور ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملا؟“
 ”کئی جگہ، مراد آباد، جیسلمیر، حیدرآباد،
 ریاست رام پور کے قصبے گریاسادات..... بس آنکھ
 پٹوئی سی ہوتی رہی۔ جہاں جہاں بھی ہم پہنچے اس
 جگہ سے وہ چاچکے تھے۔ حیدرآباد میں یہ اعزازہ ہوا
 کہ وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ ملنا چاہتے تو ان

کے لیے مجھ تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے کئی جگہ
 اپنا پتا چھوڑا ہے۔ کلکتہ جیل سے ٹھٹھل بھائی تک اور
 وہاں سے مجھ تک۔ وہ آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتے
 تھے مگر وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں
 کہ میں سزا یافتہ..... میں اب اس کے لائق نہیں
 رہا..... اور اب وہی اس کے سب کچھ
 ہیں..... بہر حال کسی دن ہم ان تک پہنچ ہی جائیں
 گے یا خود ہی ٹھٹھک کے وہ میرا رخ کریں گے۔
 جیسلمیر میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کا نام
 بدل کے فرجس بانو رکھ دیا ہے اور اس کی تعلیم
 و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ وہ تہما زندگی
 گزارتے رہے تھے۔ ظاہر ہے، اتنے عرصے سے
 اپنی جھاڑوں، اپنی پناہ میں رکھنے کے بعد اس سے
 جدائی کا تصور ہی ان کے لیے عذاب ہو گا۔ کون
 انہیں بتائے کہ مجھ سے اس کا ملنا، اپنی بیٹی سے ان
 کی دوری نہیں ہے۔ ان کا تو بڑا احسان ہے کہ وہ
 اتنے عرصے تک اس کی پاس بانی کرتے رہے۔ وہ
 اس وقت اس کے سر پر ہاتھ نہ رکھتے تو اس کا کیا
 حال ہوتا۔ وہ تو شاید زندہ نہ رہتی، پھر میں بھی کہاں
 جاتا۔ مولوی صاحب اچھی طرح یہ بات جانتے
 ہیں۔ ان کی نگرانی اور ایثار اپنی جگہ، وہ تو میرے
 آسرے پر زندہ رہی ہے۔ وہ مسلسل میری تلاش
 کے بہانے بناتے رہے ہوں گے لیکن کب
 تک..... ایک دن..... انہیں سمجھنا چاہیے، ایک دن
 اس کی امید نوٹ بھی سکتی ہے۔ جس دن ایسا ہوا،
 جب تب..... ”میری آواز تعلق میں پھنس گئی اور میں
 نے اپنا منہ چھپا لیا۔

”تاہ..... تاہمیاں۔“ اکبر علی خاں کرسی سے
 اٹھ کے بے تابانہ میرے پاس آگئے اور انہوں نے
 میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ ”میرے
 پیارے، میری جان! آپ تو، آپ تو بہت باہمت
 ہو جوان ہیں۔ یہ کیا، یہ کیا..... نہیں میاں، بالکل
 نہیں یہ آنسو آپ کو زیب نہیں دیتے۔“

سینس ڈائجسٹ کا مقبول عام سلسلہ

تحریر: حفیظ اقبال

راوی: عارف چوہدری

قیمت فی حصہ: 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ: 23 روپے

4 جلدوں میں مکمل

جھنگل

ایک ناکرہ گناہگار شخص کے گناہوں کی روداد وہ
 جہنم سے پہنچے کیلئے جرم کی دلدل میں گھس گیا تھا

مکمل سیر منگولنے پر
 خصوصی قیمت 250 روپے

راوی کی لطیف اور مہربان لہروں سے
 لوریاں سن کر پروان چڑھنے والے
 عارف چوہدری کی ہنگامہ خیز زندگی کا
 فسانہ عجائب و تقریر اسے حوادث کی
 گود میں ڈال کر بھول گئی تھی

ترقی اور کامیابی کے جنون
 میں تاریک راہوں میں
 مارے جانے والوں
 کی غیر حاکم داستان
 قارئین کے لیے خاص اور نیا
 شکل میں شائع کی جا رہی ہے

کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ، منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال فرمائیں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802551-5895313 فکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 فیز 111 سیکسٹین ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

ان کی تسلی دلا سے میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں۔

انہوں نے راہ داری میں ایک کی موجودی کا احساس دلانے کے لیے مجھے کہنی ماری۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے خود پر قابو پا ہی نہیں رہا۔

”کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔“ وہ میری کمر ٹھونکتے ہوئے بولے۔ ”دیکھنا، ایک دن بہت جلد..... انشاء اللہ جلد ہی آپ کی مراد برآئے گی۔ آپ کی لگن بچی ہے، آپ کا ایک عزم ہے تو..... یہ عزم راہ گاہیں جانے گا مياں۔“

”مگر یہ سفر میں، جگہ جگہ، بار بار یہ رکاوٹیں جو آجاتی ہیں۔ ہم کسی سے سروکار نہیں رکھنا چاہتے مگر اچانک دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جیسے یہاں، بتائیے میرا کیا قصور تھا..... کیا کیا بتاؤں آپ کو..... کہاں کیسے کیسے حادثوں، ان ہونیوں سے واسطہ پڑا ہے۔“

”کچھ نہ بتائیے اب..... پھر سہی، کل سہی۔ بندھا مجھے اندازہ نہیں تھا، یہ ذکر آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ یہ سارا کچھ سن کے میری حالت اضطراری ہے۔ آپ پر کیا گزرتی رہی ہوگی۔ اب میری سمجھ میں بہت کچھ آچکا ہے۔ خدا آپ کو سکون دے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ آپ کی آنکھوں اور چہرے پر یہ غبار خالی از علت نہیں ہوگا۔ لیکن اتنا کچھ..... میرے سامان دنگان میں نہ تھا۔ کاش میرے پاس کوئی دوا دوا ہوتا، میں کچھ کر سکتا مگر..... مگر ہاں، یہ ممکن ہے کہ اب میں بھی آپ کے ساتھ چلوں جیسے بھائی صاحب آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں بھی جاؤں گا۔ شہر، شہر، کلی کلی انہیں تلاش کروں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک سہل جائیں، میں دوسری..... نہ بہت کو میں یہ سارا کچھ بتاؤں گا تو وہ بھی مجھے نہیں روکیں گی بلکہ حوصلہ افزائی کریں گی۔“

میں بھری ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

ایک نے آکے بتایا کہ ایک نچ چکا ہے۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ اکبر علی خاں نے دتی گھڑی دیکھی اور اضطراری لہجے میں بولے۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔ جانے کو جی تو نہیں چاہتا۔ دیر کا کہہ کے آیا تھا، نہ آنے کا کہہ کے آتا تو بات دوسری ہوتی۔ خاصی رات ہوئی ہے۔ کل صبح جلد ہی آ جاؤں گا۔ صبح تک ٹکٹے سے بھی کوئی نہ کوئی آ جائے گا۔ بھائی صاحب بھی، اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہو رہے ہیں۔ اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔ کل آپ کو کچھ فراغت ہو جائے گی، پھر بیٹھیں گے اور سوچیں گے۔ میں اچھا منتظم بھی ہوں۔ دیکھیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے سکون کی تلقین کر رہے تھے لیکن خود ان پر ہجانہ سا طاری تھا۔ حرکات و سکنات میں بڑی بے فراری تھی۔ وہ منع کر رہے تھے لیکن صدر دروازے تک مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ راستے میں ان کی دل جوئی کے لیے میں نے کہا۔ ”آپ یہاں، مگر دوپیش کے ماعول کے بارے میں شکوہ کر رہے تھے، اس وقت میں کہتے کہتے رو گیا، چند دنوں کے لیے سہی، آپ بھابھی صاحبہ اور بچے فیض آباد آئیں۔ وہاں ہماری حویلی میں شاید وہ لوگ مل جائیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔ وہاں آپ کا دل ضرور ملے گا۔“

میری کوشش کامیاب ہوئی، انہوں نے جو شیعہ انداز میں ہاں بھری۔

میں نے کہا۔ ”وہاں ایک گھر ہے، بہت سے گھروں سے الگ۔ یوں سمجھیے کہ خود بہ خود ایسا کچھ بس گیا یا ہو گیا ہے۔ وہاں ایک زمرہ ہے۔ میں کچھ رہتا ہوں کہ پھولوں کے خمیر سے اس کا قسم بنا ہے اور نس نس میں اس کی شہد تپایا ہوا ہے۔ اور وہاں ایک زمرہ ہی نہیں، چھوٹا بھائی جہاں کیر بھی ہے، خانم ہیں اور نیماں ہے۔ دونوں بہت اچھا لگتی ہیں۔ اور سلی ہے، زہرہ ہے، اور فروزاں،

یاسمین ہیں۔ سب کی اپنی ایک داستان ہے۔“

”کیا نام لیا آپ نے؟ آخری نام؟“ وہ چلتے چلتے رک گئے۔

مجھے یاد آیا، فروزاں اور یاسمین کے باپ پٹنہ ہی سے آسن سول گئے تھے اور درس و تدریس ہی سے وابستہ تھے۔ ”شاید آپ جانتے ہوں۔ وہ پہلے اسی شہر میں رہتی تھیں۔ ان کے باپ یہاں پروفیسر تھے۔“

”ہاں ہاں مياں۔ آپ جمال الدین سیفی کی بیٹیوں کی بات تو نہیں کر رہے۔ ان کے والد ایک جدید عالم تھے، فارسی اور شرعی علوم کے ماہر۔ ان کے گھر تو ہمارا خوب آنا جاتا تھا۔ ان کی دو بیاری، بہت پیاری بچیوں سے اپنی بچیوں کا بڑا میل ملاپ تھا مگر وہ آپ کے ہاں، فیض آباد میں.....“ وہ جڑبڑ ہونے لگے۔

”ہم انہیں آسن سول سے فیض آباد لے آئے ہیں، بہت لمبا قصہ ہے۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے، کل بتاؤں گا۔“

”پروفیسر صاحب کا تو آسن سول میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دوست سید محمود علی انہیں آسن سول لے گئے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی میں بھی ایک دو روز کے لیے سید صاحب کے مہمان خانے میں مہمان رہا ہوں، کیا مہمان خانہ ہے۔ بہت متواضع آدمی ہیں وہ، بڑے مرنجیاں مرنج۔“

”اسی نے اپنے دوست فروزاں اور یاسمین کے باپ کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان کی ماں خانم فرخ سے شادی کر لی اور اسے بھی ختم کر دیا۔“

وہ اچھل سے گئے اور ان کی آواز میں ہندی آگئی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے پوری بات بتائیے۔“

”کل صبح، آپ کو بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”مجھے اب نیند نہیں آئے گی مياں۔“

کچھ بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے تو ان کی دھند ددر کرنے کے لیے حویلی کا ذکر چھیڑا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ فروزاں اور یاسمین سے واقف ہوں گے۔ میں نے سرسری طور پر آسن سول میں پیش آنے والا سوال بتائے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس اختصار سے وہ اور بے چین ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ”اب کوئی بات نہیں جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ پہلے فروزاں اور یاسمین کو سید محمود علی کے چنگل، اس کے زعموں سے نکالنا ضروری تھا۔ اس لیے اسے کچھ سہلت مل گئی۔ اس کا حساب باقی ہے اور ہمیں دوبارہ جانا ہے۔ پروفیسر کے اثاثوں کا حساب لینا ہے کہ وہ فروزاں اور یاسمین کا حق ہے۔ عدالتی کارروائی کی ضرورت بڑی تو فروزاں، یاسمین اور نصیر بابا کے علاوہ کچھ اور شہادتیں حاصل کرنا ہیں۔ سید محمود علی کو اس کے انجام تک نہیں پہنچایا تو فروزاں اور یاسمین سے تا انصافی ہوگی۔ اب وہ ہماری ذمے داری ہیں۔“

دیکھنے، سننے، بولنے اور سوچنے کی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ آدمی اتنی حیرتمنی ہی برداشت کر سکتا ہے جتنی اس کی سہلی ہے۔ فروزاں اور یاسمین کا واقعہ مستزاد تھا۔ اکبر علی خاں شدید کش مکش سے دوچار نظر آتے تھے۔ اب انہیں سوال کرنے کا بھی پار نہیں تھا۔ انہیں مجھ پر یقین تھا کہ میں ان سے کچھ غلط نہیں کہوں گا۔ مجھ پر ان کا یہ یقین ان کے لیے مزید رنج اور اضطراب کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ کسی بھوت اور مہالے کا شاہجہان ہوتا آدمی اتنا حیران و پریشان نہیں ہوتا۔

میری گزارش پر کہ ہم دوبارہ بھی ملیں گے اور کل صبح ہی، انہوں نے صدر دروازے کا رخ کیا اور پھر کچھ نہیں کہا۔ ان کی خاموشی کا تاظم اور شور میری آنکھیں دیکھ رہی اور میرے کان سن رہے تھے۔

صدر دروازے کے اندر دروازے کے پتلیوں

بچہ دردی پوش دربان موئے ہے پر ہنسا اونگہ رہا تھا۔ دور سے اس نے ہماری آہیں سنی تھیں۔ سست چلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر پولیس کا پہرا تھا۔ بائیں طرف پنجوں پر چار دیواری سے کمر لگائے اوندھے اوندھے بیٹھے ہوئے چند سپاہی بھی مستعد ہو گئے۔ ہر طرف ہموکا عالم تھا۔ ارد گرد کی عمارتیں بھی جیسے سو رہی ہوں، کچھ فاصلے پر دو تانگے موجود تھے۔ ایک کو میں نے آواز دی تو دوسرا بھی پیدا ہو گیا۔ اس پاس چھائے سکوت سے مجھے گھبراہٹ ہوئی اور میں نے اکبر علی خاں سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلتا ہوں۔ انہیں گھر پہنچانے کے اسی تانگے میں واپس آ جاؤں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا، اعتماد سے بولے۔ ”یہ میرا شہر ہے میاں۔“ مجھ سے گلے مل کے تانگے میں بیٹھا چاہتے تھے کہ رک گئے اور میرا ہاتھ تمام کر مجھے ایک قدم دور لے گئے اور سرگوشی میں کہنے لگے۔ ”ایک بات کہنی تھی آپ سے، بس یوں ہی صبح تک ٹھکتے سے تو کوئی آہی جائے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میدا کے ٹھکانے پر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ میری درخواست ہے۔“

”مگر میرا چاقو اس کے پاس ہے۔ اسے واپس لینا ہے۔ یہ اڈوں کی روایت ہے وہ لوگ کیا سمجھیں گے۔“ میری آواز بیٹھ گئی۔

”کوئی اور صورت نکال لیجیے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ سوچ لیجیے۔“

”نہیں آپ کو میری ناکامی کا اندیشہ تو نہیں۔۔۔۔۔۔ بے شک یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن جانا تو ہے، جانا تو چاہیے۔۔۔۔۔۔ اور ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں۔“

”ہوئیے تو نظر ثانی کیجیے، میری التا ہے۔“

”آپ یہی بائیں کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، صبح بات ہوئی۔ کسی دوسری

صورت پر غور کریں گے۔ انہوں نے میرے گلے ٹھکے اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ سناٹے میں تانگے کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ جب تک تانگہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا، میں وہیں کھڑا رہا۔

ایک جاگ رہی تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی ناراض ہونے لگی۔ ”اب تم بھی کچھ دیر آرام کرو، میں دیکھ رہی ہوں، تم اپنے آپ سے بہت زیادتی کر رہے ہو۔ نو جوانی کو اتنا زیر بار نہیں کرتے میرے پیارے بچے۔“

صوفے پر بیٹھ کے میں نے بیز پھیلا دیے اور میرا جسم بکھر سا گیا۔ ایک بھی میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”سرسریں درد تو نہیں؟“ اس کی آواز سے شفقت چھلک رہی تھی۔

”نہیں، بس کچھ تھکن سی ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ہوگی نا۔ گوشت پوست ہی کے سنے ہو۔ تم ایسے نہیں آرام کرو گے۔ میں تمہیں نیند کی گولیاں دیتی ہوں، انہیں ایک گہری نیند کی ضرورت ہے۔“

جبری آرام، آرام تو نہیں ہوا۔ میں نے بس کہا۔

جو بچے کہنا نہیں مانتے، انہیں اسی طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ اب سیدھی طرح اٹھ کے اپنے بستر پر جاؤ۔۔۔۔۔۔ چلو اٹھو۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھا دیا اور بستر تک لے آئی۔ میں بستر پر دراز ہوا تو اس نے میرے بیز چادر سے ڈھانپ دیے اور سرہانے بیٹھ کے میری پیٹھ پر ہاتھ پال سہلانے لگی۔ مجھے امی کی یاد آئی۔ ”ابھی بستر پر لینا میں محبت اور دیواریں ٹکٹارہا تھا۔ رات کو میری کھلی آنکھیں دیکھ کے امی بھی کچھ اسی طرح میرے سرہانے آ کے سر دہانی اور ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھیں۔ اسی میں مجھے نیند آ جاتی تھی۔ آج بھی یہی

ہوا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی، کب آنکھ لگی اور کب ایکی سرہانے سے اٹھی۔

صبح ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ نیند کا دورانیہ زندگی میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ نیند تو نصف موت ہے۔ صبح کمرے میں وارڈ بوائے کی کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو امی نے ناشتہ تیار رکھا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ابھی تک جامو، جھرو اور زور امی سے کوئی نہیں آیا تھا۔ شاید انہیں وقت پر تیار نہیں مل سکا ہو۔ ہر حال صبح شعل کی حالت کچھ اور بہتر نظر آرہی تھی۔ میری آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں میں جھنش ہوئی۔ میں نے دانستہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رائے کو آنا ہی تھا۔ میں نے کھل کو تانا چاہا تھا کہ ٹکٹے تارو سے دباے، وہاں سے کوئی نہ کوئی آنے والا ہی ہوگا لیکن اس کے دماغ پر زور پڑنے کے خیال سے میں رک گیا۔

ڈاکٹر رائے ٹھیک دس بجے آیا۔ اس کے ساتھ دو نو جوان ڈاکٹر بھی تھے۔ جانے کیوں اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے سے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ کسی ایک سوال کا کل نہیں تھا، میں خاموشی سے باہر آ گیا اور میرے ٹکٹے کے بعد ایکی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

میں راہ داری کے ساتھ مجھے سبزہ زار پر آ کے بیٹھ گیا۔ اکبر علی خاں کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ رات انہوں نے کہا تھا کہ ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔ ڈاکٹر رائے کو کمرے میں نصیر سے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے۔ آٹھ بجے راہ داری کے کونے پر اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ خاصا بدخواس نظر آ رہا تھا۔ میرا ہاتھ ٹھکا اور میں فوراً کرسی سے اٹھ گیا۔ لڑکا کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ دروازہ بند دیکھ کے منتشر ہوا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور اس نے ٹوٹی

پھولی آواز میں بتایا۔ ”بڑے صاحب کا خون ہو گیا۔“ یہ کہتے ہی وہ روئے اور پٹکنے لگا۔

مجھے اپنے ہوش دھواس پر شبہ ہوا، لیکن لڑکے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا تھا اور وہ وہی لڑکا تھا جو اکبر علی خاں کے ساتھ آتا رہا تھا۔

”بڑے صاحب کا خون ہو گیا صاحب!“ وہ بلک رہا تھا اور میری ٹانگوں سے لپٹ کے اس نے دوا بلا شروع کر دیا تھا۔

”کیا۔۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا، ”کیا بک رہے ہو؟ کون بڑے صاحب؟“

اس سے پہلے کہ میں اسے ٹھوکر مار کے خود سے دور کرتا، اپنے پیروں سے اٹھا کے اسے ٹھانچے مارتا، اس نے ہڈیاں انداز میں بتایا کہ صبح نماز کے وقت مسجد جانے کے لیے لوگ باہر نکلے تو انہوں نے مسجد اور اکبر علی خاں کے کمرے کے نزدیک ہانیچے کی باڑ میں ان کی لاش دیکھی، خون میں لت پت۔۔۔۔۔۔ لڑکے کی زبان اکڑ گئی اور وہ میرے قدموں پر سر پٹکنے لگا۔

وہ جانے کیا کہتا رہا، میں گنگ کھڑا اسے دیکھا گیا۔

”آپ چلو صاحب ابھی پیچم صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔ اس نے گھٹایا کر کہا۔

میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میری رنگوں میں خون جم گیا تھا اور آنکھوں پر اندھیرا چھانے لگا تھا۔

اسی لمحے نرس ایکی کمرے کے دروازے سے مجھے پکارتی ہوئی باہر نکلی اور میرے پاس آ کے ٹھٹک گئی۔ اس کی آمد پر لڑکے نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں اور مجھ سے دور ہو گیا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”کیا۔۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟“ ایکی نے جڑ بڑا کے پوچھا۔

میں اسے کیا بتاتا۔ میری خاموشی پر وہ لڑکے کا

کندھا جھوڑنے لگی۔ ”کیا ہے؟ کیا بات ہے؟ تم روتا کیوں ہے؟“

لڑکے نے پہلے میری طرف دیکھا پھر سسکتی آواز میں ایکی کی سماعت کو آزمائش سے دوچار کیا۔ ”کا..... کا بولتا ہے؟“ ایکی سر اسٹیکسی سے بولی۔ ”ایسا کیسے؟ نہیں، نہیں۔“

لڑکا سر جھکائے روتا رہا۔ ایکی نے مجھے ٹھوکا دیا اور تصدیق چاہی۔ میری جانب دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ عمر رسیدگی سے برداشت مشروط ہے۔ اس نے لڑکے کی کمر چپکلی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آدھی انگریزی، آدھی ہندوستانی میں تسلی دلا سے دینے لگی۔ اس نے لڑکے کو گھر واپس جانے کی ہدایت کی۔ لڑکے نے مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا۔

”تم ابھی ایدر سے جاؤ۔“ ایکی نے حکم انداز میں کہا، ”جاؤ ابھی۔“

لڑکا کچھ دیر شاید میرے کچھ کہنے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل بڑا کر ایکی نے میرا ہاتھ جڑکے مجھے روک لیا اور لڑکے کو چل جانے کا اشارہ کیا۔ ”مے کو سنبھالو۔“ خود اس کی آواز کھری ہوئی تھی۔ ”ایسا کیسے ہو گیا، ابھی رات کو تو وہ..... نہیں نہیں۔“ وہ سر جھٹکتے لگی۔ ”ایسا کیسے۔“ میں پھرانی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بے رطبی سے انگریزی میں کہا۔ ”ڈاکٹر رائے تمہیں اندر بلا رہے ہیں۔ تمہارے بھائی کی حالت اس وقت خاصی برے ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے کچھ باتیں کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تم ابھی اندر چلو مگر..... مگر تمہارا اس وقت اندر جانا..... میں ڈاکٹر سے کیا کہوں؟“ وہ بری طرح بدحواس نظر آ رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے، میں اندر جا کے دیکھتی ہوں۔ نہیں جانا مت..... نہیں بھی نہیں۔“

مجھے۔“

مجھے تنہا چھوڑ کے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کئی بار مجھے مڑکے دیکھا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے وہیں راہ داری کے چبوترے پر بیٹھنا چاہا لیکن دوسرے لمبے دو تین ڈاکٹروں کے ساتھ ڈاکٹر رائے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور میری جانب لپکتا ہوا آیا۔ ”کیا..... کیا کہتی ہے یہ ایکی؟“ اس نے وحشت آمیز لہجے میں کہا اور ایک سانس میں جانے کیا کچھ کہتا اور پوچھتا رہا۔

میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے جھنجھتی آواز میں پوچھا۔

ایکی بھی کمرے سے آگئی تھی۔ اسکی دخل اندازی پر ڈاکٹر رائے نے پھر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ایکی ہی اس سے کچھ کھس پھس کرتی رہی۔ کچھ لمحوں تک ڈاکٹر خاموش رہا پھر میرا بازو تھام کے مجھے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا کہ لوٹ پڑا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو آگے چلے جانے کی تاکید کی اور خیر قدموں سے راہ داری میں چلتا ہوا کچھ دیر بعد ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک مختصر اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ وہاں موجود نرس اور ڈاکٹر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر رائے کے تہہ سے انہوں نے اس کا عندیہ سمجھ لیا اور سیٹ بناتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میز کے اطراف رہی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر مجھے بٹھا کے ڈاکٹر رائے میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے معلوم ہے، یہ سن کے تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”لیکن یہ ایسا وقت نہیں جو تم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟“

”کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب!“ میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”مجھ سے ذرا ہوش میں آ کے بات کرو۔“ ڈاکٹر رائے کا لہجہ ترش ہو گیا۔ ”رات کو کتنے بجے تک وکیل صاحب تمہارے ساتھ تھے؟“

”وہ ایک بجے کے بعد یہاں سے اٹھے تھے۔“

”ایک بجے کے بعد؟“ وہ جزیرہ کے بولا۔

”نرس ایکی نے آ کے ہمیں ٹوکا تھا کہ ایک بج چکا ہے۔ وہ فوراً اٹھ گئے، لیکن اس کے بعد بھی وہ کوئی عین پچیس منٹ بعد اسپتال سے رخصت ہوئے تھے۔ اس دوران صدر دروازے کے راستے

میں وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے۔ یہاں سے جانے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر گھر کہہ کے نہیں آئے تھے وہ۔ صدر دروازے پر میں نے ان سے

کہا ایکی میں ساتھ چلتا ہوں، اسی ناکے سے واپس آ جاؤں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے، یہ میرا شہر ہے سناں، بہت اعتماد تھا، انہیں اپنے.....“

”پھر تم اپنے کمرے میں واپس آ گئے؟“

”جی ہاں، رات بہت ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں جاگتا رہا، پھر نیند آ گئی۔“

ڈاکٹر چند لمبے چپ رہا، پھر بولا، ”انہوں نے کسی کا کیا بڑا تھا۔ وہ اس شہر کے مشہور وکیل تھے،

سمجھ کے رہنے والے، بہت خاندانی آدمی۔ کون ان کا دشمن ہو سکتا ہے؟“

میرے سینے میں آگ سی بھڑکی۔ میں نے کچھ کہا جا یا اور مشکل سے اپنی زبان بند رکھی۔

”تمہاری ان سے اس شہر میں آنے کے بعد ملاقات ہوئی تھی؟“ ڈاکٹر کے تندہ تیز لہجے سے مجھے اور

میں ہونے لگی۔ ”اس سے پہلے تم انہیں نہیں جانتے تھے؟“

”دون ہی۔“ میں نے مختصر کہا۔ ”میں دو دن

صاحب! پہلے بھی کتنی بار ایسا ہو چکا ہے۔ یہاں بھی

”رات وہ تم سے کیا باتیں کرتے رہے؟“

”میں اپنے گھر بیوی بچوں کی۔“

”اور تم کہتے ہو، تمہاری جان پہچان کو دو ہی دن ہوئے تھے۔“ ڈاکٹر کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

”لیکن اس مختصر مدت میں وہ مجھے بہت قریب سمجھنے لگے تھے۔ وہ بہت اچھے، بڑے صاف دل آدمی تھے میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔

لگتا تھا، جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ میرا جی اٹھنے لگا اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

”ہاں، تا اس طرح نہیں۔“ وہ تنبیہی آواز میں بولا۔ ”تمہیں اندازہ ہے، پولیس کسی بھی وقت یہاں

آ کے تم سے تفتیش کرے گی۔ ممکن ہے، راستے میں جو۔ برہنہ ہو گا کہ اس کے آنے سے پہلے مجھے صاف

صاف بتاؤ۔ مجھے شبہ ہے، تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اور اب بھی یہی کر رہے ہو۔ اصل بات سے

واقف ہو کے شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔“

میں سر جھکائے بیٹھا اپنے آپ کو نوچتا رہا۔

”تمہارا کسی پر شبہ ہو تو بتاؤ۔ تم سے رات

انہوں نے اتنی باتیں کی تھیں۔ کسی کی طرف انہوں نے کوئی اشارہ کیا، کوئی ایسی بات؟“ ڈاکٹر کی

پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

میں اسے کیا بتاتا، کیا نہیں۔ خاموشی کا اب کوئی

محل بھی نہیں تھا۔ جلد، یا بد پر، اب تو سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ میں نے کھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سب

کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”کیا؟“ ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ ”کیا کہتے ہو تمہاری وجہ سے؟“

”میرا منہ سب سے بڑا ہو گیا تھا۔“

”کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔“

”ایک جگہ اور ایک آدمی کی بات نہیں ڈاکٹر

صاحب! پہلے بھی کتنی بار ایسا ہو چکا ہے۔ یہاں بھی

یہی ہوں۔

”تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوشاید۔“
ڈاکٹر رائے کا چہرہ مگر گیا۔

”یہی کچھ ہے ڈاکٹر صاحب! نہ ہم یہاں آئے، نہ انھونی اپنی جان سے جانا، نہ اکبر علی خاں اور..... اور نہ کوئی اور.....“

”انھونی! انھونی کا اس سے کیا تعلق ہے؟“
ڈاکٹر رائے پھر کے بولا۔

”آپ نہیں سمجھیں گے۔“ میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ”میں آپ کو کیا بتاؤں، ہم بہت برے لوگ ہیں ڈاکٹر صاحب۔“

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور جبری ساضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کل کے بتاؤ دوست! میں واقعی کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا تم کوئی برے آدمی ہو، تم یا تمہارا بھائی.....“

”آپ ایک دوسرے، ایک مثبت آدمی ہیں، بہتر ہوگا، آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ بہت الجھ جائیں گے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ ایسی باتیں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں۔ ہم بھگتتے رہتے ہیں، لیکن آپ.....“
ڈاکٹر جھپکتی نگاہوں سے تادیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم کون ہو؟“

درستی کے باوجود اس کے لہجے سے بہت عیاں تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بے اعتنائی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو تو کہو، ورنہ مجھے اور بہت سے کام ہیں۔ میرا کوئی زیاں نہیں کہ میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔ تم یہاں اس اسپتال میں ہو اور کسی طور اس انفسس ٹاک وائے کا تعلق اسپتال سے بھی نکل آتا ہے اور اسپتال کا اپنا ایک نام اور اپنی ایک عزت ہے۔ مجھے تم پہلی نظر میں بہت سے نوجوانوں سے ایک مختلف نوجوان نظر آئے تھے، اس لیے.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور پہلو بد لئے لگا۔

”ایسی باتیں نہ کیجیے ڈاکٹر صاحب!“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ نے مجھ ایک اجنبی کو بہت عزیز رکھا ہے بہت اچھا سلوک کیا ہے مجھ سے، لیکن میری بد قسمتی ہے، عزت مجھے راس نہیں آتی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ بہت سیدھی سی بات ہے۔ اپنے بھائی کے علاج کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا تھا۔ بھائی کی کیا حالت تھی اور آپ کیا ہے، یہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم تو نہیں اور جارہے تھے۔ بس یہاں آ کے مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی۔ غلطی تھی بھی، یا نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایک ذرا سی بات اتنی دور تک جاسکتی ہے، پھر ایک کے بعد ان ہونی، ناگہانی سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ میں آپ کو کیا کیا اور کس حد تک بتاتا کہ پرسوں آدھی رات کے بعد آنے والے لوگ کسی اور کی نہیں، میری جستجو..... میں آئے تھے۔ نرس ایکی نے احتیاط کی، جانے کیا سوچ کے اس نے منع کر دیا کہ میں کمرے میں موجود نہیں ہوں۔ انہیں محبت کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ادھر سے اسپتال کے عملے نے شور مچا دیا۔ ان کے تعاقب سے وہ درندے بوکھلا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے، مگر صدر دروازے پر انھونی ان کے آڑے آگیا اور اپنی جان دے بیٹھا۔ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے آئے تھے۔

میں کل صبح بھی آپ کو اصل بات بتا سکتا تھا کہ انھونی کیوں مارا گیا۔ وہ غریب تو ایک طرح سے چارابن گیا..... اور اس نوجوان سے زندگی چھیننے والے ہی نہیں، اس سے پہلے، آپ کو یاد ہوگا، کمرے میں آپ کی موجودگی کے درمیان جو پولیس افسر آئے تھے، وہ بھی اس سلسلے کی کڑی تھے۔ پردہ پوشی بے مصلحت نہیں تھی ڈاکٹر صاحب! آپ میرے بھائی کا علاج جس تین دہی سے کر رہے ہیں آپ نے میری سب باتیں جس عمل اور ناز سے برداشت کیں، میرا تو رڈاں رڈاں آپ کا احسان

مند ہے۔ میری جگہ آپ ہوتے تو شاید یہی کچھ کرتے۔ میرے اور بھائی کے بارے میں آپ کے کسی ناخوش گوار تاثر سے بھائی کا علاج متاثر ہونے کا اندیشہ ہے چاہو نہیں تھا۔ بھائی بیمار سے اور آپ ڈاکٹر ہیں۔ کسی اور جانب آپ کی توجہ بٹھک جائے، ان ناگفتگی سے آپ کو دور رکھئے، خواہ خواہ آپ کے منتشر اور پریشان ہو جانے کے خیال سے میں نے زبان بند رکھی۔ ایسی کو میں نے سارا کچھ بتا دیا تھا اور بہت کچھ نرس سیوریس کو بھی۔ میری التجا پر وہ خاموش رہیں۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“ ڈاکٹر رائے اچھے کے بولا۔ اس کے چہرے پر وحشت چھائی تھی۔

”آجائے گا اب سبھی کچھ۔“ میں نے ناتوانی سے کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ نہیں چھپانا۔ روئے کا اب کچھ حاصل نہیں۔ آپ جو چاہیں، فیصلہ کریں۔ جو ہو چکا ہے، اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے۔“

”میں، میں جانا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر حتی لہجے میں بولا۔

میں نے اسے شہل کو اسپتال میں داخل کرنے کے بعد دوسری صبح لباس تبدیل کرنے لیے ہوٹل جانے اور ڈاک خانے جا کے گھر تار دینے، بنوا چھن جانے پر چوکا پچھا کرنے اور وہاں پیش آنے والے حادثے کے متعلق بتایا۔ میں نے کہا، ”مجھے جلد از جلد اسپتال واپس پہنچنا چاہیے تھا۔ لیکن ادھر پولیس نے تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں تھی، لیکن سامنے آ جانے کے بعد پولیس کے طریق کار، بری کارروائیوں، تحقیقی مراحل سے گزرنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ شہر میں میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ ایک جھوم تانگے کے پیچھے تھا، پولیس کے علاوہ، عام لوگ بھی۔ ایک جگہ بڑک کے موٹر پر تانگا جھوم سے اوڑھل ہوا تھا کہ تانگے سے کود کے میں قریب کی ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ راستے

معلوم نہیں تھے، گلیوں گلیوں بھٹکتا رہا، پھر ایک جگہ جھوم کا شور سن کے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کے میں نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں آنے والے شخص کو اپنی مشکل بتانے اور کچھ دیر کے لیے پناہ کی بھیک مانگنے کا نتیجہ بہتر نکلنے کی توقع نہیں تھی۔ اپنی صفائیوں اور صراحتوں کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ گلی کا کوئی راہ گیر مجھے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا مکان کے کئین سے جھٹ کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں کو تانگے والے نے یقیناً بتا دیا ہوگا کہ میں کس جگہ، کس طرف کی گلیوں میں گم ہوا ہوں گا جو ان کا رخ اس طرف ہو گیا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازے پر خوددار ہونے والے شخص کو مجھے چاقو کی زد پر لپٹا پڑا۔ اسے گھر میں دھکیلتے ہوئے میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ صاحب اکبر علی خاں تھے۔

”اکبر علی خاں اوکیل صاحب؟“ ڈاکٹر رائے حیرانی سے بولا۔

”وہ بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سبھی کا جو حال ہوتا تھا، وہ ہوا۔ کئینوں کی بود بپاش، طور اطوار اور اپنے لیے اس گھر کی صورت حال سے مطمئن ہو کے میں نے اس طرح ان کے گھر میں گھسنے پر معذرت چاہی۔ اپنی آمد کا مقصد بتایا اور کچھ دیر پہلے ڈاک خانے والی گلی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ میں نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگا تھا، نہ کسی کو زدک پہنچائی تھی۔ پناہ کے سوا میرا کوئی اور مطالبہ بھی نہیں تھا۔ اوکیل صاحب نے میری روداد توجہ سے سنی۔ وہ دنیا دیکھے ہوئے ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔ انہیں مجھ پر یقین آ گیا۔ میں نے بھی پھر ان پر اعتبار کر کے چاقو جیب میں رکھ لیا اور بیوی بچوں کو بیٹھک سے گھر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔“

”تم سچ بول رہے ہو؟“

”میرے پاس یہی کچھ ہے کہنے کے لیے۔“ میں نے کشیدہ لہجے میں کہا۔

”تم ہمیشہ چاقو پاس رکھتے ہو؟“

میں نے سر جھٹکے پر انکشافی۔

”مگر کیوں؟ کس لیے؟“

”ہمیں ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر کی پھلکی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ ”تو تم نے اکبر علی خاں صاحب کو قاتل کر لیا۔“

میں نے اپنے بتایا، یہ اتفاق تھا، یا یوں کہیے، میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اکبر علی خاں جیسے صاحب دل کے مکان پر دستک دی۔ انہوں نے مجھ سے ہم ردی کا اظہار کیا اور مجھے اس عذاب سے نجات دلانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں پر غور کرتے رہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں جس آدمی کی پالی میں چاقو پھوست ہو گیا تھا اور جس بدحواس آدمی نے ناچنگی اور نادانستگی میں اپنے ہی ساتھی کو زخمی کر دیا تھا وہ اور وہ تیسرا بھی، جس نے میری جیب سے ہوا چیرا چیرا تھا، تینوں شہر کے نامی گرامی استاد میدا کے آدمی تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی زبانی مجھے میدا استاد سے ان کی وابستگی کا علم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ ہر جگہ، شہر کے دادا، یا استاد کے اڈے کی بہت چھائی رہتی ہے۔ پولیس بھی کسی سنگین واردات میں دادا اور اس کے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے دس مرتبہ سوچتی ہے۔ ظاہر ہے، میدا استاد کے آدمیوں کے اشارے پر پولیس حرکت میں آتی تھی۔ میدا کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ میں تو فوراً گلی سے چلا آیا تھا۔ اس تمام واقعے کے گواہ گلی کے کئین اور راہ گیر تھے، لیکن یہ میدا استاد کے

اڈے کا معاملہ تھا۔ گلی کے لوگ اور راہ گیر اس کے زور و اثر سے واقف تھے۔ طاقت سب سے بڑا بچ ہوئی ہے۔ اڈے کے ساتھیوں اور عام لوگوں کی نظروں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے استاد میدا کو فوراً سرگرم ہو جانا چاہیے تھا۔ پولیس اور شہر میں بکھرے ہوئے میدا کے ساتھیوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے اسپتال پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اکبر علی خاں نے معاملہ دب جانے تک مجھے اپنے گھر میں روپوش ہونے کا مشورہ دیا اور مہربانی کی انتہا کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میری عدم موجودی میں وہ اسپتال جا کے شہل کی خبر گیری، نگرانی کرتے رہیں گے۔ اس دوران، بدتر ہوگا کہ میں تار دے کے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو یہاں بلا لوں، مگر ان کا کوئی مشورہ صاحب نہیں لگتا تھا۔ مجھے یاد تھا ڈاک خانے والی گلی میں، میں نے میدا کے بد مزاج ساتھیوں سے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ تانگے والا بھی مجھے اسپتال سے ہوٹل، پھر ڈاک خانے لے گیا تھا اور واپسی میں بھی اس کا رخ اسپتال ہی کی طرف تھا۔ ان شواہد اور اسپتال سے میرے غیاب اور اکبر علی خاں کی موجودی سے وہ ساری صورت حال بھانپ لیتے اور یوں اپنے گھر میں مجھے پناہ دینے کی فیاضی اکبر علی خاں کو بڑی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ شہل کو اس حالت میں تنہا چھوڑا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مریش کو پھوڑ کے تیار دار کے غائب ہو جانے پر سب سے زیادہ وحشت اسی کو ہوتی، اس کے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہم نہو پاتے، اسپتال کے عملے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگتیں، ویسے بھی مجھے یقین تھا میں اسپتال پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاؤں تو جلد یا بدیر میدا اور اس کے حاشیہ بردار سرا پکڑے ہوئے میرے سر پر آدھکیں گے۔ میں نے اکبر علی خاں کے سارے مشورے مسترد کر دیے اور

میدان استاد سے بہ ذات خود نکلے گا ارادہ کیا۔ اکبر علی خاں نے مجھے بہت کھلیا بھلیا۔ میدان جیسے خطرناک آدمی ہے دور رہنے کی تلقین کی، لیکن پھر اور کیا صورت تھی۔ میرے ارادے میں کوئی ٹپک نہ دیکھ کہ انہوں نے خود بھی میرے ساتھ چلنے کی جرأت لی۔ میں انہیں اس معاملے سے الگ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں مانے اور ہم دونوں میدان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

”میدان کے ٹھکانے پر؟“ ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ ”یہ جانتے ہوئے کہ میدان کون آدمی ہے۔“

”پھر میں کیا کرتا۔ یہی ایک آخری راستہ رہ جاتا تھا۔ میں خود اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے کچھ بتاؤں کہ میں نے اس کا کوئی آدمی دیکھا نہیں کیا ہے۔ میں ایسے وقت جب میرا بھائی زندگی کے لیے ہمدردی کر رہا ہے، کس طرح کسی عناد و فساد کا خطرہ بھول لے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اڈے کے طور پر لڑتیوں میں کھرا ہے جیسا کہ اڈوں کی چوکی پر بیٹھنے والے لڑکے تر دادا، استاد لوگ ہوتے ہیں تو وہ میری بات سنے گا۔ میں میں اس سے کہوں گا کہ مجی کے لوگوں سے تصدیق کیے بغیر اسے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میرا ہوا چھینا گیا تھا۔ چوروں کا تعاقب کر کے اور اسے زیر کر کے میں نے ہوا حاصل کر لیا کیا غلط کیا تھا۔ پھر اس کے دو ساتھی اپنے چور ساتھی کا انجام دیکھنے کے باوجود زیادتی پر کیوں اتر گئے۔ انہیں جاننا چاہیے تھا کہ کوئی آدمی، چور کو قابو کر سکتا ہے تو ان کے لیے بھی بھاری پڑ سکتا ہے۔ وہ چند ہاتھ کے بھی نہیں تھے۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے ہاتھ باندھے رکھے، اپنا چاقو بھی نہیں نکالا۔ وہ دونوں جانے کس شمار میں تھے، اپنے ساتھی کی ہزیمت سے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ رنے مارنے پر تل پڑے۔ رفع شر کے لیے میں نے اپنا ہوا بھی ان کی نذر کرنا چاہا۔ مٹی کے لوگوں کو میدان کی ہیبت دہشت سے امان ملے تو ضرور جج

بولیں گے۔ میں نے سوچا، میدان سے کہوں گا کہ میری اس کی کوئی عداوت نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بھائی کی وجہ سے اس شہر میں رکنا پڑا۔ حقیقت اس سے کچھ دور نہیں ہے۔ اسے پٹنا میڈیکل کالج کے اسپتال تک جانے کی زحمت کرنا پڑے گی لیکن میدان کے سامنے جا کے میں نے یہ کچھ نہیں کہا۔ ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے بہت عرصے سے چاقو اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ جسم پر چربی کی بلکی سی تہہ جم چکی تھی۔ آدمی کے جسم پر اتنی چربی لوہے سے چھٹنے والے زنگ کے مانند ہوتی ہے۔

میں نے استاد میدان سے کہا، میں اڈے کی چوکی کا دعوے دار بن گئے آیا ہوں۔ اڈوں کی جوہریت ہے، وہ چوکی سے خود اتر جائے یا پھر چاقو نکال کے تمام ساتھیوں کے سامنے دعوے دار سے زور کرے اور چوکی پر موجود رہنے کا حق ثابت کرے۔“

”تم نے اس کے ٹھکانے پر جا کے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دی؟“ ڈاکٹر رائے بیچانی آواز میں بولا، ”تم..... تم۔“ وہ ہلکانے لگا اور اس نے پوچھا، ”کس اعتماد میں.....؟“

”کہ میں اسے زیر کر لوں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”یعنی تم اسے زیر کر سکتے تھے؟“

”کسی قدر امکان مغلوب ہو جانے کا بھی تھا۔“

”تو، تو کیا ہوتا؟“ ڈاکٹر رائے تلخی سے پوچھا۔

”میں زیر ہو جاتا۔ یوں بھی تو اس کے ٹکٹے میں تھا۔“

”تمہیں اپنی چاقو بازی پر اتنا اعتماد کس وجہ سے ہے؟“

”صرف چاقو نہیں، اور بھی ایسی کئی چیزوں کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔“

”تربیت دی گئی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اقرار کیا۔ ”میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مجھے یہ سب کچھ سیکھنا پڑا۔“

”تم تو ایک بڑے تھے لیکن جو ان معلوم ہوتے ہو۔“

”یہ بھی ایک تعلیم ہے، اپنے آپ کو خطروں سے نمٹنے کے لیے تیار رکھنا۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔“

اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور اس نے سر ہلا کے متذہب سے تائید کی ”تو میدان چوکی سے اتر آیا؟“

”اتنا آسان نہیں تھا اس کے لیے۔ وہ جانے کب سے اڈے کی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔“ میں نے ڈاکٹر رائے کو ساری تفصیل بتائی کہ اپنے ٹھکانے پر ایک چٹائی کی اس طرح اچانک آمد اور مبارزت کے لیے مسلسل اصرار سے اسے چوکانا اور غلط ہو جانا چاہیے تھا۔ ڈاک خانے والی گلی کا واقعہ بھی پیش نظر ہو گا۔ اڈے پر اس کے تقریباً سارے ساتھی موجود تھے۔ اس کا تو سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا، منصب، عزت، دبدبہ۔ اس نے میرا مذاق اڑانے، بھینٹناں کسنے اور زور آزمائی کے نتیجے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہو جانے، طرح طرح سے میرا عزم شکستہ کرنے اور خبردار کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران اکبر علی خاں نے دخل اندازی کی اور جتنے سوز انداز میں میری پے روی کر سکتے تھے، انہوں نے اپنا ہوا آزمایا۔ انہیں احساس تھا، یہ عدالت نہیں ہے۔ وہ ایک مختلف جگہ پر اور مختلف لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں نت نئی دلیلیں تراشنے اور بیان میں سوز و گداز پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ کل و بیان صداقت پر مبنی ہوں تو ان کی توانائی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کا انداز غیر جانب دارانہ، ناپائا اور جو کچھ میں نے ان سے کہا تھا اور انہوں نے یقین کر لیا تھا، سچسپہ اسی کے مطابق تھا۔ جو کچھ اڈے پر جا کے میں استاد میدان کو باور کرایا چاہتا

تھا اور میدان کو دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا تھا، وہ کام نہایت خوش وقتی سے اکبر علی خاں نے انجام دے دیا تھا۔

اڈے کے لوگوں کے هجوم میں میدان کو اپنی بات بتی رہنے کی بے چینی شدید ہو گئی۔ اکبر علی خاں کے بیان نے اسے کئی جواز فراہم کر دیے تھے، مجھ سے کشادہ دلی کا سلوک کرنے اور سردست یہ تازک مرحلہ حسن دخوبی سے ٹل جانے کے جواز۔ میدان کے پہلو نشین عمر رسیدہ شخص نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس آزمودہ کار نے دریا دلی کے اظہار میں پہل کی اور درمیان کی راہ نکالی اور میدان کو بظاہر باطل تا خواست ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ میدان نے اپنے ساتھیوں کی دل جیسی کے لیے چاقو نکال لیا تھا اور چوکی سے اتر چاہتا تھا کہ بزرگ ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چاقو اپنی تحویل میں لے لیا اور کوئی لمحہ گنوائے بغیر نشانے لے کے میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے اچک لیا۔ میں انکار کر سکتا تھا، لیکن میں نے وقت کی یہ رعایت غنیمت جانی کہ مجھے میدان کے اڈے چوکی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنے کا راستہ صاف کرنا تھا۔ جواب میں میں نے بھی اپنا چاقو بوڑھے آدمی کی طرف اچھال دیا جو اس نے مہارت سے گرفت میں لے لیا۔

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ ڈاکٹر رائے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے اس کٹائے کا مطلب اسے سمجھایا کہ سردست مبارزت ملوثی کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے چاقو ایک دوسرے کے پاس اس وقت تک امانت رہیں گے جب تک میں اپنا چاقو واپس لینے نہ آ جاؤں۔ بزرگ نے میدان کی طرف سے اعلان کیا کہ میدان مبارزت کے لیے آمادہ ہے، لیکن ایسے وقت میں جب اس کی ہم سری کا دعوا کرنے والا، اڈے کی چوکی کا طلب گار اپنے بھائی کی

علاقہ کی وجہ سے پریشان اور منتشر ہے، معرکہ آزمائی مناسب معلوم نہیں ہوئی۔ میدا اپنے مقابل کو ڈہنی پر انگدگی سے چھٹکارا پانے کی مہلت دیتا ہے کہ اس پر مخالف کی مغضربانہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا الزام نہ آنے پائے۔ یہ میدا کے اپنے اطمینان کا معاملہ بھی ہے کہ کسی ایک سو مخالف سے چھہ آزمائی کر کے ناکامی اور کام یابی، دونوں صورتوں میں اسے خود سے کوئی شکایت اور اپنے ساتھیوں کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔ سن رسیدہ آدمی نے مجھے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ یہ مہلت میدا کی اعلاظرفی پر محمول کی جائے۔ میدا مہارزت کے لیے میری جلد از جلد واپسی کا منتظر رہے گا۔

اس الزما میں کئی پہلو مضمر تھے۔ چوکی چھین جانے کا خطرہ میدان کے سر سے مل گیا تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی نظروں میں بڑی حد تک اس کا وقار بحال رہا تھا۔ اس مہلت میں میری طرف سے چوکی کے مطالبے سے دست برداری اور نظر ثانی کا ایک امکان موجود تھا کہ پھانسی کی جھٹ پانی کے بعد میری جانب سے نرمی و نرم دلی کی توقع بجائے طور پر کی جاسکتی تھی۔ میدان کو چوکی بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ اس عرصے میں میرا قصہ تمام کر دینے کی ایک کوشش بھی کی جاسکتی تھی۔ اس مہلت کی بڑی اہمیت تھی۔ فیصلے پر میں نے کوئی جھٹ نہیں کی۔ چا تو کوس کے تباہی کے سے میری مراد میرا اقرار ہی تھی۔ ہم دونوں، میں اور اکبر علی خاں پھر وہاں سے چلے آئے اور راتے میں کوئی دیوار نہ

-جنا-

ڈاکٹر رائے چند لمحے چپ رہا پھر بھاری آواز میں بولا، ”اگر یہ صورت نہ ہوتی؟“ میدا اور تمہارے درمیان ہونے والی زور آزمائی میں تم کامیاب ہو جاتے تو اڈے کے آدمی تمہیں یہ خوشی اپنا استاد قبول کر لیتے؟“

کے لوگ اپنے رہتی رواج کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اڈوں کا یہی دستور ہے کہ سب سے زیادہ زور اور جلد فیصلے کرنے میں طاق اور اڈے کے آدمیوں پر سائبے رہنے کی خواہیاں مستزاد ہیں۔ کسی ناواں اور تجویز کو وہ چوکی پر دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن پسند کی بات اور ہے، انہیں یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اڈے پر موجود استاد کو چوکی سے ہٹا سکیں۔ انہیں یہ جبر کسی اس وقت تک اسے قبول کرنا پڑتا ہے جب تک اس اڈے سے باہر سے چوکی کا ٹوکی نیا طلب گار نہ آجائے اور چوکی پر بیٹھ نہ جائے۔ اڈے کی چوکی کا فیصلہ فرد، فرد ہی کے درمیان ہوتا ہے۔ اڈے کے لوگ باہمی مشاورت سے کسی ایک کو منتخب نہیں کر سکتے۔ ادھر اڈے کی چوکی پر قائم استاد کے سر پر ہمیشہ تلوار لگی رہتی ہے۔ اسے کسی بھی نئے دعوے دار سے مبارزت کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ دعوے دار کس بل میں اس سے زیادہ توانا ہے تو یہ ترکیبی ہوتا ہے، وہ خاموشی سے خود ہی چوکی خالی کر دے۔ خدا اور غصے سے ذلت کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، بزرگ آدمی نے میدان کی عزت رکھ لی۔ اس نے اڈے کے لوگوں کے سامنے ظاہر یہی کیا کہ میدان اس کی بات مان کے اس کا مان رکھا ہے اور بڑا احسان کیا ہے۔“

”تمہیں ان اڈے یا ٹروں کی اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوگی؟“ ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

”مجھے اسی سوال کی توقع تھی۔“ میں نے کسی نامل کے پیچیر جواب دیا۔ ”ہیراڈوں پاڈوں سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ”تو کامیاب ہو جانے کے بعد تم میرا کے اڈے کے مالک بن جاتے۔“ اس نے نکل مار کی۔

174 卷之六

”میں نے آپ کو بتایا ہے۔ میدان کو دیکھ کے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس پر قابو پا جا سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے کسمپاتی آواز میں کہا، ”میں جانا چاہتا ہوں۔ اڑے کے چوکی پر تم بیٹھنا نہیں چاہتے تھے پھر تنہا ہی کام پالی کے بعد اڑے کی سربراہی کی کیا صورت ہوتی؟“

”میں اپنی جگہ کسی کو بھی عارضی طور پر نام زد کر سکتا تھا۔ اس معمر آدمی کو بھی، جو منیڈا کا سرکاری معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اڈے کا سربراہ نہیں ہوتا۔ کسی نئے دعوے دار کے اٹھنے کے..... موقع پر بھی کو اس سے مبارزت کرنی پڑتی۔ اڈے کے عبوری سربراہ کو نہیں۔“

”میرے لیے یہ سارا کچھ حیران کن ہے۔“
ڈاکٹر رائے آنکھیں چمکاتے ہوئے بولا، ”یہ تو ایک
دوسری دنیا ہے۔“

”میں اسی لیے آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔“
ڈاکٹر نے جھرجھری لی۔ ”تم نے کتنا بڑا خطرہ
مول لیا تھا۔ اگر میرا استاد مار بوجاتا اور تم.....“

میں نے اس کے اندیشے کی تردید کی۔ ”چاقو آزمائی کے لیے بل کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ حاضر و ماضی، نگاہ کی رخصتی، مقابل کو حلیوں سے تذبذب کر دینے کی

مٹھائی اور بہت سی برائیاں..... میدا کو مجھ انہی کے
 دروازے پر مہارت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ
 کوئی بھی ہوتا تو یہی تردد کرتا۔ اپنے تین آدمیوں کا
 انجام دیکھنے اور اڈے پر میرے اس طرح آدھکنے
 کے بعد اپنی طور پر رنج ہو جانا، سو اس کے لیے یہی
 مناسب تھا کہ مجھے مہلت دینے کی فیاضی کے
 بجائے اسے کچھ مہلت مل جائے۔“

”تم نے پہلے بھی میدا جیسے کسی استاد سے چاقو
 آزمائی کی ہے؟“

میں اقرار کر لیا۔
 ”واقعی؟“ وہ حیرت سے پوچھا۔ ”اور انجام؟“
 ”انجام بہتر ہونے کی توقع نہ ہو تو اپنے مخالف
 کو دعوت نہیں دینی چاہیے۔“
 ”تو..... تو..... تم بھی کسی اڈے پاڑے کی
 چوکی پر بیٹھتے رہے ہو؟“
 ”جی ہاں، میں نرم ہنگام سے آ رہا ہوں۔“

روز..... ایک بار کچھ زیادہ..... اپنا آدمی مقرر کر کے
میں ہر جگہ سے چل دیا۔“ ڈاکٹر کے کوئی اور سوال
کرنے سے پہلے میں نے صراحت کی۔“ سچی
اڈے حاصل کیے اور اپنی مرضی سے نہیں۔ کسی جگہ
اڈے کے استاد نے کوئی رکاوٹ کھڑی کی یا اس
نے کسی مظلوم شہسار، کسی دوست سے زیادتی کی یا ظلم
روا کر دکھایا۔“
”اور اڈا حاصل کرنے کے بعد تم وہاں سے
چلے آئے۔“

”جی ہاں۔ اس لیے کہ میرا کام ڈاکگری نہیں ہے۔“

”سکتے اڈوں کے استادوں سے تم نے زور آزمائی کی؟“ ڈاکٹر رائے کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

”نہی یا نہیں ڈاکٹر صاحب۔“

”یعنی بہت سے.....؟“

”بہت زیادہ تو نہیں۔“

”اور بھی میں تم سرخ رو ہوئے؟“

میں خاموش رہا۔ خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

ڈاکٹر رائے کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی چلیں ہل رہی تھیں۔ ”تمہارا بھائی بھی ان فنون میں کوئی درک رکھتا ہوگا؟“ اس کا لہجہ طنز یہ تھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے مختصر کہا۔

”تم سے زیادہ؟“

”میں کیا۔ وہ تو دوسرے آدمی ہیں۔ میں ان

[175] 7-35

”ہے ایک، جو پھنسا گیا ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو۔“

”کب سے یہ تلاش جاری ہے؟“

”کئی برس ہو گئے، اب تو کوئی چار پانچ سال۔“ میں نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں بہت کچھ چھپا سکتا تھا، لیکن یقین رکھیے، میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ اس لیے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات سے آپ منتشر نہ ہو جائیں اور میرے بھائی کا علاج آپ کے کسی حکمدر، برہمی اور محسن سے متاثر نہ ہو جائے۔“

”ہشت۔“ ڈاکٹر رائے دھکارتی آواز میں بولا، ”کیا فضول بات کر رہے ہو۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کے سامنے اس کا مریض محض انسان ہوتا ہے۔ وہ چور ہو، یا ڈاکو، یا اڈے پاڑے کا آدمی، لیکن ڈاکٹر بھی انسان ہی ہے۔ انسان ناراض بھی ہوتا ہے، اسے غصہ بھی آتا ہے، دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔

میں نے صاف صاف کہا کہ میں اسے یہ سب بتانے کا پابند نہیں تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسپتال مندر مسجد نہیں ہوتے۔ چھوٹا اچھوت، سبھی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں، میں یہاں ایک مریض لے کے آیا تھا۔ مریض اور ڈاکٹر کا جو تعلق ہوتا ہے، اسے وہیں تک محدود رہنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ پہلی رات معمول کے خلاف وہ میری درخواست پر منتحل کو دیکھنے آ گیا۔ اس نے بدلتہ ہی اور گستاخی کی حد تک میری تند و تیز باتیں برداشت کر لی تھیں۔ اس نے اسپتال کے یہ ترین کمرے میں ہمیں منتحل کیا اور علاج پر ہر ممکن توجہ مرکوز رکھی۔ کئی اور ڈاکٹروں کو بھی مشاورت میں شریک کیا۔ اس کا یہی احسان اتنا بڑا ہے کہ میں تو اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ پہلے دن اسپتال سے باہر جانے کے بعد میں شام کو واپس آیا

حالت میں دیکھا ہے۔ میں نے ایسی بے چارگی، ایسی غفلت میں انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو سوتے میں بھی جاگتے رہتے تھے۔ دیوار پار کا انہیں نظر آ جاتا ہے۔ دور دور کی آوازیں ان تک رسا ہو جاتی ہیں۔ ان کا سینہ تو کوئی سمندر ہے۔ ان کے بہت سے بازو ہیں۔ وہ تو ایک سایہ ہیں بہت سوں کے لیے۔ اور وہ تو کسی چٹان کے مانند ہیں۔ اس حال میں انہیں دیکھ کے مجھ پر جو گزرتی ہے، وہ آپ نہیں جان سکتے۔ وہ وہ ان سارے فنون میں طاق ہیں۔ میں نے سب کچھ انہی سے سیکھا، لیکن ان کی برداشت، ان کا حوصلہ، ان کا عزم۔ میں تو کچھ نہیں ہوں ان کے آگے۔ میں کیا۔۔۔۔۔۔ میری آواز بندھنے لگی۔

ڈاکٹر آنکھیں نیچے دیر تک چپ رہا، پھر یکایک ہڑک کے بولا، ”تمہارا بھائی بھی کسی اڈے پاڑے کا راجا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے کسی اکراہ کے بغیر جواب دیا، ”لیکن اب تو بہت دنوں سے وہ میرے ساتھ مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔“

”سفر! سفر کیوں، کاروبار کے سبب سے؟“

”نہیں، کاروبار نہیں۔“

”پھر۔۔۔۔۔۔؟“ مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جاسکا۔ مجھے متروک دیکھ کے اس نے کہا، ”کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے نہیں کہنی چاہیے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ اور مت سوچیے۔ اس معاملے کا اڈے پاڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک طویل روداد ہے اور بہت ذاتی ہے۔ اس کی تفصیل پھر کبھی سنی۔ مختصر یہ کہ ہمیں اپنے کھوئے ہوئے کسی عزیز کی تلاش ہے۔ ہم ہر طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں، گلیوں، گلیوں، شہروں شہروں۔“

”کھوئے ہوئے عزیز کی؟“ ڈاکٹر کے چہرے پر لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ ”کون ہے وہ۔۔۔۔۔۔؟“

تو اس مشفق اور نیک نفس آدمی کو یہ بتا کے میں کیوں پریشان کرتا کہ میں کسی دیوار سے عبور کر کے اسپتال پہنچ پایا ہوں۔ جس رات اٹھوئی بے موت مارا گیا، میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے کے درپے تھے، لیکن اکبر علی خاں کے سامنے کے بعد صورت بدل چکی ہے۔ پولیس آنے والی ہوگی۔ لاٹلی میں ڈاکٹر رائے کے ذہن میں میرے اور بھٹل کے متعلق کیسے کیسے وہم، کیسی کیسی بدگمانیاں نمودار ہو سکتی تھیں۔

”بس، بس، میں، میں سمجھتا ہوں۔“ ڈاکٹر رائے نے ہاتھ اٹھا کے مجھے روک دیا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، لاٹلی میں مجھے حیرت بھی ہوئی، اذیت بھی۔ پولیس یقیناً یہاں پہنچتی ہوگی۔ تم نے کیا سوچا ہے پھر؟“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہہ پاؤں گا، کس طرف اشارہ کروں گا۔ شاید وہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ تو ٹھیک ہے، لے جائیں لیکن پھر یہاں بھائی کے پاس کون ہوگا۔ کوئی تو ہونا چاہیے ان کے ساتھ۔“

”وہ تو ہم لوگ دیکھ لیں گے۔“ ڈاکٹر بے پروائی سے بولا۔

”بھائی پوچھیں تو آپ کیا بتائیں گے؟“

”کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوگا۔“

”وہ نہیں مانیں گے۔ آپ انہیں جانتے نہیں۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ بے گل ہو جائیں گے۔“

”دیکھ لیں گے؟“ ڈاکٹر اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کل ہی اکبر علی خاں کے مشورے سے انہی کے ذریعے کلکتے تار دیا تھا، ایک نہیں، دو درجن تار، یہاں کے مشکل حالات دیکھ کے اپنی دسرات کے لیے ایک دو آدمی بلائے تھے۔

اب تک کوئی کو آ جانا چاہیے تھا۔

”کون ہیں وہ؟“ ڈاکٹر نے چونک کے پوچھا۔

”انہیں بھائی کا خدمت گار سمجھیے۔“

”سمجھیے، کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں ترشی آگئی۔

”بھائی کے پروردہ ہیں وہ۔“

”ان کا تعلق کچھ اڈے پاڑے سے ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کلکتے سے آ رہے ہیں وہ۔ کلکتے ہی میں تمہارے بھائی کا اڈا ہے؟“

”بھئی تھا اور ہاں، ہے بھی۔ اڈا تو انہی کے نام سے قائم ہے۔“ میں نے جھنجھکی ہوئی آواز میں کہا، ”لیکن اب تو عرصے سے وہ وہاں نہیں بیٹھتے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ وہ عرصے سے میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔“

”یاد پڑتا ہے، تم نے شروع میں کہا تھا کہ تمہارا گھر فیض آباد میں ہے۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم فیض آباد ہی سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے بھی کسی کو بلایا جاسکتا تھا، لیکن گھر میں اطلاع دینے سے بھئی پریشان ہو جاتے۔“

”یہ آنے والے لوگ بھی چاقو باز ہوں گے؟“

”آپ کی اور میری طرح اڈے کا ہر آدمی، پہلے آدمی ہوتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا بوجھ غیر ارادی طور پر تن سائیگا۔“

”ہاں، ہاں، پہلے آدمی، بعد کو چاقو باز۔“ ڈاکٹر رائے تا کواری سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

اس کے بے درپے سوالوں سے میری رگیں اٹھنے لگی تھیں، لیکن اس کے ہر سوال کا جواب مجھ پر واجب تھا۔ کہیں ذرا سا ابھام رہ جانے کی صورت میں اس کے دل میں شک کی گرہ پڑھ سکتی تھی۔ وہ کتنا ہی تردید کرے۔ ہر ذہین آدمی کا دتیرہ شک ہوتا

ہے۔ وہ تو یوں بھی ایک نکتہ دس اور جزو ہیں شخص تھا۔ کوئی معمولی آدمی اتنا بڑا اور کامیاب ڈاکٹر نہیں ہو سکتا۔ میری دانست میں اب بہت کچھ آئندہ ہو چکا تھا۔ مجھے اور کسی معذرت خواہانہ لہجے کی بھی ضرورت نہیں تھی، لیکن اس کے ظرف کا خیال ہر لمحے ملحوظ رکھنا تھا۔ وہ بار بار کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس دوران میں خود کو اس کے کسی ناروا سوال کے لیے آمادہ کرتا رہتا۔ کبھی بھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں کسی امتحان کے سامنے بیٹھا ہوں، یا عدالت کے کسی جج کے رو بہ رو۔ اڈے کے کسی استاد سے زور آزمائی کرتے وقت شاید مجھے کسی اتنی کشاکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنی ڈاکٹر رائے کی دھند دور کرنے کے اس مرحلے میں نازکی کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ ہر لمحے مجھے خود کو نوکنا پڑنا کہ وہ بھٹل کا معالج ہے اور بھٹل ابھی بستر پر ہے۔ ڈاکٹر رائے اس اسپتال کا مگر اس ہے۔ اسپتال کے دروازے پر کون ماحول میں ہماری آمد کے بعد مسلسل کوئی نہ کوئی انا ہوتی ہوئی رہی ہے۔ اسپتال میں آدمی رات کے بعد سڑک آدمیوں کی یلغار، اٹھوئی کی موت، پولیس کی آمد اور اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے بعد ڈاکٹر رائے میرے اور بھٹل کے لیے کوئی بھی اختیاری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

”تم نے کہا ہے، پولیس تمہیں ساتھ بھی لے جائی ہے، مگر کیوں؟“ اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

”پولیس کا اپنا طریق کار ہوتا ہے۔ یہاں میں انہی ہوں اور بہت بے سہارا بھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اپنے اختیار سے سوا کرنے کی عادت ہوئی ہے۔ ادھر میدان کے اڈے سے آئے دن کے واسطے کی مراد میں مجھ سے پولیس کا رویہ معاندانہ بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کے جانے کتنے لوگ میدان کے اڈے کا ٹمک بھی کھائے ہوئے ہوں گے۔“

”اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے تم

نے بھی کچھ غور کیا ہوگا؟“ ڈاکٹر کی آواز اکھڑی ہوئی سی تھی۔

”کیا بتاؤں۔“ میں تھے بے ربطی سے کہا، ”شاید مجھے ایک وکیل کی ضرورت پڑے۔ وکیلوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ آپ شہر کے کسی بہت بڑے وکیل کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اطمینان رکھیے، کتنا ہی مہنگا وکیل ہو، میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور واضح رہے، یہ اڈے پاڑے کا پیسا نہیں ہے۔ روپے پیسے کی انہیں ایسی غلب نہیں ہوتی جتنی زور اور اپنی ساکھ کی۔“

”تم..... تم اڈے بازوں کی ادا کرتے ہو مجھ سے۔“ ڈاکٹر رائے جھلا کے بولا۔

”میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ نے اتنی باتیں جانی ہیں تو یہ بات بھی آپ پر صاف ہو جائے۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے یکا یک کمری سے اٹھ گیا۔

”ایک بات کہنی ہے آپ سے۔“ اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے دہری کی آواز میں کہا۔

کمری سے اٹھ کے اس نے اپنا لباس جھنکا، فلکینیں درست کیں اور کسی قدر بے اعتنائی سے بولا، ”بولو، کیا بات ہے؟“

”میں اکبر علی خاں کے گھر جانا چاہتا ہوں۔“

میں نے نظریں جھکا کے کہا۔

”کیا.....؟“ اس کا جسم اکڑ گیا۔ ”تم..... تم وہاں جانا چاہتے ہو؟“

”مجھے جانا چاہیے۔ دو تین دن میں سہی، ان سے جو ایک غیر معمولی ربط خاطر ہو گیا تھا تو مجھے وہاں جانا چاہیے۔“

”تم باہل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ درشتی سے بولا۔

”میری وجہ سے وہ اپنی جان سے گئے۔ ان کا ایک آباد گھر تھا۔ میری وجہ سے اجڑ گیا اس دن نہ میں ان کے گھر میں داخل ہوتا نہ اس گھر پر بربادی

آئی۔ میرے حال پر ترس کھا کے وہ مجھ سے اتنے قریب ہو گئے تھے۔ مجھے اپنا کوئی بہت قریبی عزیز، بھائی سمجھنے لگے تھے اور مجھے بھی یہی محسوس ہوتا تھا۔ کل رات اپنے گھر، بیوی بچوں کی نہایت ذاتی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیوی کے لیے کسی نواب کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بہت کش مکش میں تھے۔ صاف انکار بھی نہیں کر پارے تھے۔ مجھ سے پوچھتے تھے کہ وہ کیا کریں، کس طرح نواب کو مطمئن کریں۔ وہ اپنی بیوی کے شیدائی تھے، بڑے احترام، بہت محبت سے وہ بیوی کا ذکر کرتے تھے۔ لگتا تھا، دونوں یک جان ہیں۔ وہ تو خود سراپا احترام، مروتا محبت تھے۔ میں نے اس گھر کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ کیسا مثالی گھر تھا۔ مثالی لوگ وہاں بستے تھے۔ "میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ آنکھوں میں جیسے آگ بھڑک اٹھی ہو اور سینہ جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ میں نے اپنا ہاتھ جکڑ لیا۔ میرا جی چاہا کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں۔

لایا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔" وہ میری کمر بھینکنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے دوبارہ مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ "تم وہاں نہیں جا سکتے۔" اس نے حتیٰ آواز میں کہا۔

"نہیں جاؤں گا تو میرے سینے..... میں خود کو کس طرح....." میری آواز آنسوؤں میں بہہ گئی۔

"یوں وہ داپس نہیں آجائیں گے۔"

"میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوں؟" میں نے ہلکتی آواز میں کہا، "میں جانتا ہوں، ان کے بیوی بچوں کے سامنے کس طرح جاؤں گا، کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں گا، لیکن مجھے....."

"تمہیں دیکھ کے ان کا غم اور بڑھ جائے گا۔"

ڈاکٹر آہ بھر کے بولا، "اکبر علی خاں مجھے بھی اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک عمدہ آدمی تھے۔ ان سے مل کے

خوشی ہوئی تھی۔ سوچا تھا، ذرا تمہارے بھائی کے علاج سے فراغت ہو جائے تو ان سے گفتیں ہوں۔"

"بتائیے ڈاکٹر صاحب! ان کا کیا قصور تھا۔ انہوں نے کسی کو کیا ضرر پہنچایا تھا۔ انہوں نے کتنے نادار، کتنے بڑے آدمی کو مار دیا، کس بات پر..... اس بات پر کہ جرات کر کے وہ میرے ساتھ میدا کے اڈے پر گئے تھے اور میری دل شکنی کے لیے یہاں اسپتال میں صبح شام آنا انہوں نے معمول بنالیا تھا۔"

"میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" ڈاکٹر رائے اندر دگی سے بولا، "وہ لوگ دیوانے ہو گئے تھے کیا۔ وکیل صاحب سے انہیں کیا غرض تھی۔ کیسے ظالم اور دردناک لوگ ہیں یہ۔"

میں نے یہ اس سے نہیں کہا کہ اپنا حال کیا بناؤں۔ میرا خون بہت کھوٹا ہے۔ اکبر علی خاں کا خیال آتا ہے تو جسم میں آگ سی لگنے لگتی ہے۔ ایک جڑک سی اٹھتی ہے کہ میدا کے ٹھکانے پر جا کے اس کے اڈے کو آگ لگا دوں، اس کا جو بھی آدمی سامنے نظر آئے، اس کے سینے میں جا تو بھونک دوں۔

"تم کہتے ہو، اڈے کی کرسی پر بیٹھا آدمی جا تو اور بل ہی میں نہیں، برداشت، سوچو بوجھ میں بھی دوسروں سے لازماً برتر ہوتا ہے۔ یہ تو نہایت کم عقلی کی بات ہے۔ یہ تو اوجھڑا پن ہے، پرے درے کی ذلالت ہے کہ تم تشائے پر نہ آ سکتے تو انہوں نے ایک بے گناہ کو قسم کر دیا۔ میدا کیا جتنا چاہتا ہے، تمہیں مشتعل کرنا، یا خوف زدہ کرنا؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ صاف صاف اس پر نگاہ جائے گی۔ اس طرح وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟" ڈاکٹر رائے بھن بھنی آواز میں بولا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر شاید یہ میدا نہیں ہے۔ اسے اتنا بے دماغ نہیں ہونا چاہیے۔"

"پھر..... پھر کون..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میدانے آسانی سے مجھے اڈے سے جانے دیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگی جو ڈاک خانے والی گلی میں زخمی ہو جانے اور بعد کو مر جانے والے دھونامی آدمی کے نہایت وفادار، چار سار سا بھی تھے۔ وہ میدا کے اڈے سے منحرف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اڈے کے استاد کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہو سکتا ہے، اسپتال میں آنے والے حملہ آور میدا کے پیچھے ہوئے ہوں، لیکن یہ لوگ..... یہ تو کوئی دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔"

"کوئی نہیں ہو۔" ڈاکٹر فہمائش لہجے میں بولا۔ "میری بات سنو! تم نے اتنا کچھ بتا کے مجھ پر اعتماد کیا اور میں نے اس پر یقین کیا ہے۔ تم اب اپنے آپ کو فیصلہ نہیں کرو گے۔ میرے مشورے اور غم میں لائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ سمجھو!"

"آدمی اپنے آپ کو بھی تو جواب دیتا ہے، ڈاکٹر صاحب! میں نے یاسیت سے کہا، "میرے وہاں نہ جانے سے اکبر علی خاں کے گھر والے کیا سوچیں گے، میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔"

"ان پر اکبر علی خاں کے سامنے سے بڑی قیامت اور کیا گزر سکتی ہے، اور ہاں..... تم..... تم اپنے آنے والے بھائیوں کو بھی منہ کر دو گے کہ وہ تمہاری طرف سے کوئی نادانی نہیں کریں گے۔" وہ کرسی سے دوبارہ اٹھ گیا اور چلتے چلتے رک گیا۔

"میرا خیال ہے، تم سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتنا متعین واقعہ ہے۔ شہر کے ایک نہایت معزز، مشہور ایک بڑے آدمی کا خون ہو گیا ہے۔ تمہاری ذرا سی غلطی، مشتعل حرکت سے بات ختم ہو سکتی ہے۔ اس معاملے کی تفتیش عام سطح پر نہیں ہوگی۔ وکیلوں کی مدد کی، شہر کے معززین، اکبر علی خاں کا وسیع اور با اثر حلقہ حباب، سبھی تشریف خواہر کریں گے اور تمہارا

نام لازماً آئے گا۔"

اس نے مجھ سے پھر کوئی بات نہیں کی، کمرے سے نکل گیا۔ باہر راہ داری میں اس کمرے میں تعینات ڈاکٹر اور نرس اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نے رکی انداز میں ان سے نصرت کی اور ہتھل کے کمرے تک میرے ساتھ آیا۔ سپورین بھی ذیول پر آگئی تھی اور ایسی ہی تک موجود تھی۔ دونوں سراسیمہ سی ہتھل کے کمرے کے باہر تھیں۔ نظریں مرکز کے کھڑی تھیں۔ جیسے آنا دیکھ کر منت پنا لگیں۔ ڈاکٹر رائے نے قریب چا کے ایک گواشا سے سے پاس بلایا اور سر گھٹانہ کچھ باتیں کیں اور تیز قدموں سے چلتا چھوڑا داری کے موڑ سے اوڑھل ہو گیا۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی دونوں لگی ہوئی میرے پاس آ گئیں۔

"یقیناً تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی ہوگی۔" ایکی دلتوق سے بولی۔

میں نے سر ہلا کے تائیدی۔

"تم نے بہتر کیا۔ تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔" وہ تائیدی لہجے میں بولی، "وہ ہیست کلمہ داغ کے آدمی ہیں۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"اب مجھے گھر جانا ہے میرے بے اسپورین آگیا ہے۔ تم کہو تو رک جاؤں۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی۔" ایکی دل دوزی سے بولی۔ "گھر میں میرا جی نہیں لگے گا تمہاری فکر رہے گی۔"

"نہیں، تم جاؤ۔ میں ٹھیک رہوں گا۔ میں اس کمرے میں قید رہوں گا، تمہیں تمہیں جاؤں گا۔"

میری آواز بھک رہی تھی۔

"تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ یہ دلت گزر جائے گا۔" ایکی مجھے دلا سے دیتے لگی۔

"یہ کیا ہو گیا؟ میں نے آکے ایکی سے سنا تو یقین نہیں آیا۔ کیا واقعی وہ اتنا شاندار آدمی

ہمارے درمیان نہیں رہا؟“ سیورین نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چپ ہو گئی۔ کمرے میں آکے بے اختیار میرے قدم ہتھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہنسنے کے متوازن اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ ہر سکون نیند میں ہے، چہرے پر بھی تازگی چمکی ہوئی تھی۔ میں دے قدموں اس کے پاس سے ہٹ آیا اور سونے پر آکے بیٹھ گیا اور میرا جسم بکھر سا گیا۔ چند لمحوں بعد سیورین بھی میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ سیورین دیر تک بت نہی رہی۔ میں نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میرے پاس کہنے کے لیے تھا بھی کیا۔ مگر شہ دو ایک دن میں وہ اکبر علی خاں سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ کل اس نے ان کے گھر سے آئے ہوئے تو شے کا کھانا کھایا تھا اور کہتی تھی کہ اس نے آج تک اتنا نفیس اور لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ اکبر علی خاں اس کی تعریف سے بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہونے والے آدمی تھے۔ انہوں نے ہتھل کی صحت پالی کے بعد سیورین کو گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ کہتے ہیں، آدمی کا وقت آگیا تھا، لیکن ایسے تو وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی بیمار، معذور من رسیدہ کی موت کا کوئی جواز تو ہوتا ہے۔ آدمی جیکے سے یوں اچانک غائب ہو جائے تو کوئی کیا کہے۔ سیورین بھی کیا کہہ پاتی۔۔۔۔۔ اور میں کون سا اکبر علی خاں کا رشتہ دار، ان کے خاندان کا آدمی تھا۔ اکبر علی خاں سے میری شناسائی سیورین سے ایک دن پہلے کی تھی، بل کہ ایک پہر پہلے کی۔ سیورین سے کچھ کہتے نہ بنا کہ لفظ تو کبھی بہت حقیر اور بے مایہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کھسک کے مجھ سے اور قریب ہو گئی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے مجھ سے غم گردی کا اظہار کرنا چاہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھری ہوئی تھیں۔ سیورین

نے اپنے عالم اضطراب میں میرے ہاتھ پر زور دیا تو میری آنکھیں بھی اند آئیں۔ آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو آنسو ہی سہارا، آنسو ہی سپرین جاتے ہیں۔ ”کیا ہو گیا یہ۔۔۔۔۔“ وہ کہتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولی۔

میں نے خود کو بہت روکا، لیکن سیورین کی سسکیوں نے مجھے بھی حلال طم کر دیا۔ میں بھی بڑکنے لگا۔ سچائی اس کا شعار تھی۔ اس بے پناہ مشتعل دمربان لڑکی نے میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ میری تو چپکلیاں بندھ گئیں۔ کبھی اپنے کسی بہت عزیز و محترم، اپنے کسی ہم نفس و ہم دم کے چلے جانے پر حیران اور ہلکان ہو جاتے ہیں، لیکن اس آدمی کی ویرانی کا کون اندازہ کرے، اس آدمی کا دکھ کون جانے جو اپنے عزیز و محترم کے خون کا بار پٹی گردن پر محسوس کرتا ہو۔ سیورین کو کیا معلوم تھا کہ ہر لمحے کبھی احساس میرا سینہ دو بوجھا، کھسوتا ہے۔ میری کچھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کہاں جا کے خود کو چھپاؤں۔ میں کیسا بد نصیب، بے بس آدمی ہوں۔ میرا سایہ ہی محسوس ہے۔ میں زندہ رہنے پر کیوں مصر ہوں۔

سیورین میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کے مجھ سے یکا گت ظاہر کرنے لگی۔ آئینہ مقابل نہ ہوتا بھی ہمہ وقت اپنی صورت آدمی کے سامنے رہتی ہے، میں اپنا چہرہ ہی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آدمی کا اپنا وجود بھی اس پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ سیورین، ایک نرم و نازک لڑکی، کسی ستون، کسی دیوار کے مانند مجھے سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے سر پر اس کی میڈلائی انگلیاں مجھ سے اپنے دکھ کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کا گداز آفریں پیلو اس کی بے قراری کا مظہر تھا کہ وہ میرے حال سے واقف ہے اور مجھے پناہ میں لینا چاہتی ہے۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ دل داری و دل دہی سے بھی تو آنسوؤں کی نہو ہوتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم، کب وہ میرے پاس سے اٹھی، مجھے تو اپنی سادہ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ جانے کب اس نے میرے شانے پر ٹھوکا دیا تو میں نے دیکھا، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، اس کے ہاتھ میں گلاس ہے اور رد مال۔ اس نے آنکھیں میچ کے گلاس اور رد مال میرے طرف بڑھائے تب مجھے اپنی توانائی اور فروہاشی کا شدت سے احساس اور ندامت کا غلبہ ہوا۔

آنسوؤں کا بھی بڑا فساد ہوتا ہے۔ بہہ جائیں تو جسم ہلکا ہو جاتا ہے لیکن آنسو طانی نہیں کر پاتے۔ سیورین دوبارہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور چپ رہی پھر جیسے خود کو میچ کر کے دھیمی آواز میں اس نے سوال کیا۔ یہ کاٹنا اس کے بدن میں چھ رہا ہوگا۔ کہنے لگی ”اب کیا ہوگا؟“

میں نے استفہامی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ ”کیا ہوگا؟“ پھر مجھے خیال آیا، وہ آنے والے وقت سے ہر اسال ہے۔ میں نے بے ظاہر بے پروائی سے کہا ”جو ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ تو ہو کر رہے گا۔“

”تم ان سے زیادہ بات مت کرنا۔“ اس نے دہی آواز میں مشورہ دیا۔

”کس سے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”پولیس سے۔ ایک کبہ رہی تھی، پولیس اسپتال آنے والی ہے۔ یہ پولیس والے بال کی کھال نکالنے ہیں اور کسی کا خیال نہیں کرتے۔ وہ تمہیں تنگ کر سکتے ہیں۔“

”وہ اپنی کارروائی تو کریں گے ہی۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد کیا وہ گھر بیٹھے رہیں گے۔“

”مگر تمہارا تصور کیا ہے؟“

”اکبر علی خاں سے تعلق خاطر کا، ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں ختم ہو جاتے۔“

سیورین دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا کی، پھر کھلی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

”خداوند! سب ٹھیک ہی ہو۔“ وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے بولی۔ ”خداوند جی کا ساتھ دیتا ہے۔“

وہ ابھی یہ کہہ رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سیورین گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف لپکی۔

اسپتال کا ایک ملازم پولیس کی آواز میری ظلی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے کچھ لیا تھا۔ سیورین نے سب سے سببہ انداز میں ہر کارے کا پیغام مجھے منتقل کیا۔ سونے سے اٹھ کے میں نے ایک نظر ہتھل کے بستر کے پاس جا کے دیکھا۔ سیورین سے تشفی کے کلمات کہتا ہوا میں کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے روک لیا اور گل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ میرا حال واقعی ٹھیک نہیں تھا، اس کا احساس مجھے مسلسل گل خانے جا کے ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کے اور بال درست کر کے میں باہر آیا تو سیورین مجھے رخصت کرنے کے لیے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے اس نے میرے کرتے کا اسٹینچ کے شکنیں درست کیں۔ نیچے کے تھیں پارٹن لگا کے میری کھلی واسٹ بند کی اور پچھلی مسکراہٹ سے ہاتھ پھیلا کے مجھے کمرے سے جانے کی اجازت دی۔

باہر ملازم منتظر تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے دو راہ داری میں دائیں مڑ گیا۔ راہ داری کے اختتام پر ہزہ زار کا وسیع کھلا حصہ تھا اور مختلف امراض کے وارڈ شروع ہو جاتے تھے۔ ایک دو کی گریوں میں جگہ جگہ سپاہی موجود تھے۔ ان میں پیش زارہ لباس میں تھے۔ سادہ لباس میں بھی پولیس کا آدمی اپنے خاص انداز و اطوار، چھب ڈھب، بالوں وغیرہ سے آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ پوگیس سے جس کا واسطہ پڑتا رہا ہو، اس سے تو کسی بہرہ ہی میں چھپ سکتا ہے۔ متعدد مقامات پر تعینات سپاہی

دوا دھیر، ایک پختہ کار نو جوان۔ تینوں کے قیامت میں تھوڑا بہت ہی فرق تھا۔ نسبتاً بڑی عمر کے شخص کے چہرے پر بردباری ٹھیک رہی تھی اور وہی ان کا بڑا افسر لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور چمکیا تھیں۔ بھوؤں پر سفید بال غالب تھے۔

حالاں کہ دربان نے انہیں مطلع کر دیا تھا، لیکن میری آمد پر تینوں شخصوں سے گئے۔ میں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور ان سے اجازت لیے بغیر قریب کے سوئے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک ان کی نظریں مجھ پر بٹھکتی رہیں، پھر ادھیر افسر نے اپنے بڑے افسر کی طرف اجازت طلب انداز سے دیکھتے ہوئے مجھ سے میرے نام کی توثیق چاہی۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”تم سے ہم کو انکوائری کرتا ہے۔“ ادھیر افسر نے ہندوستانی میں پہل کی۔ ”ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے تو ہم دونوں کے واسطے ٹھیک ہوگا۔“ اس کے لہجے کی درستی قبل از وقت تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”رات کو تم ادھر اسپتال ہی میں تھے جب وکیل اکبر علی خاں صاحب کا مرڈر ہوا۔ وکیل صاحب کہتے ہیں تمہارے پاس سے نکلے تھے؟“ ”نہیں، دو بجے کے درمیان۔“ میں نے بھیجی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”تم نے ان کو ٹانگے پر چھوڑا اور لوٹ کے کمرے میں آ گئے، ایسا ہی ہوا؟“ ”جی ہاں۔“

”تانتے پر ان کو چھوڑنے اور واپس کمرے ملک آنے میں تم کو کتنا پدم لگا؟“

”راستے کا وقت۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”گھر جانے میں اتنی دیر کا ہے لگائی وکیل صاحب نے؟ جیسا کہ کر رہے تھے او؟“ اس بار نو جوان افسر نے بھرے لہجے میں پوچھا۔

ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھ کے زیرِ وزر ہو جاتے، لیکن کسی نے اسپتال کی وردی میں لمبوس ملازم کی وجہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی مشکوک نظروں کے حصار میں ہم مرکزی عمارت میں داخل ہو گئے۔ عمارت کے بڑے دروازے پر بھی پانچ چھ پاپائی موجود تھے۔ انہوں نے جیسے جیسے پہچان لیا ہو اور میں ہی انہیں مطلوب ہوں۔ مجھے آتا دیکھ کے ان کے ڈھٹکے ہوئے جسموں میں ایک ساتھ جسے کسی نے سوئیاں چھو دی ہوں، سبھی پھل سے گھسے۔ نگاہوں نگاہوں میں انہوں نے ایک دوسرے سے قصد بق چاہی، لیکن میرا ان کا سامنا لمحاتی تھا۔ میرا رہبر، اسپتال کا ملازم عمارت کے بڑے دروازے سے چند قدم بعد دائیں جانب گئی ایسی جگہ میں آ گیا۔ سامنے دروازے پر سادہ لباس میں ایستادہ شخص کا تعلق بھی یقیناً پولیس سے ہونا چاہیے تھا۔ ملازم نے مجھے اس کے سپرد کیا اور وہیں سے لوٹ گیا۔ مجھے باہر ٹھیرا کے درباری خدمت پر مامور پولیس کے آدمی نے اندر جا کے میری آمد کی اطلاع دی ہوگی۔ جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کرنے کی احتیاط بھی کی اور فوراً ہی واپس آ کے اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ اسپتال کے خاص ملاقاتیوں کا کمرہ معلوم ہوتا تھا، مذاقتا بڑا، نہایت چھوٹا، بڑے اسٹیشنوں کے درجہ اول مسافروں کی انتظار گاہ کے مانند سمجھا ہوا اور صاف ستھرا۔ دیواروں کے ساتھ لگے شاہانہ طرز کے سونوں کے بیچ شیشے کی چھوٹی میزیں، کمرے کی کشادہ وسطی جگہ پر کئی بڑی چوکور میز، چھت خاصی اونچی، دیواروں پر نیا نیا رنگ روغن، کھڑکیوں پر بلکے نیلے رنگ کے ریشمی پردے، چھت سے کئی روشن دان نصف کھلے ہوئے، چھت سے لٹکا ہوا پتکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ دروازے کے عین مقابل سونوں پر تازہ وردیوں میں تین پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے، تینوں کم و بیش گندی رنگت کے تھے،

”باتیں کر رہے تھے ہم، وقت کا کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ جتنے وقت میں نے ان سے کہا بھی کہ رات بہت ہو چکی ہے میں ان گئے ساتھ چلتا ہوں، اسی تانگے سے واپس آ جاؤں گا۔ انہوں نے ہنس کر منع کر دیا۔“

”کا۔۔۔ کا باتیں کر رہے تھے او؟“

”یہی میری، اپنی، اپنے گھر کی۔۔۔ دنیا بھر کی۔“

”کب سے تم ان کو جانو ہو؟“

”دو تین دن سے، یہاں آنے کے بعد سے۔“

”دو تین دن سے!“ اوجیز افسر حیرانی سے بولا۔

اس نے وہی سوال کیا جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ اتنی جلد وہ کس طرح مجھ سے کھل گئے کہ گھر کی باتوں میں شریک کرنے لگے۔ میں نے جواب میں وہی کہا جو ڈاکٹر سے کہا تھا کہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے کسی مدت کی شرط عائد نہیں ہوتی۔

”کدھر، کیسے قمری ان کی پہلی بار بھیئت ہوئی؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ میں نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ ”آپ کا وقت ضائع ہو گا۔ بس اتفاق سے میری ان کی ملاقات ہوئی۔“

”ہم کو بتاؤ، ہم اسی کارن ادھر آئے ہیں۔“

”بتانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں گے، بل کے اٹھ سکتے ہیں، کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ادھر ادھر مت بھٹکیے۔“

”تم ہم کو ایڈوائزنا ہی کرو تو اچھا ہے۔“

میں نے فوراً کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ٹھٹھل کہتا تھا، جواب میں تیزی پر وقت مناسب نہیں ہوتی۔ اس کے بقول سامنے موجود زیادہ پولیس افسر ایک ساا مزاج کے نہیں ہوتے، چہروں کی طرح ان کی خصلتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے

سبقت لے جانے کے لیے وہ اگلے سیدھے سوالات بھی کرنے لگتے ہیں۔ شک کی بنیاد پر وہ مفرد ذمے قائم کرتے ہیں اور شک کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کوئی شک ان کے دل میں بیٹھ جائے تو مشکل ہی سے نکلتا ہے۔ ظاہر ہے، ان میں نہایت ذہین، تعلیم یافتہ اور تجربے کا رکھی ہو سکتے ہیں۔ وہ خوش دحواس ٹھوہرے کی حد تک اپنے مخاطب کو لا جواب اور برہم کر سکتے ہیں، ہمیشہ دشمن کی طرح پیش آتے ہیں اور مشکل سے شکست قبول کرتے ہیں۔ بہت کچھ دلیل پر منحصر ہے، دلیل انہیں غصہ بھی دلاتی ہے، زنج بھی کرتی ہے، متاثر بھی۔ اپنی دلیلیں آہستہ آہستہ ان پر افشا کرنی چاہئیں۔ دلیلیں تو اندازہ ہوں، یا دلیل ہی نہ ہو تو جت جت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ چرب زبانی انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ ان کے مناصب کی رعایت وہی بہ ہر حال واجب ہے۔ اوجی آواز میں بات کرنے سے پہلے ان کے تیور کا تخمینہ کر لینا چاہیے۔

”ایک بات صاف سن لیجئے صاحب!“ میں نے تمام تر احتیاط سے نسبتاً اچھی ہوئی آواز میں کہا، ”میرے پاس جو کچھ ہے، آپ سے کہے دیتا ہوں، ہو سکے تو اس پر دھیان دیجیے اور پہلے اس زاویے سے سوچیے۔ آپ حاکم ہیں۔ بعد کو آپ کی مرضی ہے، جس طرف، جس انداز سے چاہیں کھوج کیجیے۔“

فتیوں کے چہرے تھماتے لگے۔ نو جوان افسر زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بڑے افسر نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور طنز سے مسکراہٹ سے بولا۔ ”کا کہنا چاہو ہو تم؟“ اس کی آواز بھاری تھی اور منصب کی تکنت سے آسودہ۔

یہی ایک طور مجھے ٹھیک لگا کہ پٹنا شہر میں آنے کے بعد پیش آنے والے واقعات بے کم و کاست بیان کر دوں، لیکن اس سے پہلے انہیں کچھ یاد کرادینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا، ”جو میں کہتا

ہوں۔ اچھا تو یہی ہو گئی الحال آپ اسی پر تکیہ یا اسی پر یقین کریں۔ بعد کو کسی وضاحت کے لیے سوال پیدا ہوتے ہیں تو میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ کے اطمینان کے لیے جتنا کچھ بھی جانتا اور سمجھتا ہوں، جواب دینے کی کوشش کروں گا لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے کوئی سوال مت کیجیے گا یہ میری گزارش ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہے کہ آپ پولیس کے آدمی ہیں اور سٹیڈی سے ایک نگینوں والے کی گفتیش کر رہے ہیں۔ بد قسمتی سے جس میں میرا ذکر، میرا نام بھی آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے، میری حیثیت بھی آپ کی نظروں میں مشکوک قرار پاتی ہے اور میرے خیال میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ کچھ جانتا چاہتے ہیں تو میں دہراتا ہوں۔ میں آپ سے امکان بھر تعاون کروں گا، یا یوں کہیے کہ آپ کی مدد کے لیے میں یہاں موجود ہوں۔ کسی کارنامے کے چکر میں پڑیں گے آپ تو شاید کچھ ہاتھ نہ آئے۔“

”تم۔۔۔ تم ہماری مدد کرو گے۔“ نو جوان افسر کی زبان غصے میں ڈمک گئی۔ ”تم ہم کو کوئی بہت چالو۔۔۔ ریفرنشل ٹاپ بجرم لگو ہو۔“

”تو ٹھیک ہے۔۔۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں، پھر آپ بھی کیوں یہاں بیٹھے ہو۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا، ”ایک بات دماغ میں رکھ لو صاحب! میں آپ کے ہر سوال کے جواب کا پابند نہیں ہوں۔ آپ مجھے مجرم سمجھتے ہیں تو بات ختم ہو جاتی ہے، پھر دیر کا ہے نا، مجھے یہاں سے سیدھے حالات لے جائیے۔ میں نے ڈاکٹر رائے سے درخواست کی ہے کہ وہ شہر کے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کر دیں۔ پھر وہی آپ سے بات کرے گا۔“

تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ طے کر کے، کچھ ٹھان کے نہیں آئے ہیں۔ انہیں کسی چیز پر پکڑنے، کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی کہاں

ملتا ہو گا۔ اکبر علی خاں کے ملازم کے بقول، صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے جیسے نمازیوں نے ان کی خون آلود لاش جھانپوں میں پڑی دیکھی تھی۔ اسی وقت سارے محلے میں کھرام کچا گیا ہو گا۔ پولیس ٹیک بات پہنچنے، پولیس کے آنے اور ابتدائی گفتیش میں کچھ وقت تو ضرور لگنا چاہیے۔ کچھ تک دود کے بعد انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ اکبر علی خاں رات گئے اپنے کسی نئے دوست کے پاس سے گھر واپس آرہے تھے۔ یہ نیا دوست کون تھا۔ اس کا سراغ بھی ان کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ اسپتال آ کے انہوں نے صدر دروازے پر رات کی ڈیوٹی کے دربان اور اونگھتے ہوئے سپاہیوں سے بات کی ہوگی اور ممکن ہے انہوں نے اس تانگے والے کو بھی ڈھونڈ لیا ہو جو اکبر علی خاں کو اسپتال سے لے گیا تھا اور ہو سکتا ہے مجھ سے پہلے ڈاکٹر رائے سے بھی ان کی ملاقات ہو چکی ہو۔ اپنی کم مدت میں ان کی معلومات خاصی خام اور ناتمام ہونی چاہئیں۔ یہ ساری صورت حال اور ان کی تذبذب و منتشر حالت دیکھ کر ہی میں نے اپنی آواز اور لہجے میں جرأت کی جسارت کی تھی اور مجھے احساس تھا کچھ متجاوز نہ ہو جائے۔ وہ کچھ جانتا چاہتے ہیں تو مجھے بھی اپنی حاکمیت، اپنی نجات کی کوشش کرتے رہنا ہے۔

بستر پر پڑا بے حرکت، بے دست و پا جیسا ٹھٹھل بار بار میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس شہر میں میری تنہائی اور اچھیت، سارے فاصلے مٹا کے ایک شخص قریب آیا تھا، اس سے بڑا سہارا ہو گیا تھا، وہ بھی چھن گیا۔

نو جوان افسر کے پہلو میں بیٹھے اوجیز پولیس افسر نے میری بی بیائی، یادہ گونی پر محمول کی۔ میں نے کوئی ایسی ناروا، نازیبا بات بھی نہیں کی تھی۔ جانے کیوں وہ بھڑک اٹھا۔ شاید یہی بار اس کا مجھ ایسے کسی طرم، یا مجرم سے سامنا ہوا تھا۔ اس نے بگڑے منہ سے پوچھا۔ ”تو۔۔۔ تو۔۔۔ تم کون ہو؟“

”میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں اور مجھ افسر کی کون سی شہر میں آ کے کون حالات سے واسطہ پڑا ہے۔“ میں نے جبری حمل سے کہا۔ ”لیکن گناہ ہے، آپ کی نظروں میں اپنی حیثیت جان کے ہی مجھے زبان کھولنی چاہیے۔ مجھے اپنی بات کہنے کا حق ہے تو مکمل دل سے اجازت دو۔ کہیں دینا چاہتے تو میں نے پہلے ہی صاف کہا ہے، آپ اپنی کارروائی کرو۔ میں جانتا ہوں، یہ حق مجھے کہاں سے مل سکتا ہے، آپ پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ بڑے افسر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، ”تم بولو، کیا بولنا ہے؟“ مزید کسی جھٹ کاٹل نہیں تھا۔ میں نے اپنی آواز دہرائی۔ ”ہم آگے جا رہے تھے۔ اکبر پور انشیشن پر انجن خراب ہو گیا۔ ریل گاڑی کے جھکوں کی وجہ سے سوئے ہوئے بھائی کے سر پہ اندرونی چوٹ آگئی۔“

میں نے شروع سے آخر تک مختصر ساری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔ درمیان میں کئی بار ادھیر اور دو جوان افسر نے مداخلت کرنی چاہی، لیکن بڑے افسر کی طرف دلچسپی کے تھلا کے وہ گئے۔ میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ صرف اکبر علی خاں کے گھر میں چاقو کے زور پر داخل ہونے کے واقعے سے اجتناب کیا تھا۔ میرے بیان میں یہ تدریج ان کی بڑھتی دلچسپی اور حیرت کا اظہار ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کے بدلتے رنگوں سے ہوتا رہا تھا۔ اتنا کچھ جان کے ان کے ذہنوں میں اچھے ہوئے سوالات کا مجھے اندازہ تھا۔ انہیں بھی وہی صراحتیں مطلوب ہونی چاہیے تھیں جو کچھ دیر پہلے ڈاکٹر رائے کو ہوئی تھیں۔ گو میں خود ہی ان کی اچھٹیں دور کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میرے چپ ہو جانے پر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیے، پھر ادھیر افسر نے اسی سوال کی

تکرار کی جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ کیا میں ہمیشہ اپنی جیب میں چاقو رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر رائے کی بات اور تھی، ان لوگوں کا تعلق پولیس سے تھا، میں نے محتاط لہجے میں کہا، ”کسی ان ہونے واقعے سے نمٹنے کے لیے چاقو جیب میں رکھنا ہماری ریت ہے۔“

”چاہے، برسوں اسے کھولنے کی نوبت نہ آئے۔“ کے بعد دیگرے وہ طرح طرح کے سوالات کی نشتر زنی کرتے رہے، ڈاکٹر رائے سے کچھ زیادہ تھا۔ یہ دوسرا مرحلہ زیادہ اذیت ناک تھا۔ میں جواب دہی کا عذاب سہتا رہا کیا نے والے وقت کی تنگی و کشادگی اب انہی پر منحصر تھی۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ میرے دست و بازو نوٹنے سے لگے تھے۔ بھی جی میں آتا تھا، انہیں چھڑک دوں کہ میری کیا خطا ہے۔ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔ میں نے کیا تصور کیا ہے جو مجھے ان کے سامنے سر جھکائے ہجرموں کے مانند بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ ایک رکنا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ ان کے سوالوں کا سلسلہ جاری تھا کہ سوئوں کے درمیان اپنی دروازہ کھلنے کی چرچا ہٹ ہوئی اور ڈاکٹر رائے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کے مجھے سکون ملا۔ وہ بیٹوں اٹھ کھڑے ہوئے، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے نے پر تکلف انداز میں انہیں بیٹھ جانے کی گزارش کی اور ظاہری شائستگی و خشوع سے انگریزی میں بولا، ”میں تم کو نہیں ہوا؟“

”نہیں، نہیں ڈاکٹر، کیا کہہ رہے ہیں آپ، خوش آمدید۔“ بیٹوں افسروں نے تپاک کا اظہار کیا۔

”کیسے صاحبان! آپ کے مسائل کچھ حل ہوئے؟“ ڈاکٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

”جی ڈاکٹر۔“ بڑے افسر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہی کر رہے تھے، کچھ کھینچنے کی کوشش۔“

”یقیناً ساری بات سے آپ آگاہ ہو گئے ہوں

”جی۔“

”جی ڈاکٹر صاحب، ہم نے پوری توجہ سے ہر بات سنی ہے۔“

”یہ کیسی افسوس ناک اور حیرت ناک صورت حال ہے۔“ ڈاکٹر رائے نے ادا سی کہا۔

”جی ڈاکٹر صاحب؟“ بڑے افسر کی آواز بھاری ہوئی۔

”واقعی۔“

”کیا نتیجہ اخذ کیا آپ نے؟“ ڈاکٹر نے پچھنی مسکراہٹ سے پوچھا۔

”ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ بڑا افسر سنجیدگی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔

”یہ ایک ایک طرف رو رہا ہے۔“ بڑے افسر کا لہجہ بظاہر معذرت خواہ لیکن تندی و تڑپ کا حامل تھا۔

”کہنے لگا۔“ اس نو جوان کا پس منظر صاف نہیں ہے۔ یہ ہر وقت چاقو جیب میں رکھتا ہے۔ اڈے پاؤں سے بھی اس کی وابستگی رہی ہے۔ یہ تھجھ

چھٹ ہے۔ بنوا چھن جانے پر یہ چور کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک ڈرا سے بنوا چوری پر ایک آدمی کا خون ہو گیا۔ اس کا کہنا ہے اس نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا،

ایک ساتھی نے ٹادائی، نا تجربے کاری میں اپنے ہی ساتھی کو خود زخمی کر دیا جو بعد کو مر گیا۔ یہ ایک اور معاملہ ہے، قتل کا معاملہ دیکھنا ہے، اس بات میں

کتنی صداقت ہے۔ اس نے مشہور زمانہ چاقو باز میرا جیسے بد معاش کے ٹھکانے پر جا کے اسے چاقو

آزمائی کی دعوت دے ڈالی۔ کس اعتماد میں؟ اس اعتماد میں کہ یہ اسے زیر کر لے گا، ورنہ یہ آدمی ایسا

بے وقوف نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شہر کے مشہور روکیل کے گھر میں جبراً داخل ہو گیا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو

راتیں قتل جو جبراً آڈی اسپتال میں گھس آئے تھے۔ وہ جی میں زخمی ہو جانے اور بعد میں دم توڑ دینے

والے نو جوان کے مشتعل ساتھی ہو سکتے ہیں اور وہ نہیں تو وہ میدان کے فرستادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کے ہاتھ نہ آسکا اور واپس بھاگے ہوئے ان لوگوں کے راستے میں اسپتال کا پر جوش ملازم برکات بن گیا۔ وہ بھی اپنی جان بے گیا۔ یہ دوسرا قتل ہے، پھر آج صبح سویرے تیسرا قتل، شہر کے ایک نام ور وکیل کا خون۔ شہر کی ساری پولیس حرکت میں آچکی ہے۔

دیر ہو گئی تو ضلع سے صوبے اور پھر مرکزی حکومت تک بات چالکتی ہے۔ سنا ہے، وکیل صاحب کا بڑا

بھائی نظام حیدر آباد کا مقرب خاص ہے، دربار میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ نظام سرکار اور

برطانوی حکومت کا تال میں کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ یہ انتہائی نازک معاملہ ہے اور پیچیدہ رخ

اختیار کر سکتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن قدم اٹھانا اور ہر حال میں محتاط رہنا ہے۔ سمجھ رہے ہیں آپ ڈاکٹر

صاحب! بڑے افسر نے مایوسانہ فکر مند انداز میں کہا۔

”جی ہاں، سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح جس طرح آپ سمجھا رہے ہیں اسی طرح۔“ ڈاکٹر رائے

تھکے لہجے میں بولا۔

”انہی صورت میں یہی مناسب ہے کہ ہم اسے ساتھ لے جائیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ ڈاکٹر رائے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”آپ ساتھ لے جائیں گے اسے۔ کیوں؟

کس لیے؟“

”مجبوری ہے ڈاکٹر صاحب!“ بڑے افسر نے

متانت سے کہا، ”ہمیں سمجھا اور چاہنا پوچھنا ہے۔“

”کیا اس سے حاصل کردہ معلومات میں کوئی

”مجرموں کا ہمیں وسیع تجربہ ہے۔ آپ کو کیا بتائیں کیسے کیسے بہروپے، تماشا باز سامنے آتے رہے ہیں۔ آپ جیسا ایک مقدس پیشے سے وابستہ شخص ان جرائم پیشہ لوگوں کی شعبدے کار یوں کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہمارے روز و شب انہی لوگوں میں گزرتے ہیں۔ ایک نمبر کے چھپے ہوئے لوگ ہوتے ہیں یہ جناب!“

”لیکن اس کے بھائی کو اس کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ یہ سراسر انسانی ہم دردی کی بات ہے۔“

”معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے لیے نہایت معزز محترم ہیں لیکن پولیس اور قانون کے اپنے کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ میری درخواست ہے آپ مجھے کی کوشش کیجیے اس آدمی کی وجہ سے تین آدمیوں کا خون ہو چکا ہے اور یہ اس کا محترف ہے۔“

”کیا کہا آپ نے؟“ ڈاکٹر برصغری سے بولا ”یعنی اس نے اعتراف کیا ہے کہ تینوں مل اس نے کیے ہیں۔“

”پولیس، میں نے یہ کب کہا جناب!“ بڑے افسر نے بدگلت صراحت کی۔ ”میرا مطلب ہے یہی بنائے فساد رہا ہے۔“

”کبھی بات کر رہے ہیں آپ۔“ ڈاکٹر رائے نے برہمی سے کہا۔ ”دیکھیے آئی جی صاحب! اس کا بھائی میرے زیر علاج ہے اور اس کی حالت سے میں واقف ہوں، آپ نہیں۔ یہاں اس کی ضرورت ہے۔ آپ کہتے ہیں یہ یہاں آ کے تین افراد کی موت کا سبب بن گیا، سبب بننا اور قتل کر دینا اور قتل کے لیے آمادہ کرنا تین مختلف باتیں ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کل رات یہ اسپتال میں تھا۔ اکبر علی خاں کو رخصت کرنے کے بعد یہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کیا اس نے اسپتال میں ٹھس آنے والے حملہ آوروں کو آمادہ کیا تھا کہ میرے بجائے انھونی کو ختم

کر دو؟“ تیسرے کے بارے میں اس نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ وہ اپنے ہی ایک اندھے ساتھی کا نشانہ بن گیا۔ ڈاک خانے والی گلی میں چور کا پیچھا کر کے یہ کون سے جرم کا مرتکب ہو رہا تھا؟ شہر میں ایک انجینی مسافر کو اپنی جمع پونجی چھن جانے پر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے تھا۔ چور کا پیچھا کر کے اس نے اپنا ہاتھ حاصل کر لیا تھا کہ دو آدمی چاقو تانے دیوار بن گئے۔ ان میں سے ایک آدمی سے غلطی ہوئی، کیا یہ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر دیتا؟ پھر پولیس والے اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔

پناہ گئے لیے یہ ایک شریف الطبع وکیل کے گھر میں جبراً داخل ہو گیا۔ اس نے سارا واقعہ سن کے ہم دردی کا اظہار کیا اور کسی ناخوش گوار صورت سے اسے بچانے کے لیے اس کے ساتھ میڈا کے ٹھکانے پر جانے کی جرات کر لی۔ وکیل صاحب نے میڈا کو ہموار کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی۔ جس خیال سے اس نوجوان نے میڈا کے ٹھکانے پر جانے کا ارادہ کیا تھا، وہ اڈے پاڑوں کی ریت کے عین مطابق تھا اور یقیناً یہ کسی اعتنا دہی میں وہاں گیا تھا۔ اس اعتماد میں کہ یہ میڈا کو چوکی سے اتار سکتا ہے۔ چاقو پر کوئی اور اتنی دست رس نہیں رکھ سکتا۔ کیا میڈا ہی حرف آخر ہے۔ اس کے پاس کون سا راستہ تھا پھر؟ میڈا نے اپنے گرگوں اور پولیس کے سپاہیوں سے مل کے اس کے لیے ہسپتال تک پہنچنے کا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ پھر یہ کیا کرتا؟ وکیل کے گھر چھپ جاتا، اپنے بیمار بھائی کو اسپتال میں تنہا چھوڑ کے؟

ڈاکٹر نے لمبے لمبے بھر کے لیے توقف کیا تھا کہ ادھیڑ افسر زہر آلود مسکراہٹ سے بولا، ”آپ کو تو ڈاکٹر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر نے اس کی جانب غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر آگ سی جھڑکی۔ ادھر لگی دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے ناراضی سے پوچھا۔ ”کون

ڈاکٹر نے اس کی جانب غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر آگ سی جھڑکی۔ ادھر لگی دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے ناراضی سے پوچھا۔ ”کون

ہے؟ اندر آ جاؤ۔“

جس دروازے سے ڈاکٹر داخل ہوا تھا، سفید وردیوں میں دو آدمی خوان پوشوں سے ڈھکے تخت اٹھائے اندر آئے۔ انہوں نے سلیقے سے وسطی ہیز پر تخت رکھ کے خوان پوش ہٹا دیے، ایک میں ٹھیکین چیزیں، تھنریاں، کیک اور انگریز کی بکٹ وغیرہ تھے۔ دوسرے میں چائے کے برتن، کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بڑے افسر نے جسے ڈاکٹر رائے نے آئی جی کے خطاب سے مخاطب کیا تھا، اس تکلف کے لیے چند رکی بٹلے ادا کیے۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر خدمت گاروں نے سٹوں کی جاشیزیں نکال کے ہمارے سامنے کر دیں اور ان پر مچوں کے ساتھ تشریاں رکھ دیں۔ ایک خدمت گار پہلے تخت آئی جی، پھر دوسرے افسروں اور ڈاکٹر رائے کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے میری طرف اٹھلے سے اشارہ کیا تو خدمت گار ڈاکٹر کو چھوڑ کے میرے پاس آ گیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نے ایک بکٹ تختی میں رکھ کے گویا مہمانوں کے ساتھ شرکت کی وضع پوری کی۔ سب کو چائے پیش کر کے لازم جلد ہی رخصت ہو گئے۔

”آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“ خدمت گاروں کے جانے کے بعد ادھیڑ افسر نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔

”مگر مجھے شبہ ہے کہ آپ بن بھی رہے ہیں۔ سنا ہے پولیس ایک کان سے سنتی دوسرے سے لڑا رہی ہے۔“

”آپ پولیس سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔“ آئی جی زیر لبی سے بولا ”پولیس میں بھی آؤی ہوتے ہیں جناب اور آدمی سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پولیس میں بھی کالے اعلیٰ لوگ ہوتے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں.....“ وہ جھجک کے بولا، ”آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟“

”ایک خوش فہم کو بہتری ہی کی امید کرنی

چاہیے۔“ ڈاکٹر نے پر عزم لہجے میں کہا ”اور پھر یوں بھی کہ میں اپنی دانست میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا۔ میں اس نوجوان کی سفارش نہیں کر رہا بل کہ حقائق بیان کر رہا ہوں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، یہ تو اپنے کو دوا پر لگنے کے میڈا کے ٹھکانے پر چلا گیا تھا۔ میڈا نے چاقو آزمائی سے کیوں پہلو بھی کی۔ وہ اتنا ہی زور آور ہے تو ایک انجینی کے سامنے سینہ تان کے آ جاتا۔ اس نے درمیان کاراست اختیار کیا۔ کیوں؟“ ڈاکٹر نے تیز آواز میں آئی جی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”اب وہ میڈا کے آدمی تھے جو اسپتال میں اسے ختم کرنے آئے تھے یا اس شخص کے باگلی ساتھی جو ڈاک خانے والی گلی میں اپنے ہی ساتھی کی وحشت سے ہلاک ہو گیا۔ کیا یہ واقعہ اسی طرح پیش نہیں آ سکتا جس طرح اس نوجوان نے بیان کیا ہے؟ کہیں کوئی بے ربطی، کوئی ابہام نظر آتا ہے آپ کو؟ واقعات کی ترتیب میں کہیں کوئی جھول ہے؟“ ”یہ ظاہر کوئی نہیں، نہایت مکمل خاکہ۔“ آئی جی نے انجینی آواز میں کہا۔

”آپ اسے خاکہ کہیں یا داستان۔ میں اسے تین چار دن سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بدگلائی بھی کی ہے۔ یہ اپنے بھائی کے لیے جان پر نکیل سکتا ہے۔ اس کا ثبوت بھی دیا ہے اس نے۔

اس صورت حال میں یہ بھائی کو چھوڑ کے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ یہ یہاں موجود ہے..... میں اس کے بھائی کا معالج ہوں اور ان دونوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہوش مند، جرأت مند اور بہت سے اپنے ہم عمروں سے مختلف ہے۔ اسے آگئی ہوئی چاہیے کہ سر دست یہ کسی غلط بیانی کا قائل نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ اسی شہر میں ہیں کچھ بھی آپ سے دور نہیں ہے، نہ میڈا کا اڈا، نہ ڈاک خانے والی گلی، وہاں بہت سے راہ گیر اور اتھاتی

تھے۔ پہلے ان گوشوں کو نوں کو ذرا اٹھال کر دیکھیے۔“
 ”وہ تو پولیس ٹیم کر رہی ہے۔ صرف ہم
 تینوں افسران نہیں، چنانچہ شہر کی ساری پولیس جلد
 از جلد نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ مجھے کیا
 کارکردگی اور عزت کا معاملہ ہے۔“ اوجیز افسر نے
 بڑی حد تک روکھے انداز میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے، پہلے اپنے طور پر تفتیش کر لیجیے۔
 ضرورت پڑے تو ضرور یہاں آئیے۔ میں یقین
 دلانا ہوں۔ یہ یہیں موجود ہے، کہیں نہیں جا رہا۔
 آپ جب چاہیں یہاں آ سکتے ہیں اور اس سے
 رابطہ کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی دیکھی بات ہو تو میں
 خود اسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب مشکوک لوگوں کو ہمارے
 ہاں ایسی رعایتیں نہیں دی جاتیں۔ ہماری تفتیش کا
 اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ مجرم کا کھرا کھوٹا ذرا جلدی
 سامنے نکل آتا ہے۔ ہمیں اس کے شہر فیض آباد کی
 پولیس سے بھی رابطہ کرنا ہے، اس کے تمام پس منظر
 اور دیگر حوالوں کی چھان بین کرنی ہے۔ پولیس کو
 اسے یوں کھلا چھوڑ دینے کا خطرہ مول لینا نہیں
 چاہیے، اور آپ بھی جناب! معاف کیجیے، ہماری
 غلصہ علاج ہے، آپ بھی اس پر اتنا اعتماد نہ
 کیجیے۔ میدانے کے ٹھکانے پر یہ بات الٹی ہو جاتی، یا یہ
 اسپتال آنے والے سر پھروں کے ہاتھ آجاتا تو بھی
 تو اس کا بھائی تہا ہو جاتا۔“ اوجیز افسر نے کھردری
 آواز میں کہا۔

”لیکن ایسا نہیں ہوا۔“ ڈاکٹر پھر کے
 بولا، ”اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ اب آپ اس کی
 خوش قسمتی غصہ کر لیں۔“

”ذرا اس پہلو پر بھی غور کیجیے ڈاکٹر صاحب! یہ
 پولیس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہے گا۔ آپ دیکھ
 رہے ہیں، یہ ان کے ہاتھ نہ آیا تو انہوں نے اس
 کے مرنے کی دھمکی اکبر علی خاں کو ختم کر دیا۔ وہ دوبارہ
 کچھ اور منصوبہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ لگتا ہے وہ

چین سے بیٹھنے والے نہیں، بڑے خطرناک، منظم
 مزاج لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے وجود سے
 ان کے بچے جمائے ٹھکانے، ان کی بادشاہت پر
 ضرب پڑنے کا خدشہ ہے اور اگر وہ میدانے کے آدمی
 نہیں اور آپ کے اندیشے کے مطابق وہ بالکل ڈاک
 خانے والی گلی میں مرنے والے کے ساتھ بھی
 ہو سکتے ہیں تو وکیل صاحب کے خانے کے بعد وہ
 مطمئن ہو گئے ہوں گے کیا؟ کیا انہوں نے اپنے
 ساتھی کی قیمت وصول کر لی؟ ہماری تفتیش اپنی جگہ،
 پولیس کی تحویل سے مراد اس کی حفاظت کی ضمانت
 بھی تو ہے۔ یہ کھلا رہا تو اور خون خرابے کا امکان
 ہے۔ جو لوگ اس کے دوست وکیل صاحب پر اپنا
 غضب آزما سکتے ہیں، ان سے کیا بعد ہے کہ وہ اس
 اسپتال میں پڑے اس کے بیمار بھائی کو بھی.....“
 میری طرف دیکھ کے اوجیز افسر کی آواز بل کھانے
 لگی۔

”اب آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔
 ایک بات طے کر لیجیے، آپ اسے شخص شک کی بنیاد
 پر ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، یا اس کی حفاظت کے
 لیے، یا دونوں کے لیے؟“ ڈاکٹر جھلائے لہجہ میں
 بولا، ”میں نہیں سمجھتا شک کی کوئی معقول وجہ موجود
 ہے اور حفاظت تو آپ یہاں بھی کر سکتے ہیں۔
 اسپتال کی تاریخ میں چکی بار پولیس یہاں آچکی
 ہے۔ کچھ اور نظریہ بھی دیکھیے۔ یہاں اسپتال میں بھی
 آپ اس کی حفاظت بہ خوبی کر سکتے ہیں۔ تھوڑا بہت
 قانون مجھے بھی معلوم ہے۔ اپنی سلامتی کے لیے یہ
 قانون بھی آپ سے مدد طلب کر سکتا ہے اور رہا
 خانہ خرابی کی بات تو آپ شہر میں کس لیے ہیں آپ
 کا کیا کام ہے۔ شہر میں امن و امان کے لیے ہوئی ہیں
 اب بھی آپ.....“ ڈاکٹر کوئی شدید بات کہتے نہ
 رہ گیا۔

”چند لمحے توقف کے بعد اس نے زری سے کہا
 ”آپ اسے یہاں سے لے جانے ہی پر مجبور اور مرم

ہیں تو مجھے بتائیے میں آپ کا بار کم کرنے، آپ کی بریت کے لیے کس حاکم اخلاص سے بات کروں۔
تینوں افسر اضطراری انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”آپ کی اطلاع کے لیے.....“ ڈاکٹر نے روکھی آواز میں کہا، ”کچھ دیر پہلے میں نے میر سٹرنی اہل بھارگو سے بات کی ہے۔ وہ بہت مصروف ہیں لیکن میری گزارش رد نہ کر سکے، پورا معاملہ سن کے رضامند ہو گئے۔ انہوں نے ضمانت قتل اگر قتاری کا مشورہ دیا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں، کوئی بھی ضمانت۔“

یہ ایک آئی جی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں افسر اسے دیکھ کے ہڑبڑا گئے۔ ڈاکٹر رائے نے ان سے چند لمحوں کے لیے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر نے اتنی دیر میں پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔ ”تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے انگیر پڑی میں مجھ سے پوچھا تھا۔ اس دوران وہ چاروں مسلسل انگریزی میں بات کرتے رہے تھے۔ کوئی جواب دینے کا مطلب تھا کہ میں نے ڈاکٹر کی بات سمجھ لی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے انگریزی میں بولنا پڑا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا، ”نہیں ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہوں اب۔ کبھی کبھ تو آپ نے کہہ دیا ہے۔ اڈے بازوں سے تعلق کی وجہ سے پولیس کا مجھے کسی قدر تجربہ ہے۔ ان کے لیے خانہ پر ہی بہت اہم ہوتی ہے لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں، میں اس وقت تک یہیں رہوں گا جب تک بھائی یہاں زیر علاج ہے۔ اور شہر سے جاؤں گا تو پولیس کو بتا کے۔“

میرے انگریزی بولنے پر ان تینوں کے جسم کھچ سے گئے تھے۔ انگریزی زبان کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کچھ اور نظر آنے لگتا ہے۔ آدمی معجز ہو جاتا ہے۔ پولیس والے تو وہ تھے ہی، مولی چوڑی کے سہی، آدمی تو بہر حال ہوتے ہیں۔ اس گمان

میں کہ میں کچھ اخذ نہیں کر رہا ہوں، میرے بارے میں انہوں نے بڑی ناگواری اور حقارت سے بات کی تھی۔ یقیناً انہیں اب کچھ خجالت ہوتی چاہیے۔ خجالت کے بجائے ان کے چہروں سے حیرت بھٹک رہی تھی۔

”میری آپ سے التجا ہے۔“ میں نے بہراہ راست آئی جی کو مخاطب کیا، ”پولیس کا ایک اور کام بھی ہوتا ہے۔ جن کا نقصان ہوا ہے، ازالہ ممکن نہیں تو کم از کم ان کی دل دہی، دل جوئی کرنی چاہیے۔ میں نے اکبر علی خاں صاحب کا گھر دیکھا ہے۔ ان کے بچے زیادہ بڑے نہیں، بیوی کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ ایک بوڑھی ماں تیار ہے۔ ان کے گھر یہ تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مجھ میں وہاں جانے کی ہمت نہیں تھی، کس منہ سے ان کا سامنا کر پاؤں گا لیکن میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت نہیں دی۔“ میں نے عاجزی سے تکرار کی، ”میں یہیں رہوں گا جناب! اس اسپتال میں، کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر اس شہر میں مجھے ایک اور بھی کام ہے۔ میدا کے اڈے پر اپنا چاقو واپس لینے بھی جانا ہے۔“

تینوں متلاطم سے ہو گئے۔ نوجوان افسر نے بے کلی سے پوچھا، ”تو..... تو تم وہاں جاؤ گے؟“ ”جانا ہے۔ یہ میرا اس کا وعدہ ہے۔ وعدہ تو قرض جیسا ہوتا ہے۔ کم از کم میرے لیے تو ہے۔“ ”یعنی تم اسے تم زیر کر کے اس کے ٹھکانے پر قبضہ جمانا چاہتے ہو؟“ نوجوان افسر کی آواز ہتھمٹانے لگی تھی۔

”میں آپ کو شاید بتا چکا ہوں مجھے آگے جانا ہے، لیکن قرض چکا ہے، بس چلتا تو میں آج ہی ادھر چلا جاتا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہاں ایک طرح سے قید ہو جانے کا حکم دیا ہے۔“ ”بازی الٹ بھی تو سکتی ہے۔“ نوجوان افسر

نے کہا۔

”بازیوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔“ میں نے بے پروائی ظاہر کی۔

”دیکھا، دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب! اس کے خور دیکھے آپ نے؟“ ادھیڑ افسر تیزی سے بولا۔

”بیچ بول رہا ہے۔“ ڈاکٹر نے اٹھی آواز میں کہا۔

وہ تینوں اٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی پھر ان سے کوئی کلام نہیں کیا، چند رسمی الوداعی فقرے ادا کرنے ضروری تھے اور دروازے تک ان کا ساتھ دیا۔

ان کے جانے کے بعد کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ چند ثانیوں تک ڈاکٹر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے سانسیں استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا بہت تھک گیا ہو اور ایک وقفہ سکون لازم ہو۔ میں اس کے نزدیک گم سم کھڑا رہا۔ میری عقل میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا بولوں۔ ہر لفظ مجھے بے باہمی محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں میری آنکھیں پھر آئیں۔ میں اس کے ہاتھ چومنا، اس کے پیچ پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ایک نظر میری جانب دیکھا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے حکم دیا، ”تم ایک لفظ نہیں کہو گے۔ میں نے جو کہہ کہا اور کیا، اسی کو ٹھیک سمجھتا تھا۔ اب جاؤ اپنے کمرے میں اور بھائی کو دیکھو۔“

اس نے مجھے زبان کھولنے نہیں دی اور تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔ میں دیر تک بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔

کمرے کے باہر سیورین میری منتظر تھی، بے اطمینان بڑی جانب لپکی اور سین میرے سامنے آ کے راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا ہوا، چلے گئے؟“ سب ٹھیک تو رہا؟“ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ

کر دی۔

میں نے آنکھیں موند کے اور ہاتھ اٹھا کے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

”میرا دل بہت دھڑک رہا تھا۔“ وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولی۔ ”لگتا ہے، تم ایک طویل مدت بعد قید سے رہا ہو کے آ رہے ہو۔“

”مجھے بھی کچھ بکلی لگتا ہے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”کس کو نہیں لگتا۔ پولیس کو کبھی شاید پولیس سے ڈر لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کسی رکھو، سب ٹھیک ہی رہا۔“

”شکر ہے، میں دعا سیں کر رہی تھی۔ سوچتی تھی، تمہارا آخر کیا قصور ہے۔“ وہ الٹی آواز میں بولی۔

میں نے اس سے نہیں کہا کہ میرا قصور تو میرا وجود ہے۔ اتنی کشاکش، اتنی آزمائشوں کے بعد بھی یہ وجود اپنے ہونے پر کیوں مصر ہے۔ ہم دونوں راہ داری کا مختصر فاصلہ عبور کر کے کمرے میں آ گئے اور میرے قدم سیدھے غسل کی طرف اٹھے۔ وہ جاگ رہا تھا میری آہٹ سے آنکھیں کل گئیں۔ مجھے دیکھ کے لبوں میں جھپٹ ہوئی۔ اس نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سن سکا۔ اس نے دہرایا بھی نہیں۔ سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے غسل کے خیم پر ڈھکی دلائی جیسی چادر درست کی، سرخانے جا کے بال سنوارے، پیشانی پر ہاتھ رکھا اور ہندستانی میں نرمی سے پوچھا، ”سر میں درد تو نہیں۔“

”غسل نے ممنونیت کے انداز میں سر ہلا کے انکار کیا۔“

”کچھ چاہیے آپ کو؟“ سیورین نے شکستگی سے پوچھا۔

”غسل نے اپنا ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ سیورین بہت ہوش مند اور مستعد لڑکی تھی۔ دوسری جانب جا کے اس نے غسل کا اٹھا ہوا ہاتھ قلم لیا۔ ادھر

ٹھٹھل کا دوسرا ہاتھ میں نے پٹے میں جکڑ لیا۔ نیچے پر اس کی گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ بحال ہو رہا ہے۔ ارادہ آدمی کی متاع ہے۔ اس کے بغیر آدمی کیا ہے؟ ہے بھی نہیں بھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بھی تیز تھی۔ سیوریں آدمی انگریزی، آدمی ہندستانی میں اسے نفی دلا سے دینے لگی۔ ٹھٹھل کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ چھائی رہی۔ گھڑی دیکھ کے سیوریں کے بدن میں جیسے بجلی سی بھڑکی۔ اس نے ٹھٹھل کا ہنر سرھانے سے کچھ اونچا کیا اور یکے بعد دیگرے دو انیاں پلانے لگی۔ کچھ دیر بعد ٹھٹھل کے پیو نے بھاری ہونے لگے اور وہ جلد ہی خود سے بیگانہ ہو گیا۔ سیوریں نے مجھے اس کے پاس سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ نیچے میں دبا ہوا ٹھٹھل کا ہاتھ آہستہ آہستہ میں نے جدا کیا۔ اس کی گرفت پہلے ہی کم زور پڑ چکی تھی۔ دواؤں میں یقیناً خواب آور دوا میں شامل ہوں گی یا اسے بھی اتنے ہی حوصلے کی توفیق ہو سکی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھا۔ گزشتہ کل کی نسبت سے تو بہت غنیمت تھا۔

سونے پر آئے میں نے اپنے آپ سے غافل ہونے کی کوشش کی، لیکن آدمی کا اختیار اس کے پاس کس قدر ہے۔ کتابی کوئی ارادے کا پختہ ہو، اس کے دل و دماغ کتنے ہی متوازن ہوں، اسے اپنے در پیچہ دروازے بند کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ میں نے نہیں پڑھا تھا، یا سنا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا دوست اس کا ہوش ہے اور سب بڑا دشمن بھی یہی ہوش ہے۔

دروازے پر کسی رفیق کا رکی جھلک دکھائی دی تھی کہ اسے کمرے میں بلانے کے بجائے سیوریں خود باہر چلی گئی۔ ٹھٹھل کمرے میں موجود تھا، لیکن بے خبر آدمی کی موجودی ایک گمان ہے۔ میں تنہا رہ گیا، اور آدمی تنہا کہاں ہوتا ہے۔ تنہائی تو ایک عددی امتیاز ہے کسی کے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے، مگر آدمی ہمہ وقت، ہر لمحہ اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ تنہا

آدمی اپنی ذات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے، ایک در پیچہ بند نہیں ہوتا، دوسرا کھل جاتا ہے، تیسرا، چوتھا..... اور کیسے کیسے بھولے بسرے، دور افتادہ، کیسے مٹی لوگ آکے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرا سر دکھ رہا تھا۔ سر کیا، سارا جسم ہی کسی زخم کے مانند تھا۔ آدمی کو اپنا آپا بھی کیسا حقیر، کوڑے کا ڈھیر لگنے لگتا ہے۔ میں بہت نظریں چرا تھا تھا، لیکن بار بار اکبر علی خاں سامنے آ جاتے تھے، مجھ سے جیسے کوئی سوال کرتے ہوں، ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی بیار ماں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک ضعیف و ناتواں عورت..... ان سب کی نظریں کانٹوں کی طرح، میرے جسم میں پیوست ہوتی تھیں اور ہڑک سی سینے میں اٹھتی تھی کہ میں یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ کیا صرف پشیمانی، ملال اور بے بسی کا احساس اکبر علی خاں مجھے بے بہا، بے پناہ آدمی کا مول ہے۔ دست و پا زوایں ٹھٹھلے تھے کہ یہ کیسی مصلحت کوئی، مال اندیشی ہے کہ میں یہاں ہاتھ پیر توڑے بیٹھا ہوں۔ اکبر علی خاں یوں چلے جائیں اور مجھے معلوم ہو کہ ان کے قاتل کس سمت سے آئے تھے، وہ کون ہو سکتے ہیں۔

مجھ سے پچھانہ جا سکا تو اٹھ کے کمرے میں چکر کاٹنے لگا، اس کو نے سے اس کو نے نیک۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی کمرے میں چھائی ہوئی تھی، لیکن روشنی، ہوا، کھڑکیاں، کھلے دروازے، سب کچھ آدمی کے اخذ و استنباط کی آمادگی سے مشروط ہے۔ آدمی کے اندر ہی اندر جیسا چاہا ہو اور آدمی کا جسم ہی جسے بنا ہو اور آدمی کو اپنا آپا ہی نہ رہ گیا ہو۔

شکر ہے سیوریں جلد واپس آ گئی۔ اس کا چہرہ بچھا ہوا تھا۔ آکے اس نے وہی شائستگی اختیار کی جو اس لڑکی کے حسن و جمال اور نرم اور نازکی پر مستزاد تھی۔ مجھے بتائے بغیر باہر جانے کی معذرت کی اور کہنے لگی، اس کی رفیق کا دوست اسے بتائے آدمی

تھی کہ انتھونی کی بیوی شیری کا بچہ اس کے پیٹ میں مر گیا ہے۔ آپریشن کر کے شیری کو بچا لیا گیا ہے، لیکن اس کی حالت نازک ہے۔ سیوریں بہت اداس تھی۔ مجھ میں مزید یاسیت کی تاب نہیں تھی۔ میں خاموش رہا اور دوبارہ سونے پر آمنا۔ اکبر علی خاں کے سامنے سے انتھونی اور جھل سا ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو اپنے گھر والوں کو بہت عزیز تھا۔ اس کی بھی بیوی تھی اور متعلقین تھے۔ مرنے والوں کے پس ماندگان اذیتیں جھیلنے کے لیے کیوں زندہ رہ جاتے ہیں۔ ایک آدمی مر جاتا ہے تو کتنے آدمی ویران ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی مر جایا کریں تو کسی کی جدائی کسی کے لیے عذاب نہ رہے۔ کسی آدمی کے مرنے سے ایک گھر اجڑ جاتا ہے تو گھر ہی کیوں باقی رہے۔

سیوریں میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور در نیک کھولی کھولی رہی۔ مجھے وقت کا احساس نہیں تھا۔ کسی لمحے اس کی نظر گھڑی پر گئی ہوگی، یا اسے ویسے ہی خیال آیا کہ چونک کے بولی، "تم نے صبح سے کچھ کھایا یا نہیں ہے۔"

میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کے کہا، "بھوک ہی نہیں ہے۔"

"تھوڑا بہت تو کچھ کھا لو۔"

میں نے بیزاری سے انکار کر دیا۔

کل اسی وقت اکبر علی خاں کھانا لائے تھے۔

سیوریں بھی شریک ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ یقیناً اسے اکبر علی خاں یاد آ رہے ہوں گے۔

آدمی کتنی جلدی شخص یاد ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا، میری وجہ سے وہ ان کا ذکر نہیں کر رہی ہے۔

"جائے..... کافی، یا تھوڑا سا رس۔ کچھ تو لے لو....."

وہ التجائی لمحے میں بولی۔

"نہیں، اس وقت کچھ نہیں۔ بس تم یہاں بیٹھی رہو۔"

"میں یہیں ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے

ہاتھ پر رکھتے ہوئے ڈوبی آواز میں کہا، "مجھے معلوم ہے، تم پر کیا گزر رہی ہے۔ کہتے ہیں بس..... مگر کوئی کسی کا دکھ کیا بتا سکتا ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن یہ بھی تو ایک بچ تھا کہ اس کی موجودی سے کتنی کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے پلکیں جھپکا کے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ پولیس افسروں سے تمہاری کیا بات ہوئی۔ مجھے کچھ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں، کچھ خاص نہیں۔"

"سنا ہے، بڑے پاگل لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے آسانی سے کسی کو نہیں چھوڑتے۔"

"میں نے جوتھا، انہیں بتا دیا تھا، لیکن وہ میری بات تسلیم نہیں کر رہے تھے۔"

"پھر کیسے تم.....؟" وہ ہنست چبانے لگی۔

"پھر ڈاکٹر رائے نے ان سے بات کی۔"

"ڈاکٹر رائے! کیا وہ بھی وہاں موجود تھے؟"

"بعد کو آ گئے تھے اور پھر انہوں نے..... انہوں نے تو....."

میری آواز رنڈھنے لگی۔ "کیسے مشفق اور بچے آدمی ہیں وہ۔ اس وقت میں یہاں تمہارے پاس انہی کی وجہ سے بیٹھا ہوں۔"

"وہ تو ایک مکمل آدمی ہیں۔ کبھی ان کی عزت بے وجہ تو نہیں گرتے اور کبھی ان سے بے وجہ خوف نہیں کھاتے۔ وہ تو ایک مثال ہیں۔"

"کون ہوتا تھا میں ان کا؟ ایک اجنبی، ایک بیمار آدمی کا نگہدار..... اور کیا رشتہ ہے میرا ان سے؟"

"صبح جوان سے تمہاری بات ہوئی ہے۔ تم نے ضرور انہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

"میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں تھا..... اور انہوں نے اسی طرح یقین کیا، جس طرح میں نے کہا تھا۔"

"وہ جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ صرف ڈاکٹر ہی

ہر آدمی تمہاری دست رس میں..... تمہارے پاس
ایسی کوئی عنایت ہوئی چاہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد تم
سے بہادریوں اور بادشاہوں کا سلوک کیا جائے
مگا۔“

”لیکن میں..... میں تو یہاں موجود ہوں۔“
میں نے کئی پچھنی آواز میں کہا، ”ڈاکٹر رائے کی تنبیہ
کے باوجود میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ بے شک
میرے ذہن میں یہ خدشات اور اندیشے اتنے واضح
نہیں تھے، لیکن تھے ضرور..... اس لیے میں نہ جا سکا
میں تو اپنے دل و دماغ کی حالت، اپنی کیفیت بیان
کر رہا تھا۔ مجھ پر یہ وقت بہت بھاری گزر رہا ہے۔
یہ کراہ مجھے قید خانہ محسوس ہوتا ہے۔“

”یہ کرب و اضطراب بڑا فطری ہے لیکن اس
نظر بندی کے سوا تمہارے پاس کیا راستہ ہے۔“
سیورین دل سوزی سے بولی، ”بہادری کو دانائی
سے عاری نہیں ہونا چاہیے۔ باہر جا کے تم اپنے
مقصد میں کام یاب بھی ہو جاؤ تو اکبر علی خاں اور
انھوں کو واپس نہیں لاسکتے۔ اس کام بانی کے بعد
اور پیچیدہ گیاں بھی تو پیدا ہو سکتی ہیں۔ پولیس دوبارہ
تمہیں ساتھ لے جاسکتی ہے اور تمہیں اندازہ ہوگا
کہ اپنی جگہ پر وہ تم سے کس طرح پیش آ سکتے ہیں،
پھر ڈاکٹر رائے بھی شاید کچھ نہ کر پائیں۔ اب اس
قدر اپنا ذہن مغلوب نہ رکھو تو اچھا ہے۔ اس وقت
تمہارے متعلق شہر میں بہت افواہیں گردش کر رہی
ہوں گی۔ تم کس کس کی زبان پر تالا لگاؤ گے۔ چند
دن میں بہر حال، سب کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ پولیس
بھی یوں پاؤں پیارے نیچے تو نہ رہے گی۔ ویسے،
عدالت، قانون، انصاف سب ختم ہو گئے کیا۔ کچھ
خداوند پر بھی چھوڑ دو۔ تمہارے کسی غلط قدم سے
بہت کچھ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تمہارا
بھائی متاثر ہو سکتا ہے۔ وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔
اسی پر تمہاری توجہ مرکوز رہنی چاہیے کہ تم اسی لیے
یہاں، اس شہر میں آئے تھے۔ بعد کو تمہاری جو مرضی

گمبھاری کرتی رہی۔ بھٹل غفلت میں تھا۔ اس
طرف سے مطمئن ہو کہ وہ دوبارہ سونے پر آئیگی
اور معذرت کرنے لگی کہ اس نے اپنی حیثیت سے
تجاوز کیا۔ وہ نہ جانے کیا اول ذول بختی رہی۔

”تم نے کیا..... کیا غلط کہا۔“ میں نے پچھانی
لہجے میں کہا، ”مجھے تو تعجب ہے، تمہیں اتنی
باتیں..... اتنی مدلل اور موثر باتیں بھی کرنی آتی
ہیں۔“

میں کہہ نہ سکا اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تخمینے
میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اس کا کچھ کی بنی، پھولوں
کی طرح نازک، ریشم کی طرح نرم ٹڑکی کی دانائی
اور جزو بنی کا مجھے ایسا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھے زیریں
کی مثل لگ رہی تھی۔ کوئی کسی کے کھینچے، کسی کے
دکھ میں اس قدر شبیدہ، اتنا شامل کہاں ہوتا ہے۔
”ایک بات بتاؤ، تمہیں اکبر علی خاں کے گھر
جانے کی بے غلی ہے۔ یا ان کے قاتلوں کی سرکوبی
کی؟“

مجھے جواب دینے میں ہنگامہ نہ ہوئی۔
میرے جواب کے انتظار میں اس نے چند لمحے
تاہل کیا اور متانت سے بولی۔ ”شاید دونوں
کی..... ہوئی بھی چاہیے، لیکن یہ وجوہ نہ اس وقت
اکبر علی خاں کے گھر جانا مناسب ہے نہ کسی دوسرے
کام سے باہر جانا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بس تمہارے
باہر نکلنے کی دیر ہے، تم ان کے سروں پر پہنچ جاؤ گے
جنہوں نے انھوں اور اکبر علی خاں سے ان کی
زندگیاں چھین لی ہیں۔ تمہارے انتظار میں وہ سر
جھکائے کھڑے ہوں گے کہ تمہیں ہمارے انجام تک
پہنچاؤ.....؟ اور کیا تم اس گمان میں ہو کہ کسی اور
طرف جانے کے بجائے تم سیدھے اس بد معاش
کے ٹھکانے کا رخ کرو گے جس کا چاقو تمہاری جیب
میں ہے اور جو شہر کے تمام شورہ پشتوں کا سر غیب ہے۔
تم اسے تخت سے اتار کے اس کی قلم رو کے حاکم بن
جاؤ گے، پھر سب کچھ تمہارے زیر نگیں ہوگا اور اس کا

ہو کر نینا۔ وہ چپ ہو گئی۔

سیورین کے سچے میں بیگانگی کی رمزی نے مجھے بہت آزر دہ کیا۔ ”میں..... میں کہیں نہیں جا رہا۔“ اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نے پر غزم سچے میں کہا۔

میری طرف دیکھ کے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ چمکنے لگی۔ میری آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔ سوئے سے اٹھ کے وہ حاکمانہ انداز میں بولی، ”میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ انکار مت کرنا۔“ تنہی نے کہا، ”تم کی توانائی کے لیے غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ ایسا ہی کہا تھا نا.....؟“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

معمول کے خلاف دو پہر بھٹل کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر رائے کے بجائے دو اور ڈاکٹر آئے، لیکن شام کے دورے پر ڈوبتے اجالے کے کے وقت ڈاکٹر رائے ایک نوجوان ڈاکٹر اور ایک عمر رسیدہ نرس کے ساتھ کمرے میں وارد ہوا۔ وہ کچھ جگت میں معلوم ہوتا تھا، بدحواس سا۔ آتے ہی وہ سیدھا بھٹل کے پاس گیا اور مجھے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ بھٹل کے معائنے کے دوران اس نے دوسری بار مجھے باہر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ راہ داری میں میں زیادہ دور تک نہیں گیا تھا کہ کچھ فاصلے پر دو ہندوئی بردار سیاہی گشت کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کے وہ چونکے سے ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ آکر ناخشا کچھ اور آگے جاؤں، لیکن بے کار منہ گھٹنے والی بارت نہ ہو جائے۔ ادھر کسی وقت ڈاکٹر رائے کی طلی کا خیال بھی مانع رہا۔ میں نے اپنے قدم روک لیے اور نورانی واپس آ گیا اور کمرے کے آس پاس راہ داری میں ٹھہرا رہا۔ یہی ہوا، کچھ دیر بعد سیورین تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی اور اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی لمحے کی تاخیر کے بغیر میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کا منظر میرے لیے کسی خواب کے

مانند تھا۔ بھٹل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈاکٹر رائے اس کے بہت قریب کھڑا سرگوشتیاں سی کر رہا تھا۔ بھٹل کبھی زیر لب، کبھی سر ہلا کے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کی آواز پر قناعت طاری تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے پاس بلا لیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چمکنی آواز میں بھٹل کو مخاطب کیا، ”یہ بہت تنگ کرتا ہے، ہم کو..... اس کے لیے تم کو جلدی ٹھیک ہو جانا ہے، سمجھا نہیں تو یہ بتا دیتا ہوں۔“

بھٹل نے پتلیں جھپکیں، میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کوئی حسرت سی اند آئی۔ اس نے سر ہلا کے ڈاکٹر رائے کو جیسے یقین دلایا کہ وہ اپنی ہمت جمع کرنے کے لیے خود فکر مند ہے۔ ”سر میں اب تکلیف تو نہیں؟“ میں نے بے تابانہ پوچھا۔

بھٹل نے گہری سانس لے کے اور آنکھیں بند کر کے بددلتے ہوئے لٹی کی۔ ”بس اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے جلد ہی۔“

ڈاکٹر رائے میرا بازو تھامے مجھے اس کے پاس سے سونے پر لے آیا۔ اس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر اور نرس نے سیورین کی اعانت سے بھٹل کا بستر پھر نیچے کر دیا۔

”اکبر علی خاں کی تدفین آج نہ ہو سکی۔“ ڈاکٹر نے پاس بھرے سچے میں مجھے بتایا، ”اس کا بڑا بھائی حیدر آباد کن سے آ رہا ہے۔ سنا ہے، تدفین کل کسی وقت اس کے آنے پر ہوگی۔“

میں چپ بیٹھا رہا۔ ”شہر کے حالات نہایت کشیدہ ہیں۔ سارے میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بدقماش لوگ اسے دوسرا رنگ دے رہے ہیں، کیوں کہ ایک عیسائی، دوسرا مسلمان قتل ہوا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کے اندیشے میں پولیس بڑی تعداد میں شہر میں گھوم رہی ہے۔ تم کہیں باہر نہ جانا۔ اسپتال میں بھی پولیس کی بڑی

نفری موجود ہے اور تمہارے ارد گرد وہ بہ طور خاص نگرانی کر رہے ہیں۔ آج دن بھر کچھ عجب مصروفیت رہی۔ اتفاق سے آج اسپتال میں کچھ سنگین قسم کے مریض آ گئے۔ دو پہر گھر بھی جانا نہ ہو سکا۔ صبح کی محسوس ہو رہی ہے۔ رات کو شاید آنا نہ ہو سکے۔ بھائی کے لیے ساری ہدایات میں نے ڈاکٹروں کو دے دی ہیں..... تم بھی اب آرام کرو اور اپنے ذہن پر اتنا زور مت دو۔ ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔“ مجھے چند نصائح کرتے ہوئے اس نے کسکسما کے کہا، ”تمہارے آدمی ابھی تک نہیں پہنچے۔“

”جی..... میں نے واجبی احترام میں اختصار گوئی پر اکتفا کیا۔“ معلوم نہیں کیوں، اکبر علی خاں صاحب نے تار دیے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ارجنٹ تار دیے ہیں، اور احتیاط ایک کے بعد دوسرا تار.....“

”تم نے انہیں کیوں بلایا تھا؟“ اس کی آواز روکئی تھی۔

”میں..... یہاں کی..... اور اپنی صورت حال دیکھ کے اکبر علی خاں صاحب نے بھی مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر کوئی برا وقت آ سکتا ہے، سو پیش بندی کے طور پر.....“ میرا لہجہ غیر ارادی طور پر معذرت خواہانہ ہو گیا۔ وہ ہنکاری بھر کر رہ گیا۔

”آجائیں گے پھر۔ تم نے بتایا تھا کہ ان کا تعلق بھی..... وہ کیا کہتے ہیں.....“ وہ الجھ کے بولا، ”اڈوں وغیرہ سے ہے۔ انہیں بھی پابند کرنا ہے جنہیں..... اور ہاں، وہ دن بھر اسپتال میں رہ سکتے ہیں، رات کو انہیں کوئی اور بندوبست کرنا ہے۔“

”جی!“ میں نے اسی طرح سنا جس طرح اس نے کہا تھا۔

”اور سنو! انہیں روک کے رکھنا ہے۔ وہ یہاں کوئی تماشہ نہ کریں۔ تمہاری خوش نوودی میں ان کا

ایسا خیال ہو تو اس اسپتال کا رخصتی نہ کریں۔“ اس نے جتنی سچے میں کہا۔

”جی، میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

یہ احکام صادر کر کے وہ سونے سے اٹھ گیا اور اس نے میرے کمال پر ہلکی کی چپت رسید کر کے مسکراتے ہوئے بولا، ”ہوش میں رہنا، کوئی کارنامہ نہیں۔“

”آپ نے ہاتھ پیر ہی بانٹ دیے ہیں۔“ میرے منہ سے نکل گیا۔

”ورنہ..... ورنہ تم کیا کر تے؟“ وہ اچک کے بولا۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہ ہوا۔ میں نے لکنت سے کہا، ”شاید کچھ بھی نہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے۔“

”ابھی لڑکے!“ وہ شایاش کے انداز میں بولا، ”اور سنو! انہیں رات کو شاید نیند نہ آئے۔“

سیورین نے مجھے بتایا ہے کہ قسم نے بہت برا وقت گزارا ہے۔ کبوتہ نیند کا بخشش لگاوا..... گولیوں سے بھی کام چل جائے گا۔“

میں سر جھکا کے کھڑا رہا۔ میرے سینے پر مکا مار کے دو کمرے سے چلا گیا۔

نرس ایلی آچکی تھی۔ آتے ہی مجھے کوئی بلا نہیں لیتا ہے، مجھے پہلو سے لگا یا اور کہنے لگی کہ سچ وہ چلی تو گئی تھی، لیکن دن بھر اسے جھپٹ نہیں آیا۔ میری طرف دھیان لگا رہا۔ اس لیے اس نے شام کی ڈیوٹی پر آنے میں بھی جلدی کی۔

سیورین کو اب گھر جانا تھا، لیکن نرسوں کے لیے مخصوص پیوست کمرے میں لباس تبدیل کر کے وہ واپس آ گئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ دو گھر کا لباس پہنے ہوئے تھی اور گھری کی کوئی لڑکی رک رہی تھی، اچھی اچلی، صاف شفاف، ہنسی ملی شرمیلی اور اداس اداس۔ لباس کی تبدیلی سے بھی آدمی کیا سے کیا

ہو جاتا ہے۔ اس لباس میں اسے دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ایک تربیت یافتہ ماہر نرس کا کام کرتی ہے۔ بلکی نیل رنگت کی ساڑھی میں اس کا ترشا ہوا سراپا نمایاں ہو گیا تھا۔ سر سے گردن تک لپٹے ہوئے اسی رنگت کے اسکارف میں چہرہ کچھ اور مغل اٹھا تھا۔ اسے تو اس اسپتال کے بجائے کہیں اور ہونا چاہیے تھا، کسی نکل دو محلے میں۔ ایسی کسی کام سے باہر گئی تھی کہ وہ سرسرائی آواز میں بولی، ”میں رات کو رک بھی سکتی ہوں۔“

میں نے بے دلی سے کہا، ”مگر تمہیں تمہیں گھر جانا چاہیے۔“

”گھر کھلوایا جاسکتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔“

”مگر ایسی تو یہاں موجود ہے، تم بے آرام ہوگی۔“

”گھر میں آرام کہاں ہوگا۔“ وہ آہ بھر کے بولی۔

”کیوں؟“ مجھے تڑو دیا۔ ”کوئی الجھن؟“

”نہیں نہیں آئے گی۔“

”ہاں!“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”ان حالات میں نیند کیسے آسکتی ہے مگر تم۔۔۔ تم تو خود مجھے بدابات دے رہی تھیں۔“

”لیکن اب لگتا ہے، میرے حالات تم سے مختلف نہیں۔“

”تم یہاں رکنا چاہتی ہو؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”مجھے اگر ضرورت محسوس ہوتی ہو۔“ وہ جھجک کے بولی۔

”میں تو کسی نہ کسی طرح وقت کاٹ ہی لوں گا، کاٹنا ہی ہے۔ چونکہ آدمی کو زندہ تو رہنا ہی ہوتا ہے، اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے۔“

”اور شاید دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہی

زندگی ہے۔“ اس نے جلتی بجھتی نگاہ سے مجھ دیکھا اور اٹھ گئی۔

”جاری ہو۔“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”کہیں تم میری نگرانی کے لیے تو۔۔۔؟ یہ ایک بھی بڑی چوکی دار ہے، اور میں کہاں جاؤں گا۔“

”تمہارا ہی خیال تھا۔“ اس نے ہنستی آوازیں کہا۔

”میں ٹھیک رہوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔“ وہ دروازے سے نکلا چاہتی تھی، میں نے کہا کہ میرے کپڑے شکستہ ہو گئے ہیں اور ہول میں سارا سامان ہے۔

وہ رک گئی اور سوچ میں ڈوب گئی۔ ”اور سننے کپڑے اتنی جلد تیار نہیں ہو سکتے۔ ہول میں کسی آدمی کو تمہارا خط، تمہارا اجازت نامہ دے کے بھیجا جائے تو۔۔۔“

”ہول والے انکار کر دیں گے۔“

”پھر تو ایک ہی صورت ہے۔“ وہ رک رک کے بولی، ”کچھ دیر کے لیے تمہیں برابر کے نرسوں والے کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔ وہ کمرہ اچھا، صاف ستھرا ہے۔ اسپتال میں کئی دھوئی ہیں، جتنی جلد ممکن ہو سکے گا، وہ کپڑے دھو دیں گے۔ بس یہی ہے کہ بارش نہ ہو اور کپڑے سوکنے میں وقت نہ لگے۔“

”جو تم مناسب سمجھو، کپڑے تو تبدیل ہونے چاہئیں۔ مجھے الجھن ہونے لگی ہے ان کپڑوں سے۔“

اس نے سر سے پیر تک ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ”اسے ملے تو نہیں ہوئے ہیں ابھی۔ پھر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں ابھی تھیر جاتی ہوں۔ ڈاکٹروں کے دورے کے بعد تم مریضوں والے کپڑے پہن لو، پھر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں یہ کپڑے گھر جا کے دھو دوں گی۔ رات بھر میں سوکھ ہی جائیں گے۔ استری کر کے صبح جلد سے جلد یہاں آ جاؤں گی۔“

”ارے نہیں۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تم کپڑے دھوؤ گی؟“

”جی نہیں۔“

”میں سمجیدہ ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

”اور مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”کیوں اچھا نہیں لگے گا؟“

”بس نہیں۔“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔

”اس میں کیا برائی ہے؟“ وہ ناراض سی نظر آنے لگی۔ ”تمہارا کام کر کے مجھے خوشی ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ لیکن۔۔۔“ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انکار کے لیے کیا عذر پیش کروں۔

”ٹھیک ہے، تم اچھا نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ پھر کوئی آدمی بیچ کے ہول کے کسی کمرے کو یہاں بلا لو، وہ تم سے مل کے تسلی کر لے گا تو آسانی ہو جائیگی۔ بہ ہر حال، اب تو رات ہو چکی ہے، صبح ہی کچھ ممکن ہے۔ کل دیکھیں گے پھر، مگر کل کوئی انتظام نہ ہو سکا تو تمہیں وہی کرنا ہے جو میں اب کہہ رہی ہوں۔“

پہلے برابر والے کمرے تک جا کے اس نے دروازے پر ہوکا دیا۔ اندر سے ایسی کی آواز آئی۔ چند ثانیوں بعد وہ باہر آ گئی۔ اس نے جھٹلاتے ہوئے سیورین کو بتایا کہ شائے پر اسپتال کی وردی کی سیوننگ لگی گئی تھی۔ کمرے میں دوسرا لباس موجود نہیں تھا۔ اسپتال کے لباس خانے سے منگوانے میں دیر لگتی۔ اسے خود ہی سینا بڑا ڈاکٹر برائے کی کہیں نظر پڑ جاتی تو قیامت آ جاتی۔ ایسی کو شب بخیر کہہ کے سیورین بوجھل قدموں سے میرے ساتھ چلتی رہی، پھر کچھ دور جا کے اس نے مجھے واپس ہو جانے کا اشارہ کیا اور دو چار قدم آگے جا کے لوٹ آئی۔

”تمہارے۔۔۔“ اسے کچھ بنا کے لاؤں؟“ وہ اشتیاق سے بولی، ”زیادہ تو نہیں، ایک دو چیزیں جیسی تمہی بنائی آتی ہیں مجھے بھی۔“

”جو تم بہتر سمجھو لے آنا۔“ میں نے اس کی دل بستگی کے لیے کہا۔ ”مجھے یقین ہے، تم نرس چنریس ہی بنائی ہوگی کیوں کہ تم خود بہت نصیحتیں بہت اچھی ہو۔“

اس کے رخسار کچھ اور گنار ہو گئے اور وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی راجداری سے دور ہو گئی۔

رات کے دورے پر ڈاکٹر رائے کے بجائے دو ڈاکٹر ہٹھل کے معائنے کے لیے آئے اور اطمینان کا اظہار کر کے جلد ہی چلے گئے۔ ایک کے کہنے پر ایک بار پھر مجھے کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معمول ہو چکا تھا۔ اس دوران لفظیابی نے ہٹھل کے لیے نرس کی ذمے داریاں نبھائی ہوں گی۔ میں کرسی ڈال کے دروازے کے باہر بیٹھا رہا۔

آسمان پر بادل بکھرے ہوئے تھے، بلکہ اور گاڑھے بادلوں کی ٹکڑیاں۔ ہوا نم تھی اور کسی قدر سردی سے آلودہ۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی میں انتظار کا اضطراب شدید ہو جاتا ہے اور میرے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

انتظار شاید سب سے بڑی مصروفیت اور بے بڑی اذیت ہے۔۔۔ اور میں کیا۔۔۔ ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی انتظار سے دوچار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے انتظار، کسی کے آنے، کسی کی بازیابی، کسی کے صحت مند ہو جانے کا انتظار، کل کا، برسوں، مہینوں اور برسوں کا انتظار۔۔۔ یہ کب وقت کی کئی انتظار زندگی کا بیش تر حصہ اسی انتظار کی نذر ہو جاتا ہے۔ زندگی مختصر ہوا کرتی تو انتظار کے مراحل بھی کم ہو جاتے۔

کچھ ایسی بے سرو باسی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں کہ ایسی نے مجھے اندر بلایا۔ وہ ہٹھل کو ہلکی پھلکی غذا میں اور کڑوی کیلی دو ٹکڑے کھلا اور پلا ہو چکی تھی۔ ایک کو باتیں کرتی خوب آتی تھیں۔ کہنے لگی، ”اک مریض بھٹک چکی ہوں، دوسرے سے

”جو تم بہتر سمجھو لے آنا۔“ میں نے اس کی دل بستگی کے لیے کہا۔ ”مجھے یقین ہے، تم نرس چنریس ہی بنائی ہوگی کیوں کہ تم خود بہت نصیحتیں بہت اچھی ہو۔“

اس کے رخسار کچھ اور گنار ہو گئے اور وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی راجداری سے دور ہو گئی۔

رات کے دورے پر ڈاکٹر رائے کے بجائے دو ڈاکٹر ہٹھل کے معائنے کے لیے آئے اور اطمینان کا اظہار کر کے جلد ہی چلے گئے۔ ایک کے کہنے پر ایک بار پھر مجھے کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معمول ہو چکا تھا۔ اس دوران لفظیابی نے ہٹھل کے لیے نرس کی ذمے داریاں نبھائی ہوں گی۔ میں کرسی ڈال کے دروازے کے باہر بیٹھا رہا۔

آسمان پر بادل بکھرے ہوئے تھے، بلکہ اور گاڑھے بادلوں کی ٹکڑیاں۔ ہوا نم تھی اور کسی قدر سردی سے آلودہ۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی میں انتظار کا اضطراب شدید ہو جاتا ہے اور میرے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

انتظار شاید سب سے بڑی مصروفیت اور بے بڑی اذیت ہے۔۔۔ اور میں کیا۔۔۔ ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی انتظار سے دوچار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے انتظار، کسی کے آنے، کسی کی بازیابی، کسی کے صحت مند ہو جانے کا انتظار، کل کا، برسوں، مہینوں اور برسوں کا انتظار۔۔۔ یہ کب وقت کی کئی انتظار زندگی کا بیش تر حصہ اسی انتظار کی نذر ہو جاتا ہے۔ زندگی مختصر ہوا کرتی تو انتظار کے مراحل بھی کم ہو جاتے۔

کچھ ایسی بے سرو باسی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں کہ ایسی نے مجھے اندر بلایا۔ وہ ہٹھل کو ہلکی پھلکی غذا میں اور کڑوی کیلی دو ٹکڑے کھلا اور پلا ہو چکی تھی۔ ایک کو باتیں کرتی خوب آتی تھیں۔ کہنے لگی، ”اک مریض بھٹک چکی ہوں، دوسرے سے

اب غمنا ہے اور یہ دوسرا بہت نٹ کھٹ ہے۔" ایسی سرابا شفقت، سرتاپا تپاک تھی۔ چہرے مہرے سے تند خو، اندر درس گھلا، ہوم بھرا ہوا تھا۔

کمرے کے دروازے، کھڑکیوں کی چٹھنیاں اس نے چڑھا دی تھیں۔ پردے بھی گرا دیے تھے، صرف چھت سے نئی روشن دانوں سے تازہ ہوا کی آمد ممکن رہی تھی۔ اسے خدشہ ہوگا کہ اس رات آنے والے حملہ آور دوبارہ کمرے میں نقب لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ اب کسی مشکوک آدمی کا اسپتال میں داخلہ ناممکن ہے۔ اسپتال پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ رات گئے تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی، شہر کے حالات اور طرح طرح کی افواہوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ مجھے سنانے کے لیے گزشتہ رات کی طرح وہ میرے سرہانے بیٹھنے کے میرے بالوں میں اپنی موی انگلیوں سے جیسے کھینچ پھیرتی رہی اور مجھے اکی کی یاد دلاتی رہی۔ مئی بھی سرسبلائے اور وہاں میں بڑی ماہر تھی، اور نیساں انیسواں تو کمال کرتی ہے۔

ایک مجھے ہمت اور حوصلے کی تعلیم دے رہی تھی اور خود باہر ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی تھی۔ میں نے اسے سو جانے کا تاثر دیا، کچھ اس خیال سے بھی کہ وہ کمر ٹیک لے۔ جانے کس وقت وہ دبے قدموں میرے پاس سے اٹھی کہ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا۔ شاید کسی وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح سویرے اسپتال میں خاصی چھل پھل ہو جاتی تھی۔ سبزے کی کثرت کی وجہ سے پرندوں کی بہتات تھی۔ منہ اندھیرے وہ صبح کی آمد کی نوید سناتے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو آٹھ بج رہے تھے۔ ایسی نے چائے منگوائی تھی۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ کھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ چائے ادھوری چھوڑ کے ایسی فوراً اٹھ گئی۔ باوردی سپاہی کی جھلک پر میں بھی بھٹا نہ رہ سکا اور اندر دروازے کے پاس جا کے نصیر گیا۔

"کا..... کا بات ہے؟" ایسی نے کڑکٹی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں مام۔" سپاہی نے کترائے لہجے میں میرے بارے میں تصدیق چاہتی کہ رات کو میں کمرے ہی میں رہا ہوں۔

"ادھری اور کاں۔" ایسی نے تروخ کے جواب دیا، "تم، تم کیوں پوچھتا ہے؟"

"بس مام، ہم گوانا ہی پتا کرنا تھا؟"

"پر کیوں؟ ایسا کا بات ہے؟"

سپاہی نے سرگوشی میں ایسی کو کچھ بتایا۔ ایسی کی سکاڑی نکل گئی۔ "نہیں نہیں، کا بولتا ہے تم؟"

سپاہی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں سے نیچے کمرے میں دیکھ کے اطمینان کر لیا تھا۔ ایسی بڑبڑاتی ہوئی میرے پاس آئی اور ہلکی آواز میں بتانے لگی کہ صبح جس وقت لوگ نماز کے لیے گھر سے نکلے، انہوں نے اس پانچویں میں، اس جگہ جہاں کل اکبر علی خاں کی لاش دیکھی تھی، تین لاشیں پڑی ہوئی دیکھی ہیں۔ سپاہی کو پولیس کے صدر دفتر کے حکم پر رات اسپتال میں میری موجودی کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میرا ہنسنے کے لیے سن ہو گیا۔

"یہ کیا ہوا میرے بچے؟" ایسی کی آواز سننا رہی تھی۔

میں کیا جواب دیتا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ سرا سگی سے بولی۔

"کیا کہا جاسکتا ہے۔" میں نے یہ مشکل کہا، "سپاہی اور کیا بتا رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں، بس یہی کچھ....."

ایسی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میرا حال بھی کچھ اسی جیسا تھا۔ ایسی سوال پر سوال کیے جا رہی تھی جیسے میں وہاں موجود رہا تھا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اسے جھڑک دیا اور دوسرے ہی لمحے مجھے

ندامت ہوئی۔ میں نے اپنے لہجے پر معذرت چاہی۔

"نانا، ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کیا معلوم۔" میں ہی پاگل ہو رہی ہوں۔ "وہ مہربان عورت فراخ دلی سے بولی۔" میں باہر جا کے سن کن لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، خبر ہی غلط ہو۔" ایسی بہت ہراساں نظر آتی تھی۔

جتنی دیر وہ باہر رہی، میں تانے بانے طانے کی ٹنگ دو کرتا رہا۔ ایسی چند منٹ بعد باپوں واپس آ گئی۔ وہ بار بار وہاں کیا دینے کے انداز میں ہاتھ پھیلاتی اور سینے پر صلیب کا نشان بناتی رہی۔ میں نے بھی کئی مرتبہ باہر نکل کے دیکھا۔ اسپتال کے عام ملازموں کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیا جس سے کچھ معلوم کیا جاسکتا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈاکٹر رائے کمرے میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق وہ بہت منتشر لگ رہا تھا۔ اپنے سامھی ڈاکٹر کو نکل کے بسڑ کی طرف جانے کا اشارہ کر کے وہ سیدھا میرے پاس آیا۔

"تم نے کچھ سنا؟" اس نے سنی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، کچھ سنا ہے ایسی کی زبان سے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں نے اپنے اعصاب پر قابو پایا تھا۔

"کیا..... کیا سنا ہے؟"

میں نے اسے صبح آٹھ بجے کے قریب آنے والے سپاہی کے بارے میں بتایا۔

"ٹھیک ہے، تم سے بات ہوئی ہے ابھی۔" یہ کہہ کے وہ نکل کے پاس چلا گیا۔ کشمکش کی اس حالت میں بھی اسے اپنے کام سے علاقتہ تھا۔ لوگ صبح کھتے ہیں، عہدہ و منصب، علم و فضل اور مال و زر اپنی جگہ، آدمی کی عزت و مرتبت تو اس کی انسان دوستی اور فرض شناس سے ملے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رائے کی ہدایت سے پہلے میں خود ہی باہر چلا گیا۔ مجھے جانا دیکھ کے اس نے بلند آواز میں مخاطب

کیا، "دور کہاں مت جانا۔"

میں دور کہاں جاتا، وہیں دروازے کے پاس دربان بنا بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا جو مجھے اس کے ٹکڑے سوا لوگوں کی جواب دہی کے لیے خود کو استوار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے نکل کے معائنے میں اپنا وقت لیا۔ وہ باہر آیا تو معاون ڈاکٹر ساتھ نہیں تھا۔ اس کی بے روی میں راہ داری سے گزر کر مرکز کی عمارت تک چلا آیا۔ تیز قدموں سے وہ ایک بڑے آراستہ و بیزارستہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر اس کے نام کی تختی آڑاں تھی۔ جب تک وہ کرسی پر بیٹھ نہیں گیا اور مجھے اس نے بیٹھ جانے کی اجازت نہیں دی، میں کھڑا رہا۔ جگ سے گلاس بھر پانی بھر کے اور ایک گھونٹ لے کے اس نے معتدل لہجے میں پوچھا، "تم کیا سمجھتے ہو؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟" میرے لیے شاید یہی مناسب تھا کہ اپنی رائے کے اظہار میں محتاط رہوں۔

"میں..... میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا ہوں، لیکن ایک بات سمجھ میں آئی ہے۔ ٹھیک اسی عام پر لاشیں پھنکوانے والے یہ باور گمراہ پاتے ہیں کہ انہوں نے اکبر علی خاں کے قاتل ختم کر دیے ہیں۔"

"جی، یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں تاکید کی۔

"تم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہو؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"لیکن کیا اکبر علی خاں کے قاتل وہی تھے؟"

"یہ دوسری بات ہے۔" وہ رکھائی سے بولا، "میں نے صرف یہ کہا کہ کوئی کچھ باور کراتا چاہتا ہے۔"

"یعنی اکبر علی خاں کے قاتل دوسرے تھے اور ان قاتلوں کو انجام تک پہنچانے والے دوسرے وہ جانتے تھے کہ قاتل کون لوگ ہیں۔ جس معاملے کی تفتیش میں پولیس بری طرح سرکھپا رہی ہے۔ باور

کرانے والے لوگ اس کی حقیقت سے آشنا تھے۔“
”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

میں نے تمام لحاظ و مروت سے کہا: ”دونوں کے درمیان کوئی تعلق ضرور تھا۔“
”یعنی دونوں ایک ہیں؟“ ڈاکٹر نے حیرانی ظاہر کی۔

”دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔“ میں نے کہا۔

ڈاکٹر کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ ”تمہارا قیاس درست معلوم ہوتا ہے۔“ وہ سر ہلا کے بولا۔

”اور آپ نے غور کیا، وہ کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے تذبذب سے دہرایا۔ ”وہ کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں، اکبر علی خاں کے گھر والوں کو کہ وہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں، شہر والوں کو کہ وہ شدید خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ دیکھو کی انجمن کو، جو کل سے داویلا کر رہی ہے، انہوں نے کل عدالت میں کام بھی بند کر دیا تھا۔ لاکھاج کے ان طلبہ کو، جو اپنے بہترین استاد سے محروم ہو گئے ہیں۔ کل دن بھر وہ مظاہرے کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ ہے جب تک قاتل پکڑے نہیں جائیں گے، وہ کلاسوں میں واپس نہیں آئیں گے۔ اور پولیس کو کہ وہ سخت بوکھلائی ہوئی ہے، جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے؟“

”اور کیا اب ان تین آدمیوں کے خون سے اکبر علی خاں کے دکھ کا ازالہ ہو جائے گا؟ شہری، دیکھ، طلبہ سکون کا سانس لیں گے اور پولیس کو کوئی سراغ مل جائے گا؟“

ڈاکٹر راتے کچھ سوچتا رہا، پھر مضطرب ہو کے بولا، ”لگتا ہے، تم کچھ جانتے ہو؟“

”ہاں شاید۔“ میں نے حائل سے اقرار کیا۔
”میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”آپ نے توجہ نہیں دی، حالاں کہ آپ ڈاکٹر کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی اتنے ہی شامل ہیں۔ دیدہ ریزی، نکتہ بینی میں طاق۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔“ میرا مقصد مطلق اس کی خوشامد نہیں تھا۔ یہ تو اظہار واقعہ تھا، لیکن میرے اعتراف میں سلسلے کا پہلو بہر حال نکلتا تھا۔

شکر ہے اس نے میری نیت پر شبہ نہیں کیا اور وہی ہوا۔ اس جہاں شناس، دور اندیش نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”غیروا“ وہ ہاتھ اٹھا کے بولا، ”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ صرف تمہیں باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی تا؟“

پھر مجھے ناگفتنی کی تشریح کی ضرورت نہ رہی۔ اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ میدا اور اس کے خاص مقرب ہی اتنا خوئی، اتنا منظم اور بڑا قدم اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے ان تین آدمیوں کو بھیجت چڑھا دیا جو اصل میں انہی کے اڈے سے وابستہ تھے اور دھوا سے زیادہ قرب رکھتے تھے۔

اس رات جب سلا حملہ آور میری جستجو میں اسپتال آئے تھے تو میں نے صبح اکبر علی خاں سے کہا تھا کہ وہ میدا کی حمایت یا فائدہ اڈی نہیں ہونے چاہئیں، وہ میدا سے برگشتہ دھوا کے ہم نفس، ہم جاں ہی ہو سکتے ہیں۔ انہیں بہت قلق ہو گا کہ اڈے پر آ جانے کے باوجود میدا نے اتنی آسانی سے مجھے جانے کیوں دیا۔ گو میدا نے اڈے کے استاد کی حیثیت سے دھوا کے زخمی ہو جانے کی اطلاع پر اپنی ذمہ داری اچھی طرح نبھائی تھی۔ اس نے میرے لیے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ وہ تو خود میں نے اس کے اڈے پہنچنے کے، دانستہ اس کے بے شمار آدمیوں کے ترغیب میں چاہے تو قلع کے خلاف اڈے کی چوکی کا دھوا کر دیا۔ پھر تو بات ہی دوسری ہو گئی تھی۔ میدا کو اپنی عمل داری سے دست بردار ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔

میدان کے پختہ کار ساتھی میں نے دیکھے تھے۔ میرا نقد پاک کر دینے کے لیے وہ سب آدی اسپتال بھیجے گا نامشغول مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ اگرچہ میدا کی عین خواہش یہی ہوگی میدا کا عندیہ لیے بغیر اسپتال آنے والے حملہ آور کام یاب ہو جاتے تو میدا انہیں پگلوں پر بٹھاتا لیکن وہ کام ہو گئے تھے اور ان کے ہاتھوں اسپتال کے ایک ملازم کا خون ہو جانے سے معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔ میدا کے اڈے پر میرے جانے کی ساری روداد پولیس کے علم میں ہوئی۔ پولیس کے خبر بھی اڈوں پر موجود ہوتے ہیں۔

پہلی بار شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں ڈاکوؤں کی طرح کچھ لوگ گھس آئے تھے۔ اسپتال ڈاکا ڈالنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک ڈرا سی عرق ریزی سے پولیس کو اسپتال میں موجود اس شخص تک پہنچ جانا چاہیے تھا جو میدا سے مبارزت کے لیے اس کے اڈے گیا تھا اور مبارزت ملتی ہوئی تھی۔ سو مراسم کی مروت اپنی جگہ پولیس نے سب سے پہلے میدا کے اڈے کی راہ لی ہوگی اور میدا نے صاف انکار کر دیا ہوگا۔ میدا کو گرفت میں لینے کے لیے پولیس کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور میدا ان سے دور ہی کتنا تھا، ارادے کی دوری پر۔ کسی وقت بھی اس کے سر پر آدھک سکتے تھے۔

امکان یہی ہے کہ پولیس کے تیز دیکھنے کے بعد میدا نے دھوا کے ماتم گساروں کو سرزنش کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے انہیں اڈے سے خارج کر دیا ہو یا کسی بڑے عتاب کی دھمکی دی ہو۔ پہلی ناکامی سے دھوا کے دل برداشتہ ساتھی ادھر میدا کی سرد مہری، اس کے غیظ و غضب، ادھر دھوا کی جدائی کے صدمے سے ایسے بے حال، ایسے اندھے ہوئے کہ انہوں نے سارا تھر اکبر علی خاں، ایک بے قصور پر اتار کے دھوا کے قرض کا بوجھ کسی طور کچھ کم کیا اور مجھے موت سے بڑی سزا سے دو چار کیا۔ وہ اپنے

متصد میں کسی حد تک ضرور کام یاب ہوئے۔ ڈاکٹر رائے وقفہ وقفہ سے ٹھونٹ بھر پانی پیتا رہا اور چپ رہا۔ کل صبح اکبر علی خاں کی خبر سننے کے بعد جب وہ مجھے کسی ساتھی ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا تھا، میں نے بدوجہ اس سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا۔ وہ سارا کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہوگا جو اسے مزید کسی صراحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ”مگر یہ خود میدا کے لیے کوئی بہت محفوظ اور مفید فیصلہ نہیں لگتا۔“ ڈاکٹر نے بھن بھنائی آواز میں کہا۔

”میداکو مختلف ذریعوں سے معلوم ہوتا رہا ہوگا کہ میں اپنا جا تو واپس لینے کے لیے اس کے اڈے پر آنے کا متمم ارادہ کیے ہوئے ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، اسی شام دو پولیس افسر یہاں اسپتال میں میرے پاس آئے تھے۔“

”ہاں، ہاں یاد ہے۔“ ڈاکٹر نے دکھائی لہجے میں کہا ”اور میرے انتظار پر تم نے کچھ بات بنادی تھی یا یوں کہو کہ شہلا دیا تھا۔“

”مجھے یہی کرنا چاہیے تھا، اس لیے کہ آپ اس وقت اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔“ میرا عذر اس نے تسلیم کیا کیوں کہ وہ ایک متوازن آدمی تھا۔ ”تم کیا کہہ رہے تھے!“ اس نے بے صبری سے مجھے ٹوکا۔

”اس شام آنے والے پولیس افسروں نے میری جرأت کی بڑی داد دی تھی۔ انہوں نے میدا کے لیے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور مغالطات سنائیں۔ کہہ رہے تھے کہ پہلی مرتبہ کوئی رستم سہراب میدا کے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے درپردہ مجھے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ اس تعاون کے بدل میں رشوت طلبی کا ایک اشارہ واضح تھا۔ وہ مایوس نہیں لوٹے میں نے انہیں.....“

”تم نے انہیں رشوت دی؟“ میری بات پوری ہونے سے پہلے اس کا لہجہ اکھڑ گیا۔

”میں نے کتنا اپنی آسودگی اور کشادہ دلی کا گداز دیا۔“

”تم نے انہیں کوئی نقدی وغیرہ تو نہیں دی؟“ ”نقدی دینے سے مراد ہونی کہ میدا کا اڈے پر جانے میں نے بے اساس دعوے کیے ہیں، لیکن پہلے اگر کوئی شبہ تھا تو اب کچھ یقین ہونے لگا ہے، وہ پولیس والے میدا ہی کے فرستادہ نہ ہوں۔ میدا نے انہیں میرے ارادے کی چٹکنی کے لیے بھیجا ہو۔ مبارزت ملتی کرنے کی تجویز میری نہیں تھی، میدا کے ایک عمر رسیدہ ساتھی کی تجویز تھی یہ..... اور میدا نے بظاہر یہ اکراہ اسے قبول کیا تھا۔ یہ حقیقت میدا کے دل پر نقش ہوگی کہ وہ میری تجویز نہیں تھی۔ جو شخص اسی وقت جا تو آزمائی کرنے اور ادھر یا ادھر فیصلہ ہو جانے پر تحمل کیا ہو، اس کا محرور میدا اور اس کے ساتھیوں کے حواس و اعصاب پر بری طرح طاری ہونا چاہیے۔ مبارزت ٹل جانے اور اڈے سے میرے جانے کے بعد میری حرکات اور عزائم کا بھی منسلک جائزہ لینے رہنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ میدا مجھ سے مبارزت کے لیے قلعاً آمادہ نہیں تھا کہ اسے اپنا نوشتہ صاف نظر آ رہا ہوگا۔

مبارزت کے التوا کی اس مدت میں اسے میرے لیے تپاک اور فراخ دلی کی ارزانی کرنی چاہیے تھی۔ کچھ اسی طرح مبارزت کے لیے میرے عزائم میں نرمی آ سکتی تھی، مگر دھوا کے جفا کار مذاہنوں نے سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ اب ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ آگے وہ یہی کہی و خشنوں اور شوروش کے مرتکب ہوں۔ ابھی پہلے سامنے کی نفیٹش شروع ہوئی تھی کہ ایک اور سانحہ ہو گیا۔ انھوں کی موت اتفاق ہی کہ وہ ناکام لوٹ جانے والوں کے آڑے آ گیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ اتنا گھبر معاملہ نہیں تھا لیکن اکبر علی خاں..... وہ کئی عیشیتوں سے ایک ممتاز آدمی تھے۔ ان کے خون کے بعد تو میدا کے اڈے سے پرانی رسم دراہ کی پاس داری اب پولیس کے بس

میں نہیں رہی تھی۔“

ڈاکٹر رائے نے خاموشی شعار کی۔ مجھے گمان ہوا، کہیں میرے قیاس اور اندازے ہدیان کی شکل تو اختیار نہیں کر رہے۔ مخاطب کی خاموشی بھی بہت ہلکان کر لی ہے۔ خصوصاً ایسے اہل وقت جب کوئی اپنی عرض گزار میں اس قدر مشاغل ہو۔ میں نے بے کلی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

اسے بھی احساس ہوا اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا، ”تم چپ کیوں ہو گئے؟“ ”مجھے گمان ہوا، آپ تمہیں اور ہیں۔“ میں نے صاف گوئی اختیار کی۔

”نہیں نہیں، میں توجہ سے سن رہا ہوں۔ تم کیسی منطقی باتیں کر رہے ہو، سب کچھ آئینہ کر دیا ہے تم نے۔“

مجھے اپنی بات جاری رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ میں نے تنجک کے کہا، ”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اڈے کی چوکی دراشت میں نہیں ملتی۔ استاد اپنی طاقت کے بل پر چوکی کے منصب کا سزاوار ہوتا ہے اور اس وقت تک اس منصب پر قائم رہتا ہے جب تک اس میں کس بل ہے اور وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہے۔ وہ مطلق العنان نہیں ہوتا، اڈے کی روایتوں پر عمل پیرا رہتا ہے۔ دھوا کے سرکش ساتھیوں نے میدا کو کہیں کا نہ چھوڑا تھا، بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا انہوں نے اڈے کے استاد کو۔ استاد کی ساکھ میرے ضرب پر رہی تھی۔ اس طرف پولیس نے اس کا تاظر بند کر رکھا ہوگا۔ دوسری طرف، اکبر علی خاں کی پاکت پر میرے اشتعال، غم اور غصے کا شدت سے احساس ہوگا اسے۔ اس نازک موقع پر اس کے یہی خواہ نامکین نے ایک ہی مشورہ دیا ہوگا کہ بعد کو کب بدتر صورت حال کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ پیش بندی کر لی جائے۔ سردست تو مجھے یہ یاد کرانا لازم ہے کہ اکبر علی خاں کے خون میں میدا کا کوئی اتھ نہیں ہے،

جن کا ہاتھ تھا، ان کی سرکونی کر دی گئی ہے۔ اس طرح میدا نے میری خوش نو دی کے علاوہ پولیس کو منتشر کرنے، معاملات پیچیدہ کرنے کی بھی کوشش کی اور دھوا کے ساتھیوں کی بے دردی و بے داد گری پر بھی بند باندھ دیا۔

ڈاکٹر تادیر تم بیٹھا رہا اور یکا یک اس کے جسم میں لہری لہری اٹھی۔ ”پھر اب..... اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے پھینکی آواز میں کہا۔

”ہمیں پولیس سے بات کرنی چاہیے۔“

”میری طرف سے پولیس نے بے شک اطمینان کر لیا ہے کہ میں مستقل اسپتال میں ہوں۔ پولیس کی نظریں ایک ہی سمت جانی ہوں گی، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں، میدا کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ پولیس اس کے ٹھکانے کا راستہ پکڑے گی اور اسے اس دھوا گزارد مرے سے نمٹنا ہوگا۔ میدا نے سارا کام نہایت سلیقے سے کیا ہوگا۔ ایسے کام خود نہیں کیے جاتے ڈاکٹر صاحب! ارد گرد اور دور دور کے دوستوں سے اعانت کی درخواست کی جانی ہے، مال و ذرا اٹھا کے، کچھ تادیہ لوگوں سے بھی۔ میدا نے گزشتہ رات، ممکن ہے مجھے کی کسی محفل میں گزاری ہو یا اپنے ہی اڈے پر تمام ساتھیوں کے ساتھ کوئی محفل برپا کی ہو۔ قمار بازی کی بزم آرائی کا ڈھونگ رچا ہوا۔ چشم دید گواہان پولیس کو یہ یقین دلانے کے لیے موجود ہوں گے کہ میدا اب تمام و کمال ان کے درمیان جان محفل تھا۔“

”تو ہم تماشا دیکھتے رہیں؟“ ڈاکٹر درشتی سے بولا۔

”ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”گویا ہم.....“ وہ سچ ساہو کے رہ گیا۔

”ابھی یہیں بات کہاں ختم ہوئی ہے۔“

”کیا..... اب کیا؟“ اس نے جھلا کے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، آج یا کل میدا یا اس کے قریب ترین معتد کو یہاں آنا چاہیے۔“

ڈاکٹر رائے ایک لمحے کے لیے بدحواس ہوا۔

”کیا کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں صرف امکان کی بات کر رہا ہوں۔“

”مگر میدا یہاں کیوں آئے گا؟“ ڈاکٹر نے میرا قیاس مبالغے پر معمول کیا۔ اس کے چہرے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

”پہلے ایک راستہ صاف کرنا چاہیے۔ بعد کو اور راستے اور منزلیں اتنی ٹھنک نہیں ہوں گی۔“

”تمہارے لیے کے یقین پر مجھے حیرت ہے۔ اگر تم جیسا کہہ رہے ہو تو میں..... میں اس منظر پر موجود رہنا چاہوں گا۔“

”آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا، گو میری خواہش بھی یہی ہے۔“

”نہیں، تم مجھے مطلع کر دو گے۔“ اس نے حتیٰ اور حکم لکھ میں کہا، ”میں جہاں کہیں بھی ہوں۔“

”آپ کو تیار رہنا ہوگا، کسی دقت کے لیے بھی آپ ہی نے یہ ساری صورت حال بدلی ہے۔“

”میں نے؟“ ڈاکٹر کی آواز پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

”ڈاکٹر صاحب! اکل پولیس کی آمد پر آپ دُش اندازی نہ کرتے اور پولیس مجھے ساتھ لے جاتی تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میدا کو پھر اتنی غلت پیش نہیں آتی۔ ان تین آدمیوں کو شاید کچھ دن اور زندگی مل جاتی۔ بہت کچھ اس پر منحصر تھا کہ پولیس کتنے دن مجھے روکے رکھتی ہے اور مجھ سے کس طرح کا سلوک کرتی ہے۔“

ڈاکٹر رائے نے گہری سانس بھری۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر منڈلاتی رہیں۔ چند لمحوں وہ بعد کرسی سے اٹھ گیا۔

سیورین آچکی تھی لیکن ابھی موجود تھی۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سب ٹھیک تو ہے میرے

بچے؟“ ایسی ہاتھ پھیلا کے میری جانب لپکی اور مجھے سینے سے لگا لیا۔

”سب ٹھیک ہی ہے۔“ میں نے اداسی سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے تمہیں ساتھ لے گئے تھے؟“

”انہی کی حاضری میں تھا۔“

”پولیس تو نہیں آئی تھی؟“ وہ پریشانی سے بولی، ”کوئی نئی خبر.....؟“

”ابھی تو دن پڑا ہے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔

”خداوند سب ٹھیک کرے۔“ ایسا جھٹکتے لیے میں بولی، ”سیورین آچکی تھی مگر مجھے تمہاری فکر تھی ہوئی تھی اس لیے رکی رہی..... اچھا چھوڑو، دیکھو ایہ سیورین تمہارے لیے کیسا خوب صورت ناشتا لے کے آئی ہے۔“

سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا۔ کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن انکار کا کل نہیں تھا۔ سیورین نے انگریزی طرز کا ناشتا بنایا تھا۔ شک میوے کے ریڑوں سے ڈھکا ہوا اٹھارے کا حلو، انڈوں کی آمیزش سے بنے ہوئے ٹھنکیں ٹوسٹ۔ چپاتی جیسے تیلے پر اٹھے۔ آلو، منڈ اور گاجر کی سبزی، ان کی اصل رنگت پکانے سے تبدیل نہیں ہوئی تھی اور تازہ کئی ہنریوں سے بھری تشری اور پھلوں کا رس۔

”یہ ناشتا ہے؟“ میں نے کہا، ”اور یہ سارا تم نے بنایا ہے؟“

”نہیں، آنٹی بھی ساتھ تھی۔“ سیورین کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی کہ میں اس کی تعریف کروں۔ ناشتا واقعی بہت لطیف اور خوش ذائقہ تھا۔ کچھ سیورین کی دل دہی عزیز تھی، کچھ ناشتے کی اپنی غوثی، انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ایسی نے اپنے ہاتھ سے چمچھڑکوا دی شفت سے میری جانب بڑھایا۔ میں نے اسی اشتیاق اور احترام سے

منہ میں رکھا جس کی اسے توقع تھی۔ یہ عورتیں کیسی دل نواز تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میری ان کی شناسائی کو دقت ہی کتنا ہوا تھا۔ لطف و عنایت کی اس فراوانی پر آدمی خود کو کیسا بے بس محسوس کرتا ہے کہ وہ نہ تو اس کا مستوجب ہے، نہ اسے بے زیر باری اتارنے کی استطاعت ہے، اور جو مسافر ہو، جسے اس جگہ ٹھہرنا ہی نہ ہو۔ میں ان کے لیے کیسا عارضی رفیق تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے چلے جانا ہے اور شاید لوٹ کے بھی آنا بھی نہ ہو۔

میری پیشانی چوم کے ایسی رخصت ہو گئی۔ سیورین کو تین آدمیوں کے قتل کی خبر مل چکی تھی۔ وہ مجھ سے ڈاکٹر رائے کے انداز میں باز پرس کرتی رہی اور میں اس کی ہیبت، اس کا غبار دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ڈاکٹر رائے کی اطلاع کے مطابق آج اکبر علی خاں کی تدفین ہو جانی تھی۔ حیدر آباد سے چلنے کا فاصلہ کم نہیں ہے۔ شام تک کہیں ان کا بڑا بھائی پہنچ جائے گا۔ کیا طرکی تھی کہ میں آخری مرتبہ اپنے محسن، اپنے محبی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں ان کے جنازے کو کندھا دینے کی توفیق نہیں رکھتا تھا۔ اکبر علی خاں کا خیال آتے ہی ان کا سارا گھر سامنے آ جاتا تھا اور جیسے میرا وجود زمین میں دھنسے لگتا تھا۔

دوپہر کے دورے پر ڈاکٹر رائے تین چار ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ ٹھہل کو دیکھنے آ گھیا تھا۔ اس وقت ٹھہل کی حالت خاصی بہتر نظر آرہی تھی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا اور اسے دونوں بعد بستر سے اٹھا کے کمرے کے فرش پر قدم رکھوانے چاہے۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ ٹھہل کا جسم ایک لمحے کے لیے ڈمکایا مگر پھر اس نے مضبوطی سے قدم زمین پر جمالے۔ دونوں جوان ڈاکٹر اسے کانڈھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ چند قدم چلانے کے بعد ڈاکٹر رائے نے پوچھا کہ اس کا سر بھاری تو نہیں ہو رہا یا اس کے سر میں دھمک تو

نہیں ہو رہی۔ ہٹھل کے انکار پر اس نے چٹکی بجا کے خوشی کا اظہار کیا۔ سونے تک ڈاکٹر، ہٹھل کو لے آئے اور واپس چلا کے انہوں نے دوبارہ اسے بستر پر بٹھا دیا۔ انہوں نے ہٹھل سے بہت کم بات کی اور لگتا تھا ہٹھل خود بھی زیادہ بات کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ کچھ مدد بوش سا لگ رہا تھا۔ میں تو ایک کوئے نے میں لنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا، ڈاکٹر رائے نے ہٹھل سے نمٹ کے میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھا تو میں اچھل پڑا۔ وہ مسکرانے لگا۔ میں نے بے اختیار اس کے ہاتھ تمام کے آنکھوں سے لگا لیے۔ میرے آنسوؤں سے اس کے ہاتھ بھیگ گئے۔ وہ مجھے چمکتا رہا، پھر اس نے مجھے پہلو میں سمیٹ لیا۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لفظ ہی کھو گئے تھے۔ مجھے جھوڑ کے وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہم راہ باہر نکل گیا۔

چار بج چکے تھے۔ میں پاؤں پھیلائے سونے پر نیم جان سا، بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ سیورین کہیں باہر تھی، ٹھہرائی ہوئی میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اسپتال کی مرکزی عمارت سے آنے والا ایک کارندہ چند مہمانوں کی اطلاع دینے آیا ہے اور میری اجازت کے لیے باہر کھڑا ہے۔

میں خود ہی اٹھ کے دروازے پر چلا گیا۔ اسپتال کی وردی میں وہ ایک پختہ عمر آدمی تھا۔ اسی لمحے خیال آیا، نکلتے سے کوئی نہ آ گیا ہو۔ جبرو، جامو، زور کا کام لینے پر اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور کہنے لگا: ”آئے والے مہمان لوگ میں سے ایک ہی جن نے اپنا نام بتایا ہے اور ان کا نام میدا صاحب ہے۔“

”میدا.....؟“ میرے منہ میں جیسے ریت بھر گئی۔

”اسی نام بولت ہیں صاحب۔ ساتھ میں دو اور لوگ بھی ہیں۔“ کارندے نے نمونہ باندھا۔

مجھے اس سے کچھ کہنے میں دیر لگی۔ میدا کے نام پر سیورین کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس نے میرا بازو زور سے دبوچ لیا تھا۔ کارندہ جواب کے انتظار میں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور تھکی ہوئی آواز میں اسے ہدایت کی کہ ڈاکٹر رائے جہاں کہیں بھی ہوں، انہیں یہاں آنے کے لیے کہا جائے اور میدا کو اس وقت تک مرکزی عمارت میں روکے رکھا جائے جب تک ڈاکٹر رائے میرے پاس نہ پہنچ جائیں۔ میں نے سیورین کو کمرے کے آگے کے سبزہ زار میں کرسیاں لگوانے کی تاکید کی۔

”وہ..... وہ کیوں آیا ہے؟“ کارندہ ابھی قریب ہی تھا کہ سیورین ہلبلائی آواز میں بولی۔

”اسے آنا تھا۔“ میں نے سر دلچے میں کہا۔

”اسے آنا تھا، مگر کیوں؟“

”یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اس کے پاس۔“

”کیا مطلب؟“

”سارے سوال اس وقت نہ کرو تو پتر ہے۔“

”تمہیں اس سے نہیں ملنا چاہیے۔“

”وہ طے بغیر نہیں جائے گا۔“

”مگر وہ..... وہ کیوں آیا ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے کچھ کہنے سنبھالو۔“

”دیکھتے ہیں۔“ اس کے سکون کے لیے میں نے بد ظاہر بے پروائی سے کہا، ”یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا، لیکن تمہیں..... تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم ایک حوصلہ مند لڑکی ہو تم پر اس قدر دہشت کیوں چھائی ہے؟“

”معلوم نہیں، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

میں نے اسے مصروف رکھنے کے لیے کسی آدمی کو بلا کے سبزہ زار پر کرسیاں لگوانے کا کام یاد دلادیا۔ وہ بولا تو ہوتی یہ ٹکلت راہ داری میں ایک طرف مڑ گئی۔ کمرے میں جا کے میں نے ایک نظر

ہٹھل کو دیکھا پھر اپنے آپ کو۔ ناشتے کے دوران سیورین نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا کہ کیا

میں دو تین گھنٹے کے لیے مریضوں کا لباس پہننے کے لئے کمرے میں بند ہو جانے کو تیار ہوں۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ کپڑے شستے ہو گئے تھے، لیکن ایسے میلے نہیں ہوئے تھے اور میدا کے سامنے تو کسی بھی لباس میں جایا جاسکتا تھا۔

دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر رائے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھری ہوئی تھی اور وہ تو جوانوں کی طرح سرگرم لگ رہا تھا۔ ”وہ آگے ہیں؟“ اس کی آواز تھمرا رہی تھی۔ ”تم ان سے ہر تعارف نہ کرانا۔“

”وہ آپ کو جانے نہیں ہوں گے کیا۔ شہر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔“

”ضروری نہیں۔ جاننا اور چیز ہے، پیچھتا

اور۔“

ادھر سیورین نے آ کے سبزہ زار میں کرسیاں لگ جانے کی اطلاع دی، ادھر اسپتال کا لازم میدا کے پہنچ جانے کی خبر دے آیا۔ ڈاکٹر اور میں نے ایک دوسرے کو فکر مندانہ نگاہوں سے دیکھا، دوسرے کچھ ہم باہر آ گئے۔

وہ تین تھے، ایک دہی عمر آدمی، جس کا نام شاید پرجو تھا، درمیان میں دوسرا میدا، اور تیسرا بھی عمر میں خاصا پختہ تھا۔ میں نے اسے اڈے کی چوکی پر میدا کے قریب دیکھا تھا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے، ہمیں آنا دیکھ کے کھڑے ہو گئے۔ بیٹوں کے چہروں پر تنجید کی غلبہ تھا۔ راہ داری سے چند قدم چل کے ایک فاصلے پر ہم ان کے سامنے رک گئے۔

انہوں نے سلام کے لیے سرسری انداز میں ہاتھ اٹھا کے جھوڑ دیے۔ ہم نے بیٹھ جانے کو نہیں کہا۔ انہوں نے ہماری اجازت ضروری نہیں سمجھی۔ ہمیں بیٹھنا دیکھ کے کرسیاں سنبھال لیں۔ چند لمحے سستانی خاموشی رہی۔ شاید ڈاکٹر رائے کی موجودی انہیں کلک رہی تھی۔ ان کی آسانی کے لیے میں نے ہی پھل کی۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے سپاٹ لہجہ

میں کہا۔

میدانے عمر رسیدہ پرجو پر نظر کی۔ پرجو کی آنکھیں زمین میں لڑی ہوئی تھیں۔ گہلائے ہوئے اس نے زبان کھولی، ”ہم کو تھمراے سے جلدی بات کرنی ہے۔“

”اب کیا بات کرنی ہے؟“ میں نے تھکی سے کہا۔

”ہم کو بتا ہے، ہمارے یوں کے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہم کو جادہ بات بھی بتا دیں کرنی۔“

میرے ہنسنے پھول گئے۔ ”یو لو لڑا۔“

”ہم تمہارا چا کو لو ہاؤے کو آتے ہیں۔“ میدا سٹشی ہوئی آواز میں بولا۔

یہ کہتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں غاکہ دوسرے لمحے وہ میری جانب اچھال دے گا۔ اپنے ذہنی غلبان میں اس کا ہاتھ اوچھا اٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بلند کیا، مجھے اس کی کوتاہی کا احساس ہوا۔ میں کرسی پر ہٹھا رہتا تو چاقو ڈاکٹر برائے کے دائیں جانب فرش پر گرنا اور کوئی ایسی عداوت کی بات نہ ہوتی۔ کرسی پر نیم ایستادہ ہو کے اور ہاتھ بڑھا کے چاقو اچکنے کا عمل مجھ سے غیر ارادی طور پر ریزہ ہوا۔ میرا چاقو اب بہ ہر حال میری گرفت میں تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اڈا اب تمہا ہے استاد! تھمراے ہی کو دیکھنا ہوگا۔“

”پر ایسا کیسے۔“

”تم ہی ادھر اڈے پر بولے تھے، اڈے کی ریت ہے، چوکی پر بیٹھا استاد آبی نیچے کو آجاوے تو.....“ پرجو تھی زبان سے بولا۔ ”استاد میدا کو اب تم سے نیچہ نہیں لڑانا۔“

”کیوں نہیں لڑانا۔“ میرا منہ بن گیا۔

”جو ہوا، اس کے بعد بائیں ناچیں۔“ تیسرے آدمی نے تپتی ہوئی آواز میں کہا، ”اوحرام چادے

بازی گرو (215)

”ہمارا چاکو تھرے پاس ہے۔ اسی سے ہماری گدن اتار دیو۔“ میدا بھڑک کے بولا، ”کوئی اور سنا تھرے من میں ہوتا ہو کو۔“

”ایسا کر سکتے تو ذرا دیر نہیں لگتی استاد! پر اس سے بھی تسلی نہیں ہوگی اپنی۔“ میری آواز گرجنے لگی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کے ہی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ کہنے کو بہت سی باتیں سینہ جلا رہی تھیں۔ اب وہ میرا چاقو داہیں کرنے آ گیا تھا اور اپنا چاقو طلب نہ کرنے کا مطلب واضح تھا کہ اب اس کے پاس نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ پہلی مرتبہ چاقو بدلنے کے چیلے سے مبارزت کل گئی تھی اور بعد کو درمیان کی کوئی راہ نکل آنے کی امید کی جاسکتی تھی، لیکن اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے نتیجے میں اڈے پر میری داہنی پٹینی ہو گئی تھی اور پھر یہی ایک تدبیر عقل و ہوش کے قریں تھی، چاقو سے میدا کی دست برداری۔

وہ اس حقیقت سے آشا ہو چکا تھا کہ اڈے پر میرے احوال کے بیان میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میرا بھائی واقعی اسپتال میں ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کے لیے خود کو داؤ پر لگانے آجائے، وہ اپنے بھائی اکبر علی خاں کا خون ہو جانے پر کیا کچھ کرگز دستا ہے۔ مجھے اس کے اڈے پر تو کل صبح ہی اکبر علی خاں کے سامنے کی خبر مل جانے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میرے نہ پہنچ پانے کی وجہ بھی اسے معلوم ہوگی۔ سو میرے پاس آنے کے لیے یہی وقت مناسب تھا کہ اسپتال میں بیمار بھائی کی زنجیر میرے پیروں میں پڑی تھی۔ تین آدمیوں کو ختم کر کے اس نے اپنی دانست میں زمی کا ایک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہی کچھ صبح میں نے ڈاکٹر رائے سے کہا تھا کہ آج یا کل کسی وقت میدا کو یہاں آنا چاہیے۔

میں خاموش رہا۔ میں نے میدا سے نہیں کہا کہ جب ان تین آدمیوں نے اسپتال میں گھس جانے کا

بہت اندھیار کیے۔ کتے کے پلے اسپتال کا جوان آدمی مار دیے، پھر وکیل صاحب کو۔ وکیل صاحب بے چارے کا کاوش تھا۔ ادھر ایسا بھی ناہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب یہاں نہ تھکتے ہیں۔ انہی سے پوچھ لیو، ایسا کبھی ہوا ادھر کا؟ کیوں ڈاکٹر صاحب، مانی باپ!“ اس نے ڈاکٹر رائے سے ہاتھ جوڑ کے پوچھا۔

ڈاکٹر رائے کا ہر مصرع ہو گیا۔
ڈاکٹر کی خاموشی اس نے تائید جانی، چلچلاتی آواز میں کہنے لگا، ”اداپنے اڈے کے ادرن تھے۔ ہمرے ہی سے بندھے تھے رنڈی کے جے، ہمرے پر جے داری آدیت ہے انھاں کی۔ میدا استاد نے اسی کارن اڈا چھوڑن کا بھیسلا کیا ہے۔ اب تھرے ہی کو اڈا دیکھنا ہے۔ میدا استاد اب اسی سہری سے چلا جاوے گا، پر ادھر تھوڑی پولیس سے منہ ماری کرن کے باد۔“

”ہم کو ماہی دیو استاد!“ برجونے ندامت زدہ لہجے میں قسم دیا، ”ہم کو داہلو لیں۔“
”میں جانتا ہوں۔ اکبر علی خاں کو تم نے نہیں ختم کیا ہے۔ ان تینوں ہی نے کیا ہوگا۔ ان کی یہی سزا ہوئی چاہیے تھی جو انہیں مل چکی ہے، لیکن یہ تو بہت کم ہے۔“

”کم ہے، جانت ہیں، بہت کتی ہے۔“ برجو ترخ کے بولا، ”اسی کارن میدا استاد تھرے پاس۔“

”اسی کارن میدا استاد اپنی سزا سنانے کے لیے ہمارے پاس آیا ہے ہاں! میں نے برجو کی بات کاٹ کے دھککاری آواز میں کہا، ”ٹھیک ہے، میدا کو اب اڈے پر نہیں رہنا چاہیے۔ اڈے کا جو استاد اپنے کتوں کے گلے میں پٹا ڈال کے نہیں رکھ سکتا، اڈے کے آخری آدمی تک جس کی نظر نہیں جاتی، اسے چوکی سے اتاری جانا چاہیے، لیکن میدا نے اپنی سزا آپ ہی کیسے طے کر لی۔ اس شہر سے راج پاٹ چلا جائے گا تو دوسرے شہر میں جا کے میدا انہی بجائے

حوصلہ کیا تھا اور انھونی مارا گیا تھا، میدا اگلے دن صبح ان پر پھندا ڈال دیتا تو نذاکیر علی خاں جانتے نہ وہ تینوں۔ میدا کو میرے جواب کی آگہی ہوگی اور میرے پاس اس کے سوا جواب بھی کیا تھا کہ اس کا چاقو واپس کر کے اسے اپنے دل و دماغ سے حرف غلط کی طرح مٹا دوں۔ ٹھٹھکی کی صحت یابی تک مجھے خود کو روک رکھنا تھا، چاہے درون خانہ کیسا ہی تلاطم برپا ہو اور کیسا ہی خون گھولتا ہو۔ میرے پاس اتنے ٹھوکرے مارنے، اس کا گریبان پکڑ کے لہو لہان کر دینے، اس کا خون پینے کی گنجائش کہاں تھی۔ اس سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ وہ دونوں، آنھونی اور اکبر علی خاں تو چاہتے تھے۔ انہیں واپس لانا میرے اختیار میں تھا نہ میدا کے۔ ادھر مکمل بستر پہ تھا۔ کہتے ہیں، گل اور برداشت سب سے بڑا انسانی وصف ہے۔ ہر گل جبری ہوتا ہے اور ہر برداشت ہوش مند ہی ہوتی ہے۔ مجھے اسی وظیفے پر تکیہ کرنا چاہیے تھا۔

میدا کو اپنا وزن کرنا آتا ہوگا۔ وہ اپنے بدن پر چڑھتی چربی سے خوب واقف ہوگا، لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے۔ اتنے بڑے اڈے پر اس جیسے زور کا کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ ہوتا تو میدا ہی کیوں راجا بنا بیٹھا ہوتا۔ میدا کے چوکی سے اتر جانے کے بعد اڈے کی ریت کے مطابق بھی کواڈے کی ذرے داری سنبھالنی چاہیے تھی، کیوں کہ میں ہی ایک دعوے دار بہت عرصے بعد سامنے آیا تھا۔ دوسرا کوئی دعوے دار نظر نہیں آتا تھا۔ ہو بھی جاتا ہے تو چاقو آزمائی میرے اس کے درمیان ہی ہو سکتی ہے اور اس کے لیے میرا اڈے پر موجود رہنا ضروری ہے۔ میدا نے دست بردار ہو کے اڈے کی رسم بھادی ہے۔ مجھے آج میدا کی آمد کی توقع تھی اور آمد کے مقصد کی بھی۔ تو اپنا رد عمل میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا چاہیے تھا۔ اپنا جواب تیار رکھنے کے لیے مجھے خاصا وقت مل گیا تھا۔

اس دوران ڈاکٹر رائے کی نظر میں مسلسل مجھے اپنے چہرے پر چھٹی محسوس ہوتی رہی تھیں۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے بے مہر کی سے کہا، ”مگر میں اس وقت اڈا نہیں سنبھال سکتا۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت اڈے پر تم سے یہی بات ہوئی تھی کہ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر جب مجھے سہولت ہوگی، میں اپنا چاقو لینے آ جاؤں گا۔“ ”ہاں استاد، یاد ہے ہمارے کو پورا۔“ معمر بر جو نے سینے پر ہاتھ رکھ کے جلدی سے اقرار کیا۔ ”پر..... پر.....“ میں نے اسے روک دیا۔ ”یاد ہے تو اچھا ہے۔ جس مجبوری سے اس شہر اور تمہارے اڈے پر آنا پڑا تھا، وہ ابھی تک ہے۔ بھائی اسپتال میں ہے۔“ ”تم مالو، یا نا مالو استاد۔“ تیسرا آدمی پھل کے بولا، ”ایک کارن یہ بھی تھا چاقو بدلی کا.....“ ”ہند۔“ میں نے اسے جھڑک دیا، ”اس بات کو جانے دو۔ کارن اچھی طرح تمہیں معلوم ہے، مجھے بھی..... اور اتنا بھی کہ تمہیں ہمارے بھائی سے کتنی دل نہیں ہو سکتی ہے۔“

تینوں بہ یک وقت کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن تینوں نے ایک ساتھ خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ ”اب سنو“ میں نے اونچی آواز میں کہا، ”اڈے کی ایک اور ریت بھی ہے۔ اڈے کا استاد کسی وجہ سے چوکی پر نہ بیٹھ سکے تو اپنی جگہ کوئی بھی آدمی چوکی کے لیے چن سکتا ہے۔ تم لوگ یہ ریت جانتے ہو یا اسے بھی جتانے کی ضرورت ہے؟“

”جانت ہیں استاد۔“ بر جو کے لہجے میں کساد آ گیا۔ ”تھوڑی بہت جان کاری ہے اپنے کو بھی..... تم بولو۔“

”مجھ کچھ مدت کے لیے میدا استاد یا بر جو دادا اڈا سنبھالیں یا کوئی اور جسے تم لوگ یہ تر تھکتے ہو۔ بھائی کی طبیعت ٹھیک ہونے پر مجھے اسے گھر لے جانا

ہے۔ اسے گھر چھوڑ کے بھی لوٹا ہو سکتا ہے اپنا۔“ وہ مہبوت سے ہو گئے اور بر جو کو جیسے پہلے ہوش آیا۔ عاجزی سے بولا، ”اب تم جانو استاد، اڈا اپنا ہیں تمہارے۔“ ”مجھے نہیں لگتا، میدا جیسا کوئی اور آدمی اڈا سنبھال سکتا ہے۔ میرے لوٹ آنے تک میدا کو چوکی پر بیٹھے رہنا ہے۔“

حالانکہ میری جانب سے اسی ایک جواب کی توقع نہیں بھی ہونی چاہیے تھی مگر شاید وہ کچھ اور قیاس کر رہے ہوں۔ ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا تھا۔

”اب ہماری تاہیں لگائے گا ہواں۔“ میدا نے شکست سے کہا۔

ادھر بر جو بھبھک کے بولا، ”اور میدا استاد اڈے کے سارے آدمین سے بدائی لے کے آیا ہے۔ او سب نئے استاد کے سوا گت کے واسطے اسپتال کے بہری کھڑے ہیں۔“

”ادھر اسپتال کے باہر؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اب جو بولنا ہے، ایک بار ادھری جا کے انھال کے سامنے بول دیو استاد، وہ سارے اسپتال کے بھیڑنا ہیں آسکتے تھے۔ ہم لوگن کو بھی بھیڑ آنے میں بہت جو ٹھم ہوا۔“

”مجھے ان کے پاس جانا ہے؟ نہیں نہیں۔“ ”اب وہ ترے اڈے کے آدمین ہیں۔“ ”لیکن میں ابھی اڈا نہیں سنبھال رہا ہوں۔“ ”اسی بات کو بڑا انھال کے سامنے بول دیو۔“

میرے جانے سے کہا، ”جروری ہے استاد!“ مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے متوحش نظروں سے ڈاکٹر رائے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ سارا کچھ بہت نیا اور انوکھا لگ رہا ہوگا اور وہ آگے کا حاشا دیکھنے کا بھی مشتاق ہوگا۔ میں نے مزید پیش نہیں مناسب نہیں سمجھا اور ڈاکٹر رائے کو اشارہ

کر کے کرسی سے اٹھ پڑا۔ خاص کمروں کے اس حصے سے صدر دروازے کا فاصلہ خاصا تھا۔ ڈاکٹر رائے سے میں نے رک جانے کی درخواست کی تھی۔ وہ نہیں مانتا تو میں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ بہ ہر حال، ایک نہایت منہز گواہ بھی ہم راہ تھا۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے رہے، ڈاکٹر رائے کو ہمارے ساتھ دیکھ کے راستے میں نئے والے ڈاکٹروں، نرسوں، اسپتال کے دیگر ملازموں اور سپاہیوں کے جسم تن جاتے تھے اور آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ ہم دونوں آگے، پیچھے وہ تینوں تھے۔ ہماری رفتار تیز تھی۔ سلاخوں والے اونچے.... صدر دروازے ہی سے بہت لوگ معظرب کھڑے دکھائی دیے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی وہاں موجود تھا۔

دربان نے صدر دروازہ کھول دیا۔ اڈے کے آدمیوں کے ہجوم میں شور مٹھا۔ اس لمحے بے اختیار میں نے ڈاکٹر رائے کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی ضرورت مجھے کیوں محسوس ہوئی۔ ہمارے تین اطراف اڈے کے آدمی کھڑے تھے۔ جانے کس کی ہدایت پر کوئی آدمی دربان کی کرسی لے آیا، پھر کوئی اور سپاہیوں کی بیٹھ۔ سپاہیوں کی کیا خیال تھی کہ اڈے کے آدمیوں کی پذیرائی میں تامل و تردد کریں۔ انہوں نے مجھے کرسی پر کھڑا کرنا چاہا، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر رائے کیے کھڑا رہے۔ میں نے اسے کرسی کی پیش کش کی۔ اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ وہ کتنے استغاب اور کشاکش کے عالم میں ہے۔ کسی قدر درد و کد..... کے بعد وہ کرسی پر کھڑے ہو جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میدا، بر جو، ان کا تیسرا ساتھی اور میں بیٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں سڑے سینے ہوئے تھے۔ ہمارے کھڑے ہوتے ہی شور مٹنے لگا۔ عمر رسیدہ بر جو کوٹو کٹنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اتنی عمر میں چہرہ شناسی آگے جانی چاہیے۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کے انہیں

خاموش رہنے کی تاکید کی۔
ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں نے بلند آواز
میں کہا، ”میں زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کرتی، اس
کا وقت بعد کو آئے گا۔ اس وقت جو تم سے کہنا ہے،
اسے دھیان سے سنو! میدا استاد نے اڈا چھوڑ دیا
ہے۔ اب ہمیں اڈے کی چوکی پر بیٹھنا ہے، لیکن
ابھی ہم اڈا نہیں سنہال سکتے۔ میدا استاد فیصلہ کر چکا
تھا۔ ہمارے کہنے پر مشکل سے ہماری جگہ چوکی پر
بیٹھنے کو تیار ہوا ہے۔ جب تک ہم واپس نہ آ جائیں،
میدا استاد ہی اڈے کا مالک رہے گا۔ سچ میں کوئی
ہماری طرح چوکی کا دعو کر کے والا آجائے تو اسے
میدا استاد سے نہیں، ہم سے بل کرنا ہوگا۔ ہمارے
ٹھکانے کا پتا میدا استاد کے پاس ہوگا، ہم جہاں
کہیں بھی ہوں گے، اس کے بلانے پر یہاں
آجائیں گے، پر جب تک ہم آ نہ جائیں، نئے
دعوے دار کو انتظار کرنا ہوگا۔“

مجھے چپ ہو جانے پر جوم میں بھن بھناہٹ
ہونے لگی اور مجھے خیال آیا احتیاطاً ایک بات ان
سے اور کہہ دیجیے چاہیے۔ میں نے کہا، ”کسی کو کچھ
پوچھنا ہے، یا کوئی انکا وہ کسی کے دماغ میں، تو ہم
ابھی سامنے کھڑے ہیں۔“
کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔

”ہاں ایک بات اور۔“ جیسے ہی میری آواز
بلند ہوئی، دوبارہ سناٹا چھا گیا۔ ”کوئی اور دعوے
دار ہوتا ابھی ہم شہر میں گھیرے ہوئے ہیں، وہ
سامنے آجائے، یہاں ابھی، اس وقت بھی۔ اب
نہیں تو دو چار دن بعد، ہفتے بھر میں۔ ہمارے جانے
کے بعد پھر، جیسا ہم نے بول دیا ہے، اسے ہمارے
لوٹ کے آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔“

اپنی بات ختم کر کے میں نے سوالیہ نظروں سے
بر جو کو دیکھا۔ وہ تینوں ہی جیسے بت بنے ہوئے
تھے۔ میں بیٹھ سے اتر آیا۔ ڈاکٹر رائے نے بھی فوراً
میری تقلید کی۔ صدر دروازے پر واپس آ کے میں

نے مڑ کے ایک نظر پیچھے کی طرف دیکھا۔ میدا، بر جو
اور وہی تیسرا آدمی لپکتے ہوئے ہماری طرف بڑھ
رہے تھے۔ میں اور ڈاکٹر رک گئے۔ ان تینوں کے
ہاتھ جڑے ہوئے تھے، آنکھیں جھلملا رہی تھیں،
جیسے بس اندامی چاہتی ہوں۔

جب میں ہاتھ ڈال کے میں نے میدا کا چاقو
نکال کے اس کے آگے کر دیا۔ ”اب تمہیں اس کی
ضرورت پڑے گی۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ اس
کے چہرے کی کھال پھڑکنے لگی تھی۔ میرے ہاتھ
سے چاقو لے کے اس نے آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر
ہم وہاں نہیں ٹھہرے، صدر دروازہ عبور کر کے
اسپتال میں داخل ہو گئے۔

مرکزی عمارت اور اپنے کمرے تک آنے کے
دوران ڈاکٹر رائے نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔
مجھے اس سے اجازت لے لینی چاہی تھی، لیکن میں
اس کے ساتھ چلا رہا تھا۔ کمرے میں آ کے وہ تھکے
ہوئے انداز میں میز کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی
پر نیم دراز ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا
تھا جیسے بہت دور کے سفر سے آ رہا ہو۔ چند لمبے بعد
اس نے پتلیں جھپکا کیں اور مجھے سامنے کھڑے
ہوئے دیکھا تو گزریا کے بولا۔ ”تم..... تم کھڑے
کیوں ہو؟“

”میں اب چلتا ہوں۔“ میں نے خفیدہ آواز
میں کہا، ”مجھے اجازت دیجیے۔“
”کیوں، کیوں جانا چاہتے ہو؟“ اس نے
کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یوں ہی..... کچھ دیر آپ آرام کر لیں۔“
وہ پھر کہیں گم ہو گیا اور مجھے بھر بعد چوٹیک کے
بولے، ”مجھے واقعی آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔
ٹھیک ہے، جاؤ تم۔ کچھ دیر میں شام کے معائنے پر
میں اس طرف آتا ہوں۔“

سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کے میں دروازے کی
طرف بڑھ گیا تھا کہ اس کی بھاری آواز نے میرا

تغائب کیا۔ رات کو تم گھر آ سکتے ہو؟“
میں نے پلٹ کے حیرانی سے اسے دیکھا۔
”رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔“ اس نے
سرسری سے انداز میں کہا۔

میں سوچتا رہا، مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اس نے
کرسی کے سرھانے سے سرنگا کے پتھر آنکھیں موند لی
تھیں۔ میں دے قدموں کا ہرا گیا۔

راستے بھر گزرتے ہوئے لوگوں اور جگہ جگہ
تغیبات سیاہیوں کی نگاہیں مجھ پر پھٹکی رہیں۔ بری
خبر ہوا رفتار ہوتی ہے۔ شاید کبھی معلوم ہو گیا تھا کہ شہر
کالے کے سب سے بڑے استاد، میدا استاد اور اس
کے قریب ترین ساتھی مجھ سے ملنے کے لیے اسپتال

آئے ہوئے تھے اور یہ حیرت انگیز واقعہ بھی ان کے
لیے ناقابل فہم ہوگا کہ ڈاکٹر رائے بھی میرے ساتھ
تھا۔ کچھ دیر میں جزئیات سے بھی انہیں آگاہی
ہو جاتی تھی۔ پھر ہر کوئی اپنے اپنے طور، اپنی اپنی
زبان میں انہیں بیان کرے گا۔ میں دایم بائیں
ان کی موجودگی سے بے نیاز سان کے سامنے سے
گزرتا رہا۔ اتنی نگاہوں کی زد پر آدمی کیسا چور سا بن
جاتا ہے۔ بہ حال، کسی طرح میں اپنے کمرے تک
پہنچ گیا۔ سیورین مجھے باہر ہی مل گئی۔ اسے عجیب
نہیں ہوگا۔ بار بار کمرے سے راہ داری میں آتی
ہوئی۔ اس نے دور سے مجھے آتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے
اندازہ تھا کہ ابھی اس کے سوالوں کی جواب دہی کا
ایک مرحلہ باقی ہے۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پھٹے ہوئے دیدوں سے
پوچھا۔

”جملے گئے وہ۔“ میں نے اس کے اطمینان
کے لیے مسکرا کے کہا اور اس کا بازو تھام کے سونے
پہلے آیا۔ ”تم اتنا کیوں گھبرا رہی تھیں؟“

”بات ہی ایسی تھی۔“ وہ ہراساں آواز میں
بولا۔

”تم نے غور نہیں کیا۔ اسپتال میں وہ کسی

خطرناک ارادے سے کیسے آ سکتے تھے۔ دوبارہ
اجازت لے کے یہاں تک پہنچا پائے تھے۔“
”لیکن ان کا کیا بھروسہ؟“
”وہ بھی آدمی ہی ہوتے ہیں، اور آدمی زیادہ تر

آدمی ہی رہتا ہے۔“
”لیکن یہ ہوا کیا؟“

”ہوتا کیا۔“ میں نے اسے مختصر آسراہی روداد
سنانے کی کوشش کی۔ ”اب سب ٹھیک ہو گیا۔“ میں
نے رسائی سے کہا۔

”کیا ٹھیک ہو گیا؟“ اس کا منظر اور کم زور ہوا۔

”میں نے تمہیں بتایا نا، میرا چاقو اب میرے
پاس ہے، میدا کا چاقو اس کے پاس۔ میدا استاد اپنی
پرانی جگہ چاہتے تھے۔ انھوں کو جانا تھا، چلا گیا۔ کہتے
ہیں، وقت کو کوئی نال سکتا ہے۔ اکبر علی خاں صاحب
کا بھی وقت آ گیا تھا۔ ان کے قاتل بھی ملے گئے۔
پولیس ایک دوسرے کے قاتل تلاش کر رہی ہے۔
کوئی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ کیا کر سکتی ہے،
چپ ہو کے بیٹھ جائے گی اور کسی معاملے
میں مصروف ہو جائے گی۔ شیریں کو انھوں نے بغیر
رہنا ہوگا۔ اکبر علی خاں صاحب کے گھر والوں کو ان
کے بغیر زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنی ہوئی اور
عادت پڑی جائے گی۔ آدمی کو سب سے بڑا اپنی
زندگی ہوتی ہے۔“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ وہ آزرگی سے
اور روہاںسی ہوئی۔

”کیا غلط ہے اس میں؟“ میں نے بھی ہونئی
آواز میں کہا۔ وہ سر جھکا کے چپ ہو گئی اور ناخن
کریدنے لگی۔ میں بھی خاموش بیٹھا اپنے کو تنکے
چھوٹا رہا۔ خود آزادی سے کبھی تسلی بھی ہوتی ہے۔
رفتہ رفتہ مجھے احساس ہو رہا تھا، دل بونی کے بجائے
میں نے اس سے کسی شکست یا غم شردہ کر دی
تھیں۔ وہ تو چھوٹی موتی کی مانند ہے۔ میری سنگ
بیانی سے کسی کھلا گئی ہے۔ خبیثہ ایسی گرانی کی

تاب نہیں رکھتا۔ اصل میں شاید میں یہ سب کچھ خود سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس پر بار کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے چپکے سے اسے ٹوکا، ”اب کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کی آواز جیسے پاتال سے ابھری۔

”مجھے افسوس ہے۔“ میرا لہجہ بھی معذرتی تھا۔ اس کے گلہ کی ہونٹوں میں ارتعاش ہوا۔ ”ویسے تم تھوڑی سی پاگل بھی ہو۔“ میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

اس کی لب ریز آنکھیں مجھ پر منڈ لائیں اور اس کے ابرؤں پر رشخار چمک اٹھے۔ ”ہاں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”اور تم نے کیا ہے مجھے پاگل۔“

”میں نے؟“

”معلوم نہیں، تم کیسے آدمی ہو۔“

”بہت برا ہوں نا۔“

”ہاں آں، بہت برے۔“ وہ ہنس پڑی ”یہی تو تمہاری خوبی ہے۔“

میری تدبیر کارگر ہوئی، آخر کہیں اس پر چھائے پاس درماں کا غبار چھنا۔ ”چائے نہیں پلاؤ گی۔“

میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں فرمائش کی۔

وہ زریں کی طرح بے تاب ہوئی، نیسماں کی طرح اس کے بدن میں بجلی بھرنی، جھٹ باہر نکل گئی۔

میں نے اس کی نظر ڈال کے میں بھی باہر آ گیا۔

سیورین وہاں نہیں تھی۔ خدمت گار کو طلب کرنے کے بجائے وہ خود احکام صادر کرنے باور پچی خانے چلی گئی ہوگی۔ سبزہ زار میں، اسپتال کے آداب کی وجہ سے وہ میرے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو سکتی تھی، اس خیال سے میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑا سا تشت اٹھائے ایک مؤدب خدمت گار بھی تھا۔ چائے تنہا نہیں تھی۔ جانے کیا کیا لوازم ساتھ

تھے۔ چائے کا تو بہانہ تھا، میں تو سیورین کو تھکرہ تازہ دم دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ حسین جہروں پر خزان دلال زربا نہیں ہوتا۔ پھول کھلے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں، ڈھکے ہوئے ہوں، تیز دھوپ کی زد پر اور تیز ہواؤں کے نرسے میں ہوں تو جی مہرا نے لگتا ہے۔ چائے کے دوران وہ خاصی چاق چوبند تھی۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ یہ وقت مناسب ہے۔ وہ کوئی کارندہ ہوئی، بھیجے کا بندوبست کر دے۔ میں پرچی لکھے دیتا ہوں تاکہ ہوٹل کا کوئی ذمہ دار شخص یہاں آ کے تصدیق کرے کہ میں ہی اپنا سامان ہوٹل سے منگوا چاہتا ہوں۔

وہ دنیا جہاں سے باخبر تھی، کہنے لگی کہ سنا ہے شہر میں سنا ہے، بہت کم لوگ آج گھروں سے نکلے ہیں۔ بیش تر دکان میں اور بازار بند ہیں۔

میں نے کہا، ”شہر تو بند نہیں اور ہوٹل تو کھلا ہوگا۔ کیوں نہ ایک کوشش کر لی جائے۔ اب تو میں خود بھی جاسکتا تھا، لیکن ڈاکٹر رائے سے بات کرنا بھول گیا۔“

”کیا؟“ وہ برکتی سے بولی۔ ”تم جاؤ گے شہر میں۔ ڈاکٹر رائے کیا، میں بھی سمجھیں جانے نہیں دوں گی۔“

”اپنے حکیمانہ لہجے کا اسے فوراً احساس ہوا اور وہ ٹھٹک سی گئی۔“ تمہیں معلوم ہے، تم کیسے عجوبے ہو شہر میں۔“

”میں اسی لیے تو نہیں گیا۔“ میں نے ملاحت سے کہا۔ ”معلوم تھا، ان حالات میں کوئی بھی جانے نہیں دے گا۔ ان پکڑوں میں ایک دن اور گزارا جاسکتا تھا، لیکن آج رات ڈاکٹر رائے کے گھر جانا ہے۔“

”کیا؟“ اس کا سراپا بیل کھا گیا۔ وہ بدحواس کی ہو کے بولی۔ ”ڈاکٹر رائے نے تمہیں بلایا ہے؟“

”ہاں، انہوں نے حکم دیا ہے، رات کا کھانا میں انہی کے ساتھ کھاؤں۔“ میں نے کہا۔

”کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔“

”کیوں نہیں آتا، اور تم اتنی حیران پریشان کیوں ہو رہی ہو، کوئی نئی بات ہے کیا؟ ڈاکٹر صاحب ایک مہربان اور مشتاق بزرگ ہیں۔“

”بے شک، وہ ہر اعتبار سے ایک بڑے اور منفرد آدمی ہیں، وہ اپنے اسپتال کے مریضوں میں بہت شامل رہتے ہیں لیکن صرف یہیں تک۔ مجھے یاد نہیں، آج تک انہوں نے۔۔۔۔۔“

”مگر میں ان کا مریض نہیں، مریض کا گمراہ ہوں۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوا۔ گھر جا کے تو وہ بالکل گھر کے ہو جاتے ہیں، مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بہت لوگوں سے انکا ملنا جلتا ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کام سے غرض ہے۔ کام ان کے لیے عبارت ہے۔“

”پچ پچھو تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی، لیکن جیسا تم کہتی ہو اور جیسی لوگ ان کے بارے میں رائے رکھتے ہیں، شاید ایسا کچھ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب زندگی میں بھی بہت شامل ہیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے افسانے یوں ہی ان کے بارے میں زائس رکھے ہیں۔“

”یہ بر حال، یہ بڑی ان ہونی سی بات ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، انکار بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔“

”یہ تو ایک اعزاز ہے۔“ جانے کیوں سیورین کچھ متروکہ کسی فکر میں ڈوبتی نظر آنے لگی۔

اسی اثنا میں دروازے پر آئیں ابھریں۔ ڈاکٹر رائے حسب معمول شام کے معائنے کے لیے آگیا تھا۔ مٹھل کو آنکھیں کھولنے پر کچھ دیر نہیں لگی۔

انہوں نے اسے بٹھا دیا۔ ڈاکٹر رائے اور اس کا شریک کار ڈاکٹر آہستہ آہستہ اس سے باتیں بھی کرتے رہے۔ بیش تر مٹھل، ہوں ہاں، میں جواب دیتا رہا۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر شام کو بھی اسے چھل دیتی کرائیں گے لیکن روزانہ کا طبی احوال نامہ پڑھ کے انہوں نے فشارخون کا معائنہ کیا اور مٹھل کو بستر

پر لٹا دیا۔

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

سے نہیں اٹھایا۔ میری تشریش پر ڈاکٹر رائے نے بے پروائی ظاہر کی۔ ”وہ زندگی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔“ میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے باہر چلے جانے کا حکم جاری کر دیا۔ میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ شاید مٹھل کو چند دم چلانے کا فیصلہ ملے اور وقت تھا جو انہوں نے شام کو نہیں دہرایا۔ ڈاکٹر کے واپس آنے میں دیر ہوگئی تو مجھے اور پریشانی ہوئی۔ میں نے دروازے سے بجائے کے دیکھنا چاہا، مگر دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

سورج کب کا افاق بار چا چکا تھا۔ شام تیزی سے اندھیرے میں اتر رہی تھی۔ اسپتال کی روشنیاں جل چکی تھیں جب کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رائے اپنے ساگی ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکلا۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کی جانب جھٹے جھٹے ہنسنے لگا ہوا تھا، وہ مٹھل کے بارے میں زندگی کوئی بات نہ کہہ دے، لیکن میرا شانہ بڑکے اس نے اپنی بات کی۔ ”سازے آٹھ بجے تیار رہنا ہے۔ ملازم گھر لے جانے کے لیے آجائے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ چل پڑا اور میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔

کمرے میں جا کے جب تک میں نے کرید کرید کے سیورین سے تصدیق نہیں کر لی، مجھے سکون نہیں آیا۔ اس نے بتایا شخص احتیاط کی وجہ سے کہ مٹھل پر کوئی دباؤ نہ پڑے، انہوں نے اسے فرش پر چلانے کی زحمت نہیں دی۔

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

ابھی آج بھی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آگیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک ابھی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ابھی مٹھل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ابھی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یکا گنت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

باسکٹ بال وغیرہ کے قطعات۔ سڑک کے کنارے ایسا دھڑلہ مچا رہے تھے روشن تھے اور پروانے ان پر باقار کیے ہوئے تھے۔ کچھ دور سڑک پر چند گھرے اور کالے بچوں کی ٹولی سائیکلیں دوڑا رہی تھی۔ بچوں کی ہادہو میں مینڈکوں کی فریاد اور جھنجھکیوں کی جھنگار بھی شامل تھی۔ ہر کوئی گڑبگڑاؤ ٹی لکڑی کی باز کی چادر دیواری میں قائم تھی اور عمارت کے چار اطراف وسیع رتبے پر اونچے نیچے سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔

بہیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ تیسری کوٹھی میں لکڑی کے چوڑے دروازے پر دربان موجود تھا۔ یہ پرانی طرز کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔ نہ اتنی بڑی، نہ ایسی چھوٹی۔ جدید کم، قدیم زیادہ، صاف ستھری، رنگ روشن بھی نیا نیا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی رات کی رانی سے واسطہ پڑا۔ رات کی رانی کی بھی کیا مہک ہوتی ہے۔ ادھر زریں نے حویلی میں رات کی رانی کے پورے بے تحاشا لگائے ہیں۔ ساری حویلی معطر رہتی ہے۔ کچھ یہی احوال ڈاکٹر کی کوٹھی کا بھی تھا۔ خوش بوآدمیوں کی طرح ہوتی ہے۔ نرم و نازک، اجڑا اور وحشی، لہجہ، شوخ، شرارتی، خجیدہ، رنجیدہ۔ رات کی رانی کی مہک میں جتنی نفاست اور شائستگی ہے، اتنی ہی شوخی اور چپکاری بھی۔

ڈاکٹر رائے سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا۔ میرے سلام کا اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ ”فاصلہ زیادہ تو نہیں ہے۔“ وہ ٹپکی آواز میں بولا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے مستعدی سے کہا۔ ”کیا مجھے دیر ہوگئی؟“

”آدمی کے پاس سب سے کم کیا چیز ہوتی ہے؟“

دماغ کچھ حاضر تھا۔ ایک لفظ میں اس کا تہا رسا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”جی ہاں! وافر بھی ہوتا ہے۔“

قریب ہو جاتی ہیں، دو مرد اسنے قریب نہیں ہو پاتے۔ دو عورتوں کی ایسی یک جانی دیکھ کے مردوں کو اپنی الگ جنس کا احساس کچھ سوا ہونے لگتا ہے، مفاہرت کا سا کوئی احساس۔ گدشتہ شام کی طرح کترائی ہوئی آواز میں پیورین مجھ سے پوچھنے لگی کہ کل رات وہ میرے لیے کچھ لائے۔ میں منع کرنا چاہتا تھا، لیکن وہی صورت درپیش تھی۔ بہت کچھ دعوت کار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کون ہے، کتنا دلکش اور نازک، کتنا عزیز و محترم ہے اور اس کی نیت اس کی طلب میں شوق کیسا فراوان ہے۔ کل کی طرح مجھ سے انکار نہ کیا جاسکا۔ میرے اقرار پر اس کی آنکھوں کی تابانی فردں ہو گئی اور وہ سبک خرا می سے چلی گئی۔ رفتار بھی آدمی کی قلبی کیفیت کا مظہر ہوتی ہے۔

گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رائے کے ملازم کو پابندی وقت کی غیر معمولی تربیت دی گئی تھی۔ ضرور وہ کمرے کے باہر گھڑا رہا ہوگا کہ ٹھیک وقت پر دستک دے۔ آدمی کو اتنا گھڑی نہیں ہونا چاہیے، آدمی تو پھر آدمی نہ رہا۔

ہول میں کسی کو بھیجے اور سامان منگوانے کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ ان کے میں نے انہی بوسیدہ کپڑوں کی شکلیں درست کیں۔ نہاد جو پہلے ہی لیا تھا۔ نہانے کے بعد باسی کپڑے پہنے رہنا بھی ایک ستم ہے۔ پیشانی پر ایچی کے بوتے کی نذر لے کے میں باہر آ گیا۔

ڈاکٹر کا گھر دور نہیں تھا۔ پیدل کے فاصلے پر، اسپتال کی چار دیواری سے ملحق، ہم گویا کسی جنگل میں داخل ہوئے، ترشا ہوا جنگل۔ ہر طرف سبزے کی خوش بو تھلی ہوئی، کچی کچی سی خوش بو۔ ایک طرف کوٹھیوں کی قطار، چھ میں سینٹ کی پختہ سڑک، سڑک کے اس طرف درخت ہی درخت، باغ ہی باغ، چمن زار، فاصلے فاصلے پر والی بال، ٹینس اور

”آؤ“ میری کمر پر ہاتھ رکھے وہ بید کی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے تذبذب سے پوچھا، ”یہاں بیٹھو گے، یا اندر چلیں؟“ یہاں کچھ ٹکلی ہے۔“

”جیسا آپ چترتھیں۔“ میں نے مودبانہ کہا۔

”میلے کھا نا کھاؤ گے یا.....؟“

”آپ کا وقت ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔“

”میرا خیال ہے، کچھ دیر بعد لگوائیں،“ اس نے ہنسی بھرتے ہوئے فیصلہ کیا اور کرسی سے اٹھ گیا، پھر ایک دو قدم بعد رک کے بولا، ”تم یہاں بیٹھنا تو نہیں چاہتے؟“

”یہ بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔“ میں نے کہا، ”لیکن یہاں واقعی ٹکلی ہے۔“

مجھے ساتھ لیے ہوئے وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے کا وسیع حصہ کسی بڑے بال کے مانند تھا، سادگی و پرکاری کی مثال، کوٹنے کوٹنے میں لہراتے، بل کھاتے ایک دوسرے میں پیوست اور کم، عورت اور مرد کے عریاں، نیم عریاں قد آدم جسم، دیواروں پر بڑی بڑی روغنی تصویریں، ساز و سامان کم اور منتخب تھا۔ ہال میں غنودہ سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر رائے بائیں طرف کے روشن کمرے میں آگیا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ جالی پوش کھڑکیاں کھلی ہوئے کی وجہ سے یہاں بھی باہر جیسا موسم تھا۔ اس کمرے کے ساز و سامان میں بھی بڑی سادگی تھی، آرائش چھوٹی ہوئی نہیں تھی اور کینوں کی دولت و شہرت سے زیادہ ان کی نقاست طبع کی غنائ تھی۔ ہم دیواری کوٹنے میں جڑے ہوئے سوفوں پر کچھ اس طرح بیٹھ گئے کہ ایک دوسرے کے سامنے تھیں تھے، ترچھے تھیں۔

”ابھی کوئی دس منٹ پہلے ایک پولیس افسر یہاں سے گیا ہے۔ اصل میں میں نے ہی اسے بلایا

تھا۔ اس دوران میں نے پولیس سے تھوڑا بہت رابطہ رکھا ہوا تھا۔“ ڈاکٹر رائے نے کسی تشہید کے بغیر کہا، ”پولیس افسر بتا رہا تھا، کچھ دیر پہلے، غروب آفتاب کی نماز کے بعد اکبر علی خاں کی تدفین ہوئی ہے۔ ان کا بڑا بھائی شام کو حیدر آباد دکن سے آگیا تھا۔ سنا ہے، جنازے میں بہت بڑا جھوم تھا۔ شہر کے پیش تر مسلمان عدالت میں اکبر علی خاں کے ساتھی اور لاہور کالج کے طلبہ کثرت سے شریک تھے۔ آئی جی سے میں نے درخواست کی تھی کہ جنازے میں تمہاری عدم شرکت محسوس کی جائے گی اور خواہ مخواہ کے دھم و گماں کو ہوا دے گی۔ بہتر ہوگا، اکبر علی خاں کے بھائی اور گھر والوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ کہیں بدوجہ شرکت سے روکا گیا ہے۔ پولیس افسر کا کہنا ہے، اکبر علی خاں کا بھائی طویل سفر سے آیا ہے اور چھوٹے بھائی کی ناگہانی پر بہت دل گرفتہ ہے۔ اسے ابھی کسی اور طرف دیکھنے اور سوچنے کا وقت کہاں ملا ہوگا، لیکن پولیس اس کے اثر و رسوخ سے واقف ہے، اس لیے خائف ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اکبر علی خاں کا بھائی تم سے ملاقات کرنا چاہے گا۔“

میں چپ رہا۔ میرے پاس کیا جواب تھا۔ ”اکبر علی خاں کے قتل کے مقام پر پہنچنے والی تین لاشوں نے خاصی پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ میرے، تمہارے اور کسی حد تک پولیس کے بھی علم میں ہے کہ یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو، قاتل اتنی آسانی سے گرفت میں نہیں آپائیں گے۔ بہر حال، میں نے پولیس کو یقین دلادیا ہے کہ اس دوران تم پر وقت اسپتال میں رہے ہو اور پولیس..... بھی تو تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہی ہے۔ ادھر میں احتیاطاً پراسٹر بھارگو سے بھی مشورے لیتا رہا ہوں۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم فی الحال اپنے آپ کو اسپتال اور بیمار بھائی کے کمرے تک محدود رکھو۔“

ملازم کی مداخلت پر ڈاکٹر رائے کو روکنا پڑا۔ ملازم باوردی تھا اور کسی پھل کے رس سے بھرے گلاس بہت اہتمام سے لایا تھا۔ یہ ان خاص کارکن تھا۔ ملازم کے جانے کے بعد ڈاکٹر رائے کو موقع ہوئی کہ میں زبان کھولوں گا، لیکن ممنونیت کے اظہار کے سوا میرے پاس کچھ نیا نہیں تھا اور ڈاکٹر کا لحاظ بھی مانع تھا کہ منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے۔

”آج شام کا واقعہ میری زندگی کا سب سے اچھا تجربہ تھا، خاصاً سنسنی خیز۔ ہم قاتلوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور وہ..... وہ کیسے مطمئن تھے۔“

”آپ اڈے کے لوگوں کے درمیان تھے۔“

میں نے صبح کی جرأت کی۔

”یعنی وہ قاتل نہیں تھے۔“ وہ جگر کے بولا، ”یہ ان کے لیے کیوں کہ معمول کی بات ہے۔“

”اڈے کے آدمی اس طرح ہر کسی کا خون نہیں کرتے۔“

”مگر وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے تین آدمیوں کا خون کیا ہے۔ یہ اعتراف کسی طور ڈھکے چھپے انداز میں انہوں نے خود کیا ہے۔“ شدت بیاں میں ڈاکٹر کی آواز طعن میں پھنس گئی۔

”مگر میرے اور آپ کے سامنے اس بھولی دہم اعتراف کی کیا حقیقت ہے۔“

”یہ ایک اور بات ہے۔“ وہ جھنجھلا کے بولا۔

”انہوں نے ان لوگوں کو راستے سے ہٹا دیا جو ان کے لیے مسلسل مصیبتیں کھڑی کر رہے تھے۔“

”تم ان کی حمایت کر رہے ہو؟“

”جن تین آدمیوں نے انتھونی اور اکبر علی خاں کو قتل کیا تھا، آپ کے خیال میں ان کی کیا سزا ہو چاہیے؟“ میں نے غلے سے پوچھا۔

”نوراً کچھ کہنے کے بجائے وہ پہلو بدل لے لگا۔

”نہیں..... انہیں..... مگر یہ عدالت کا کام ہے۔

”ہم انہیں کس لیے کھلی ہوئی ہیں۔“

”عدالت بھی یہی فیصلہ کرتی..... یا نہیں

کرتی..... مگر فیصلہ تو یہی ہونا چاہیے تھا۔ عدالت کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں ایک وقت صرف ہو چاہا، گواہیاں، شہادتیں، دلیل، اور ایک عدالت کے بعد دوسری، تیسری اور ایک تیسری کے بعد دوسری..... ممکن ہے، وہ سچ بھی جانتے۔“

”مگر یہ بھی تو ممکن ہے، اکبر علی خاں کا قتل انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔“

”اور اگر واقعی کیا ہو؟“

”مگر اڈے کے لوگوں کو کسی فیصلے کا اختیار نہیں ہوتا چاہیے۔ انہیں کیا، کسی کو بھی نہیں۔“

”سارے معاملات میں وہ کہاں رٹیل ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک بالکل مختلف معاملہ تھا۔ یہ ان کے اڈے کا معاملہ تھا۔ اڈے کے لوگوں پر غریب آدمی تھی۔ اپنے ہی آدمیوں کی وجہ سے وہ دروازہ پر تھے اور..... یوں سمجھئے، انہوں نے اچھل کر طرح خونی تلاش کر لیے تھے۔“

”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“

”میں اصرار ابھی نہیں کر رہا۔ میں تو حقیقت واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا، اس کو پس منظر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور انہوں نے قتل کہاں کیا ڈاکٹر صاحب! یہ تو انہوں نے میرے اور آپ کے سامنے جوڑ کا چھپا سا ج بولا تھا، اس کی کیا وقعت ہے۔ انہیں کسی مضبوط شہادت کے بغیر کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی۔ ہاں، میں انہیں سزا دے سکتا ہوں، آپ دے سکتے ہیں۔ آپ نے وہ قول لازماً سنا ہوگا، قانون کی آنکھیں نہیں ہوتیں، صرف کان ہوتے ہیں، چلیے، کل صبح چل کے میں اور آپ عدالت میں اعلان حق کرتے ہیں، تم سچ بولتے ہیں۔ انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی۔ اگر کی ہے تو اس کا خمیازہ ضرور بھرتیں گے۔ آدمی اپنی غلطیوں ہی سے اپنے لیے کانٹے بوتا ہے۔“

”تم مجھے سچ کر رہے ہو۔“

”مجھ میں یہ جوصلہ نہیں ہے۔“

”گویا اب سب کچھ فیصلہ ہو چکا۔“

”باقی پولیس کی سنجیدگی اور دیدہ ریزی پر منحصر ہے۔ اس کے لیے یہ عزت وقار کا مسئلہ ہونا چاہیے۔ پولیس بھی سمجھتی ہے۔ اسے سزا تلاش کرنے کی بے قراری ہونی چاہیے۔“

”ہم اس کی مدد تو کر سکتے ہیں۔“

”کس بنیاد پر؟“

ڈاکٹر کا جسم پھڑک کے رہ گیا، اور وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولا، ”تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔“

انیس کے دس میں کالی مریج اور نمک کی آمیزش تھی۔ میں نے لمبا گھونٹ لے کے گلاس تمام کر دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اپنے گلاس کا دس طلق میں اڈیل لیا۔ ”یہ اس کم عمری میں ایسی جہاں ویدیگی تم میں کہاں سے آگئی؟“ وہ کچھ پرسکون سا ہو گیا تھا۔

”شاید میں نے زندگی زیادہ ہی جھیلی ہے۔“

میں نے انکار سے کہا۔

باہر سے آتی ٹھنکی نسوانی آواز نے نشست گاہ کا سکون متلاطم کر دیا۔ ”پاپا! کھانا لگوا لیں۔“ ساتھ ہی بادامی رنگت کی سادگی سی ساری میں لپٹی ایک نو جوان لڑکی ہوا کے تیز جھونکے کی طرح کمرے میں درا آئی۔ مجھے دیکھ کے وہ کسی قدر جھجکی اور پچھتی پلگوں سے بولی، ”آپ ہی باہر صاحب ہیں۔“

میں کھڑا ہو گیا۔

اس نے میری سامنے آ کے جھٹ مٹا دیے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور چٹکتی آواز میں بولی، ”اچھا، تو آپ ہیں۔ پاپا لوگوں کی تعریف کرنے میں بڑے بخیل ہیں، لیکن آپ کا ذکر مسلسل کرتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔“

اس کے نرم ہاتھوں کی حدت اور لپک سے اس کے اشتیاق کی تصدیق ہو رہی تھی۔ اس کی ناگہاں آمد، تپاک اور اس بے ساختگی سے میرے حواس منتشر ہو گئے۔ ”یہ بیٹا ہے، میری بیٹی۔“ ڈاکٹر نے افتخار سے کہا۔ ”اور اب یہ میرا بیٹا بھی ہے۔“ اس

کے لہجے میں بے پناہ شیطنت تھی۔

سو نے جیسی اس کی رنگت تھی، سونا جیسے تپا ہوا ہو، چہا جیسے کندن بن گئی ہو۔ بدن کا ایک ایک انگ تاپ تول کے بنایا گیا ہو، شانوں تک تراشیدہ بال، چہرے پر ہانڈی اور دو تازگی، انداز میں تھکتے اور اعتماد۔ اسے حسن و جمال کا مریخ نہیں کہا جاسکتا تھا، لیکن جاذبیت اور دل کشی میں یک، ٹا، یک۔ آدنی دیکھتا رہ جائے، آدنی کھینچتا چلا جائے۔ یہ غولہ ہر حسین لڑکی میں نہیں ہوتی۔ ”میں تو بھول ہی گیا۔“

ڈاکٹر خود کو سرزنش کرتے ہوئے لہجے میں بولا، ”تم کچھ بچو گے، اسکاچ، واٹن، یا کوئیک؟ اسکاچ کا تو وقت نہیں رہا۔“

”جی، جی نہیں۔“ میں نے اپنی زبان سے کہا، ”میں کچھ نہیں پیتا۔“

”کوئی تکلف نہیں، میں برا نہیں سمجھتا اور گاہے گاہے تو.....“ وہ مسکرا کے بولا۔

میں نے شکر یہ ادا کیا۔ ”بس یوں ہی عادت نہیں پڑی۔“

”اچھا ہے یہ بھی..... مشکل یہ ہے کہ پھر آدنی شرابی ہو جاتا ہے اور شرابی ہو کے آدنی نہیں رہتا۔“

”پاپا! بانی باتیں اب کھانے کی میز پر۔“ بیٹا نے جھلی آواز میں کہا، ”کھانا تیار ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آتے ہیں سرکار۔“

ڈاکٹر کے قدویانہ لہجے پر مجھے تعجب ہوا۔ ایسا لگا کہ بیٹی کے سامنے وہ بے بس سا ہو گیا ہے۔ یوں بھی اولاد کے سامنے آدنی کو اپنی عمر کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگتا ہے، اور اولاد جوان ہوتو پس پاسا ہو جاتا ہے۔

بیٹا چھلاوے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔

ڈاکٹر بھی اٹھ گیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ نشست گاہ سے نکل کے ہال میں اور چند قدم کی دوری پر واضح کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ میز پر چینی کی صاف شفاف تشریاں بھی ہوئی تھیں۔ گلاسوں میں سفید

رومال اڑ سے ہوئے تھے۔ کھانے کا یہ اہتمام میں نے کرنا ہی کے ہاں دیکھا تھا۔ جو لیکن اس قسم کی نوک پلک میں بڑی مشاق ہے۔ بیٹا کی نگرانی میں وردی پوش خاندانوں نے خوان اس احتیاط سے میز پر رکھے کہ ایک ذرا سی بھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ یہ آداب بھی زندگی کتنی مفید کرتے ہیں۔ درمیان میں ڈاکٹر اور اس کے دامیں بائیں میں اور بیٹا بیٹھ گئے۔ کھانوں کی اقسام زیادہ نہیں تھیں۔ ڈاکٹر کی دیکھا دیکھی میں نے بھی سبزیوں کی کتنی سے ابتدا کی۔ جھلی کا سالن، مٹر بٹاؤ، پیٹر پالک، مسالا مرغ، میٹھی کے ساگ ملی سوچک کی دال اور اردو کے پتوں کے کباب۔ سب کچھ ہلکا پھلکا اور لذیذ، کچھ عطف سا بھی، مرغیں برائے نام اور روغن کم سے کم۔ میں نے اندازہ وضع تعریف کی۔

”آج اس نے تجربے نہیں کیے، شاید تمہارا خیال رکھتے ہوئے۔“ ڈاکٹر رائے نے توصیفی غوروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”ورنہ یہ تو روز ہی نت نئے تجربے.....“

”آپ کو دل چسپی ہے کھانا پکانے سے؟“ میں نے بیٹا سے پوچھا۔

بیٹا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے لقمہ دیا۔

”کھانے سے زیادہ تجربوں سے۔ خاندان کو بدایتیں پوری کرنی اور سر پر کھڑی رہتی ہے۔“

”اور تجربے کیا کرے ہوتے ہیں پاپا!“ بیٹا نے لہجے کے پوچھا۔

”نہیں، بہت اچھے، مگر ہنرم بھی تو کرنے پڑتے ہیں۔“

”ادہ بابا۔“ وہ کھل کھلا پڑی۔ طعام گاہ میں کشتیاں ہی بچ گئیں۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو کھانا پکانے کا شغف بھی رعبت ہوئی۔“ میں نے دبی آواز میں کہا۔

”کیوں، اندازہ کیوں نہیں تھا؟“ بیٹا نے

جھک کے پوچھا۔

”عموماً جہاں ملازمین اور زندگی کی افر سہولتیں میسر ہوں، وہاں کھانا پکانے وغیرہ کو اجنبی چیزیں سمجھا جاتا ہے بلکہ فضیلت۔“

”اور وہاں طرح طرح کے کھانوں کے بھی دل دادہ ہوتے ہیں۔“ بیٹا حلقے سے بولا، ”کھانے کا تعلق تو زندگی سے بہت ہے، عاقلانہ سے زیادہ۔“

”اور یہ تم دیکھ رہے ہو۔“ ڈاکٹر رائے پر اٹھا کے گھماتے ہوئے بولا، ”ان دیواروں پر یہ نقش و نگار، یہ جگہ جگہ، کونے کونے بے حرکت سر اور عورتیں..... یہ بے جاں بھی ای کی شرارتیں ہیں۔“

”یہ مجھے، تصوریں آپ کی تخلیق ہیں۔ یہ میرا کچھ.....؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں۔ بس ایسے ہی کوشش کرتی رہتی ہوں۔“ بیٹا چلتی آواز میں بولی، ”آپ کو مصوری، سنگ تراشی سے کوئی نسبت ہے؟“

”درک نہیں، شوق ضرور ہے۔ آپ نے تو بہت اچھا کام کیا ہے۔ سارا گھر عجب خاندان لگا ہے۔ یہ مجھے اور تصویریں مجھ صناعی اور مصوری نہیں، ان میں آپ کا خیال، آپ کے احساس، آپ کی فکر کا اضطراب جھلکتا ہے۔ لگتا ہے، درون خاندان کچھ سلگ رہا ہے، کوئی شورش سی پا ہے۔ کچھ تلاش سی ہے۔ جو کونظر آ رہا ہے، جوں کا توں وہ آپ کو قبول نہیں۔ اس سے کچھ نیا، بدلا ہوا اور روا ہونا چاہیے۔ مصویر اور مجسمہ ساز قدرت جیسا اختیار چاہتے ہیں۔ تجربہ کی مصوری اس خواہش کی ایک مثال ہے۔ تجربہ کی مصویر طبع ہوئے بغیر قدرت کے بنائے ہوئے نمونوں سے انحراف کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ جیسے کا کثات کی ایک سانی سے اکتا گئے ہیں اور تغیر و تبدل کے شدت سے خواہش مند.....“

میں نے خود کو دراک لیا اور معافی چاہی کہ اس موضوع پر کوئی دست دس نہ ہونے کے باوجود میں

کبھی کلیاتی باتیں کر رہا ہوں اور ایک باقاعدہ مصور کے سامنے۔
 بیٹا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ”آپ رک کیوں گئے؟“ وہ چمن چھنالی آواز میں بولی، ”بہت عمدہ تجزیہ کر رہے ہیں آپ۔“
 ”کہاں، بس یوں ہی۔“
 ”آپ تجریدی مصوری کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔“ بیٹا نے مجھے ٹوکا اور اس کا سارا بدن جھل سا گیا۔

”میں..... میں کہہ رہا تھا۔“ شاید اپنی بے باگی، یا تجاؤز کے احساس سے میری آواز اونٹنے لگی، میں نے لہجے میں نرمی اختیار کی۔ ”اور ہوا کچھ بے، بعض مصوروں نے تجرید کے عنوان سے مادر پدر آزادی حاصل کر لی۔ پھر تو کوئی بھی مصوری کا دعو کر سکتا ہے کہ اشیاء و اجسام، مظاہر و مناظر کی مسلمہ اور مستقل شکلیں منسوخ کرنے کا کام نہایت آسان ہے۔“

تجریدی تخلیقات میں بھی ایک توازن و تناسب ہر حال لازم ہے۔ مراد یہ ہے کہ تجرید کو بھی ایک نظم و ضبط چاہیے۔ تجرید مصوری کے نسب اور سلسل سے بالکل جدا نہیں ہو سکتی۔ بھی اثر انداز ہوتی ہے جب تخلیق کار کو مصوری کے آداب و قواعد سے آگہی ہو اور وہ اشیاء و مناظر کی مجسمہ تشکیل و تجسیم پر بھی قادر ہو، یعنی انحراف اسی مصور کو زیر دیتا ہے جو مصوری کی بنیاد، اس کے فنی رموز سے آشنا ہو..... اور ہاں رسائی بھی ایک شرط ہے، چاہے وہ معدودے چند تک ہو۔ مشکل رسائی اور چیز ہے، رسائی سے عاری ہونا اور چیز۔ تخلیق رسائی سے عاری ہوگی، یا رسائی صرف تخلیق کار تک محدود رہتی ہے تو حجت محض ہے۔ ہر تخلیق یعنی اپنے لیے، اتنی دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی صرف اپنے لیے شعر نہیں کہتا اور کوئی صرف اپنے لیے تصویر نہیں بناتا، سورسائی لازم ہو جاتی ہے۔ تجرید بے دلیل نہیں ہوتی۔ وہ کسی فکر،

کسی خیال کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ گیسروں، رنگوں اور زاویوں میں فکر و خیال، معانی و مفہام نہیں پیچے ہوئے، آنکھ چٹوئی کرتے محسوس کرتے ہوں تو ان کا تعاقب ضرور کیا جاتا ہے اور تعاقب میں کچھ ہاتھ نہ آئے تو..... تو..... میں پھر بھٹکنے لگتا تھا۔ اپنی رو میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔ دونوں باپ بیٹی کی نظریں مجھے نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔

بیٹا کا چہرہ آتے جاتے رنگوں سے ہتھار ہا تھا۔ باپ سے وہ شکایت کرنے لگی کہ اس نے میرے بارے میں اتنے کچھ سے کیوں بتایا تھا۔

”پھر میں نے اسے مدعو کیوں کیا ہے۔“ ڈاکٹر رائے بچوں کی سی سرخوشی سے بولا، ”میں تمہارے لیے کچھ تجزیہ تر محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔“

بیٹا نے معنوی تاراشی کا اظہار کیا اور ہلکتے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی، ”آپ نے تجریدی بات کی ہے۔“

تاشائی (impressionistic) مصوری میں حقیقت سے ایسا انحراف نہیں کیا جاتا، حقیقت ہی بنیاد رہتی ہے۔“

”مصوری کی یہ قسم اس لیے مرغوب بھی بہت ہے کہ حقیقت بنیاد رہتی ہے۔ یوں کہے کہ بنیاد میں ذرا سا تصرف کیا جاتا ہے، بخور لرز اور جھن جھنایا جاتا ہے۔ یہ ایک معصومانہ انحراف ہے، سرکشانہ اجتہاد نہیں۔“

”آپ تو خاصا جانتے ہیں۔“ بیٹا کی آواز حیرت آمیز سرت اور احترام سے مملو تھی۔

”نہیں، بالکل نہیں، کسی خوش فہمی میں نہ رہیے۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر بات کرنے کا حوصلہ نہیں کرتا چاہیے تھا، لیکن کچھ تو سفر بہت کیا ہے، اور شہر شہر میں عجائبات و نوادر دیکھنے کا موقع ملا ہے، پھر اصل میں، ہمکنی میں میرے ایک مربی تھے، راج کرشانی، مدراہمی تھے، پولیس کے بہت بڑے افسر، سفر کے دوران ریل کے ڈبے میں

اپنا پر قتلانہ حملہ ہوا۔ میں نے ان کی جان بچائی تھی۔ مجھ پر ایسے مہربان ہوئے کہ اپنے گھر لے گئے۔ مجھے چھوٹا بھائی سمجھنے لگے۔ پولیس سے وابستگی کے باوصف وہ بہت بڑھے لکھے آدمی تھے، عالم فاضل۔ انہیں فرصت کم ملتی تھی لیکن جب بھی ملتی، مجھ سے ادب، شاعری، فلسفے، مصوری، موسیقی کی باتیں کیا کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ میری تربیت کرتے، مجھے اپنا علم منتقل کرتے رہتے تھے۔ دوسری بار ان پر حملہ ہوا تو میں انہیں نہ بچا سکا۔ بد معاشوں نے انہیں ختم کر دیے۔“

”باپ.....“ بیٹا کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے شری لڑکیوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”کچھ کچھ ہوا۔“ میں نے اداسی سے کہا۔ ”اور آپ کو بتاؤں، وہ مجھے اتنا اپنا سمجھنے لگے تھے کہ ساری جائیداد میرے نام کر گئے۔ میرے سوا ان کا کوئی تھا ہی نہیں یا ایسا سمجھتے کہ میرے سوا وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے مصوری کے بارے میں جو کچھ التماسیدھا کہا ہے، وہ میرا دیکھا اور جانا ہوا م، سنا ہوا زیادہ ہے، یہ تو آموختہ تھا۔“

”آدمی اپنا دیکھا اور دیکھا ہوا ہی دہراتا ہے اور دل بچھی نہ ہو تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ کیوں بابا؟“ بیٹا نے باپ سے حمایت چاہی۔ ڈاکٹر رائے نے سر ہلا کے تائید کی۔

کھانا کب کا ختم ہو چکا تھا۔ خانسماں نے خوان ہٹا لیے تھے۔ ڈاکٹر رائے کے اٹھنے پر میں بھی اٹھ گیا، بیٹا بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے خوشامدانہ سے لہجے میں بیٹا سے کہا کہ اسے مجھ سے کچھ بات کرنی ہے، بیٹا اس دوران کافی کا اہتمام کر دے تو کیا خوب ہو۔

”کوئی ذاتی قسم کی بات؟“ بیٹا نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، کچھ ایسی ذاتی نہیں۔“
 ”تو میں شریک نہیں ہو سکتی؟“

ڈاکٹر رائے نے انکار نہیں کیا، انکار کر نہ سکا۔ وہ بیٹی کی بیٹائی پر کسی شکر کا تحمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہتے تھے کہ ہماری باتوں میں بڑے ذوق کی شاید کوئی چیز نہ ہو۔

”شکر میں اس منتظر اور شان دار مہمان کے ساتھ بیٹھنا اور بہت سی باتیں کرنی چاہتی ہوں۔“ بیٹا نے بے باکی سے کہا۔
 ”میں..... میں تو کچھ بھی نہیں۔“ میں نے ہکا کے کہا۔

”آپ لوگ بیٹھے، میں کافی کا انتظام کرتی ہوں۔“ بیٹا نے جیسے کچھ سنا ہی تھیں۔ تیز قدموں سے وہ ایک طرف چلی گئی۔

دو بار نشست گاہ میں جانے کے بجائے ڈاکٹر رائے ہال کے ایک گوشے میں رکے سونوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ بیٹا ہال مزید روشن کر گئی تھی۔ ”تم کسی کافی پزند کرتے ہو، بیک یا ساوا، دودھ کے ساتھ یا کریم کے؟“

”میں مشروبات کسم پیتا ہوں۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”ویسے کافی کا لطف ہی اس کی ٹی میں ہے۔“

”اور تم سب سے زیادہ تلو چیز نہیں پیتے۔“
 ”جی ہاں۔“
 ”برا سمجھ کے؟“

”کچھ اچھا چیز بھی نہیں ہے۔“ میرا نے آپ سے کہا تھا، بس عادت ہی نہیں پڑی۔“
 ”کیا اڈے کے لوگ نہیں پیتے؟“

”پیتے ہیں۔ شراب، الون، گانجا اور بھنگ بھی، لیکن عام آدمیوں کی طرح، عادی شریوں اور نشے بازوں کی طرح نہیں، اور کی خاص موٹی پر۔“

بیٹا فوراً ہمارے درمیان آگئی اور اپنے باپ کے ساتھ میرے مقابل سوئے پر بیٹھ گئی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ شاداب لگ رہی تھی۔ ”کیا باتیں کر رہے تھے آپ؟“ اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ ڈاکٹر رائے اچھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے تمہیں اڈے پاڑوں کے متعلق بتایا تھا، اسی کے بارے میں کچھ مزید معلومات.....“

”اڈے کے لوگوں کے سینگ نہیں ہوتے، نہ چار آنکھیں، چار کان۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، ہاں۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں تڑپ آگئی۔ ”مگر وہ اڈے کے لوگ ہوتے ہیں، عام لوگوں سے مختلف۔“

”عام لوگوں میں بھی بہت مختلف لوگ ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر رائے مفاہمانہ لہجے میں بولا۔

”معلوم ہے، تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہے۔“

”اور بے جواز نہیں۔“

”ہاں صاحب۔“ اس نے الگسائے ہوئے اقرار کیا اور کچھ توقف کے بعد ہنک کے بولا، ”ایک بات ذہن میں لگتی ہے۔ تمہارا کہنا ہے

کہ ڈاک خانے والی ٹکی میں..... کیا نام تمہارے والے آدمی کا؟“

میں نے بتایا، ”دھنوا۔“

”ہاں دھنوا، دھنوا تمہارے ہاتھوں دھنوا کو زچ ہوتا دیکھ کے اس کا دوسرا سا بھی تمہاری طرف

چا تو تانے بوجھا تھا اور تم اس کے نشانے سے ہٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن چا تو بردار خود کو قاقو

میں نہ رکھ سکا۔ اس کا چا تو اپنے ہی سا بھی کی پیل میں جا کھا۔“

”جی ہاں، کچھ ایسا ہی۔“ میں نے تعجب سے کہا، ”آپ کو خوب یاد ہے، جزئیات کے ساتھ۔“

ڈاکٹر نے میری مداحی پر توجہ نہیں دی اور تیزی سے بولا، ”مگر وہ آدمی جس کے چا تو سے دھنوا زخمی ہو گیا تھا، اس حقیقت سے تو واقف تھا کہ غلطی اسی کی

تھی، پھر اس کے اور دھنوا کے لیے جان پر کھیلنے کو تیار اس کے دو اور ساتھیوں کے قہر و غضب کا کیا سبب تھا۔ ایسا جنون کہ وہ تمہیں ختم کرنے کے لیے اسپتال تک آگئے اور تم ہاتھ نہ آئے تو انہوں نے اکبر علی خاں کو ہلاک کر دیا؟“

”اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اصل حقیقت نہیں بتائی۔“ میں نے تامل سے کہا۔

”لیکن راہ گیر..... ٹکی کے بہت سے سکین بھی تو اس منظر کے گواہ تھے۔“

میری سمجھ میں ڈاکٹر کی الجھن ذرا دیر سے آئی۔ وہ ایک دانا و پنا، نہات منطقی بات کر رہا تھا۔ مجھے وہ

سارا واقعہ اختصار سے دہرانا پڑا۔ میں نے کہا، ”اس قسم کی صورت حال میں ایک جھپکنے کی مدت میں

منظر بدل جاتا ہے، کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بے شک راہ گیر گواہ ہیں، لیکن وہ ایک خیرہ کن منظر تھا۔

دھنوا کا سا بھی پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا، اور واضح رہے، فاصلہ میلوں کا نہیں، چند قدم کی

دوری کا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہی ایک راستہ تھا کہ اپنے قبضے میں آئے دھنوا کو ڈھال جائے

رکھوں کہ یہ صورت دیکھ کے چا تو بردار کو شاید کچھ ہوش آجائے، وہ خود کو قحام سکے، لیکن وہ تو مشتاقا

اور ادھر دھنوا کو چھوڑ کے الگ ہو جانے کی مہلت میرے پاس نہیں تھی۔ ایک لمحہ، دوسرا لمحہ..... لجنوں کا

معاملہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب!“

”میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر تندہی سے بولا۔ ”جب دھنوا کا سا بھی اس حقیقت سے.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی، ”وہی بتا رہا ہوں آپ کو۔ دھنوا کی پیل میں چا تو کی رعایت تھی اس سبب سے ممکن ہوئی تھی کہ میں کسی حد تک اسے

نشانے سے بچانے میں کامیاب رہا تھا، ورنہ چا تو تو اس کا پیٹ چیر دیتا، یا سینہ کھود ڈالت۔ چا تو بردار

نے خود کو یقین دلایا، اس نے یہی جانا کہ میں دھنوا کو چھوڑ دیتا تو دھنوا اس کے نشانے پر نہ آ پاتا، یعنی

س نے دھنوا کو سہ بنائے کیوں رکھا، یعنی مجھے اس
 خواہش کی قیاس کرنی چاہیے گی۔ کونسا نے پر
 جاتا رہنا چاہیے تھا یعنی میں نے دھنوا کو دانستہ
 گئے کر دیا۔ لازماً اس نے اپنے دوستوں کو بھی
 ہی کچھ باور کرایا ہوگا۔ اپنی کئی دوا اہلی کا غم و غصہ
 سے بہت ہوتا چاہیے تھا۔ کلی کے بوکھلائے ہوئے
 ناشائیوں میں کچھ دور تھے۔ کچھ قریب۔ کچھ نہیں کہا۔
 اسکا کہ کس نے دیکھا، کتنا دیکھا، اور کیا جانا، کیا
 سمجھا اور ایک نے دوسرے کو کیا یقین کی۔ بھوم میں
 ایک اپنی اپنی شہادت الٹا ہے۔ یہ بات ذہن
 میں رکھیے، میں ان کے لیے الجھتی اور اڑے کے
 دیوں سے ان کا روز کا واسطہ تھا، لیکن ان میں کچھ
 موقع پر میری حالت دیکھنے، میری مجبوری سمجھنے
 اور سچ بیانی کا حوصلہ رکھنے والے لوگ بھی ضرور
 ہوں گے۔ کسی سے گواہی طلب کی جاتی تھی کچھ
 ماننے آتا۔ کلی سے میرے نکلنے ہی بابا کا رنج تھی۔
 ڈے کے کچھ آدمی شامل ہو گئے اور ہر کوئی اس سمت
 اشارے کرنے لگا، جدھر میرا تانگا بڑھ رہا تھا۔
 انہوں نے پولیس کو بھی ساتھ کر لیا۔ میرا چاقو، میری
 سیب میں تھا۔ یہی ایک دلیل کافی ہے، لیکن دلیلیں
 بننے کی نوبت ہی کہاں آئی۔ میدانے شاید واسطے
 کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اسے چاقو بردار کی
 جتنی کا بھی علم ہوگا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے
 پہلے کہا تھا، ایک انتہی کے بجائے اڑے کے کبیدہ
 خاطر آدمیوں کو مطمئن رکھنا میدانے کے لیے ضروری
 تھا۔ اسے اس وقت کوئی اندازہ نہیں ہوگا کہ بات
 اتنی دور جا سکتی ہے۔ یہی کچھ تو وہ آپ کی موجودی
 میں کہہ رہا تھا۔

ڈاکٹر چپ رہا۔ جیسا کہ بے قرار سراپا سا کرت
 ہو گیا تھا۔ اس دوران خانساں نے کافی لاکھ میز
 پر رکھ دی تھی۔ چند لمبے گزر گئے تو بیٹا نے کہتی
 آواز میں خاموشی جاک کی۔ ”اب تو کوئی کھٹک
 نہیں رہی پاپا؟ آپ نہیں تو کافی غاؤں۔ آپ لوگ

بڑی عجیب قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے منتظر
 کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

ڈاکٹر نے رنجی انداز میں بیٹی سے معذرت کی۔
 بیٹی میں کافی ٹوٹتے ہوئے بیٹا کہنے لگی، ”بابا
 کی زبانی میں یہ خوف ناک واقعہ حضورِ اہمیت سن چکی
 ہوں، لیکن اب تو لگ رہا تھا جیسے میں وہاں موجود
 ہوں، چاقو کھلے ہوئے ہیں، لوگوں کی بھیڑ ہے اور
 ان میں میں بھی ایک گواہ ہوں۔“

”آپ تو ویسے بھی ایک خیال کار ہیں، پہلے
 تصور، پھر حقیقت۔ مصورتو تصور کی فراوانی ہی سے بڑا
 ہے۔“

”لیکن تصور کی کثرت بھی بہت تنگ کرتی
 ہے۔ آدمی ستوں میں جھک جاتا ہے، یک سو نہیں
 رہتا اور نہیں مطمئن نہیں ہوتا۔“ وہ خواب ناک
 لہجے میں بولی۔

”وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ قرار تو استقرار میں ہے۔
 زندگی تو یوں منزلیں سر کرنے ہی میں گزر جاتی
 ہے۔“

کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے خانساں کو
 آواز دے کے دوسری گرم کافی لانے کی ہدایت کی
 اور شخص آواز میں گویا ہوئی ”بابا کہہ رہے تھے،
 آپ کو چاقو بازی خوب آتی ہے۔“

”یہ کوئی ایسی فعلیت نہیں جس کا ذکر سر اٹھا کے
 یا اونچی آواز میں کیا جائے۔“

”برا تو نہیں مانا آپ نے۔“ وہ گھبرا کے
 بولی۔ اس کی گھبراہٹ میں بھی کیا دل کشی تھی۔ اس
 نے جلدی سے وضاحت کی: ”اصل میں آپ کو دیکھ
 کے بہت سے سوال ذہن میں کھلتے ہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے، لیکن یقین کیجیے، کوئی تیرہ
 کوئی سر نہیں نہیں ہے۔“

”پھر بھی کچھ تو ہے، کچھ بتائیے نا۔“

”اگر سامنے کا منظر اتنا ناگوار خاطر محسوس نہیں
 ہو رہا تو پیچھے کی جانب کیوں نظر کی جائے۔ ماضی کی

راکھ میں چنگاریاں بھی چھپی ہوتی ہیں۔“

”وہ تو لگ رہا ہے۔“ وہ مسکرا کے بولی۔

”کیا لگ رہا ہے؟“

”چنگاریاں، کھٹائیں، داستانیں، بہت کچھ۔“

”آپ کو مصوری کے ساتھ قلم کاری بھی کرنی
 چاہیے۔“

”محض قیاس ہے میرا، غلط بھی ہو سکتا ہے۔“

”اور میں کہتا چاہتا ہوں، ماضی سے حال کا کتنا
 تعلق ہے۔ صرف حال ہی پیش نظر ہونا چاہیے۔
 آدمی کا حال ماضی سے بہت مختلف ہو سکتا ہے تو پھر
 آنے والے وقت میں بھی کیا کچھ بدل سکتا ہے۔
 آدمی تو بدلتا رہتا ہے، اور جو سامنے ہے، وہی معتبر
 ہے۔“

”وہ دیکھتی تھیں ان سے مجھے دیکھتی رہی۔“ آپ کو
 انگریزی میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کسی قدرت
 ہے۔“

”انگریزی تو آپ بولتی ہیں، رواں، کل،
 شستہ، صحیح برطانوی طرز کلام، بالکل گوروں کی
 طرح، بل کہ ان کی اشرافیہ کی طرح۔“

”وہ سننے لگی، ہال میں چھٹا کا سا ہوا۔“ میں
 انگلستان میں بہت دن رہی ہوں۔“

”وہی تو.....! میں تو ہندوستانی لہجے میں
 انگریزی بولتا ہوں۔ کبھی تو خود مجھے اپنا لہجہ بہت
 چھپتا ہے۔“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں۔“ اس نے میری سرزنشی
 یک سرسبز کر دی۔

”ان چار پانچ دنوں میں، جب سے اسپتال
 آنا ہوا ہے، میں تو انگریزی سے واسطہ پڑتا رہا
 ہے۔ نرسیں، ڈاکٹر، سبھی انگریزی کے عادی ہیں۔
 حالانکہ اسپتال میں نوے فی صد سے زیادہ مریش
 ہندوستانی ہوں گے۔ وہ جو کہتے ہیں، گٹ پٹ
 کرتے کرتے جڑے دکھتے لگے ہیں، کچھ یہی حال
 ہو چکا ہے میرا۔“

”بہشت!“ ڈاکٹر رائے نے بہت دیر بعد چھپتے
 لہجے میں مداخلت کی۔ ”تم خاص کمروں کی بات
 کر رہے ہو، یہ گٹ پٹ تو انہی کمروں سے مخصوص
 ہے۔“

خانساں نے تازہ کافی لاکے رکھ دی تھی۔ بیٹا
 نے ٹکٹ کی، اس مرتبہ کافی کو ٹھنڈا ہو جانے کا ذرا
 سا وقت نہیں دیا۔ مجھ سے متدار پوچھ کے اس نے
 شکر تحلیل کی۔ پہلے اپنے باپ کے سامنے بیٹائی
 رکھی۔ پھر میرے آگے۔ شکر نے سیاہ کافی کی کٹی
 خاصی کم کر دی تھی۔ کافی کا گھونٹ بھر کے بیٹا نے
 گلابی ہونٹوں سے رومال مس کیا اور چپک کے
 بولی، ”پاپا سے معلوم کیجیے، ہم جو لوگ میری کسی کم
 زوری ہیں۔“

”پھر آپ اپنی تصحیح کر لیجیے، میں مہم جو قطعاً
 نہیں۔ ہمیں تو مجھ پر وارد ہوئی رہتی ہیں اور جبراً
 مجھے ان سے خبر آتا ہوتا پڑتا ہے۔ کہیں خود میری
 زندگی کا معاملہ ہوتا ہے، کہیں کسی دوسرے کی۔ میں
 ایک بات صاف کر دوں، اڈے پاڑوں سے میرا
 تعلق بالواسطہ رہا ہے۔ میں اڈے پاڑوں کا آدمی
 نہیں ہوں۔“

”سمجھتے ہیں ہم۔“ بیٹا کے بجائے ڈاکٹر رائے
 سرزنش کے انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں بڑا اپنا
 پن تھا۔ وہ بیٹی سے کہنے لگا، ”تم محتاط رہو تو اچھا
 ہے۔ اندیشہ ہے، تمہارے سوالوں کے جواب میں
 اس نے سچ بولنا شروع کر دیا تو تم سے برداشت
 نہیں ہو پائے گا۔ یہ کل سے مجھے مسلسل حیران کر رہا
 ہے۔“

”مجھ اس نے یقین سے کہا تھا کہ آج کی وقت
 میدانے اس کا اسپتال آنا چاہیے۔ شام کو وہ موجود تھا۔
 یہ میرے لیے ایک نیا آدمی ہے، ایک تجربہ، بل کہ
 ایک معما۔ پھر اس نے میدانے استاد، بیٹا شہر کے سب
 سے بڑے ہمدست سے جس انداز کا سلوک کیا، وہ
 دیدنی تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ میں نے التجا کی، ”اتنا

مست کیے۔ میری جگہ آپ ہوتے، میری طرح اس ساری صورت حال میں شامل، اور میری طرح آپ پر گزر رہی ہوتی تو آپ بھی یہی کرتے، اسی نتیجے پر پہنچتے۔

”شاید نہیں۔ جزوی طور پر تم درست کہتے ہو۔“ ڈاکٹر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا، ”میں تمہاری جگہ ہوتا تو اتنی استقامت نہ دکھاتا۔“

”میری استقامت کی ایک وجہ آپ بھی تھے۔ آپ نے میری بات محل سے سنی اور میری پاس بانی کی۔“

”تم اپنے بزرگ کو عزت و تکریم سے نواز رہے ہو۔ یہ انہی بات ہے۔ لیکن میں نے تو بہت بعد میں یہ سارا کچھ جانا تھا۔ اس سے پہلے تو تم بہت کچھ خود ہی سمجھتے رہے تھے۔ ڈاک خانے والی غلطی کا واقعہ، اکبر علی خاں کے گھر میں تمہارا داخلہ اور میدا کے اڈے پر جانے کا حوصلہ۔۔۔۔۔ ان سارے مراحل سے تم گزر چکے تھے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں نے تو تج کی اعانت کی ہے۔ چوں کہ تم سچ بولتے رہے تھے، لیکن۔۔۔۔۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”تم نے ایک سچ نہیں بولا۔۔۔۔۔“

”وہ کیا؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”۔۔۔۔۔ کہ مریض تمہارا اصل بھائی نہیں ہے۔“

مجھے جھٹکا سا لگا۔ کئی بار دل میں آیا تھا کہ میں ڈاکٹر پر یہ حقیقت آشکارا کر دوں، لیکن کچھ تو تج میں اس سچ یابی کا موعظ نہیں آیا یا، یا پھر کوئی دور پرے کی احتیاط مانع رہی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں پھر کیسے کیسے سوال اٹھنے لگیں، یا پھر مجھے اس وضاحت کی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پشیمانی کے چند لمحوں بعد میں نے اس سے یہی کہنا چاہا کہ بھائی کیا، میرے تو بھل سے بہت سے رہتے ہیں۔ وہ میرا باپ ہے، دوست، بزرگ، مربی و مکن ہے۔ وہ تو میرا آقا ہے، میرا سایہ، میرا ستون ہے۔ ڈاکٹر کی آسانی کے لیے میں نے ”بھائی“ کی نسبت معین

کر دی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ بھائی ہی کا رشتہ مستحکم ہو۔ بھائی تو صرف بھائی ہوتا ہے۔ کیا ڈاکٹر نے بھٹل کے لیے میری نگہبندی، میری تشویش، میرے اضطراب میں کوئی کوتاہی دیکھی ہے۔

میرے زبان کھولنے سے پہلے ڈاکٹر نے مجھے روک دیا۔ ”جانتا ہوں، تم کیا کہو گے۔ واقعی میں نے اصل رشتوں میں بھی ایسی قربت نہیں دیکھی۔“

ڈاکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملازم نے آکے کسی اسپیکر کی آمد کی اطلاع دی۔

”سکینا؟ ابھی تو وہ یہاں سے گیا ہے۔“

ڈاکٹر رائے الجھ کے بولا، ”اب کیا بات ہے؟“

میرا ہاتھ اٹھا۔ اسپیکر کا دوبارہ آواز اس وقت آتا ہے علت نہیں ہو سکتا تھا۔

چینا نے باپ کو مشورہ دیا کہ گھر میں مہمان موجود ہے، اسپیکر کو منہ کر دیا جائے۔

ڈاکٹر نے اس کی بات نہیں مانی۔ ملازم منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اسپیکر کو سبزہ زار میں بٹھانے اور کافی پیش کرنے کی تاکید کی۔

میرے لیے اب رخصت کی اجازت لے لینا ہی مناسب تھا لیکن میں نے کچھ دیر اور ٹھہر جانے کی منت کی، ادھر ڈاکٹر کا بھی یہی حکم تھا۔

جلد آنے کا کہہ کے ڈاکٹر ہمارے پاس سے چلا گیا۔ میں اور چیتا تمہارہ گئے۔ گو میرا دماغ اسپیکر کی

ناوقت آمد کی ادھیر بین میں لگا ہوا تھا، لیکن سامنے بیٹا بھی، ماہ جمال، خوش مثال، خوش خیال بیٹا۔ میں نے اپنا دھیان ہٹانے اور میزبان کی خوش نویدی کے لیے اس کی تصویریں اور مجھے دیکھنے کی فرمائش کی۔

میرے اشتیاق پر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور دن میں کسی وقت گھر آنے کی دعوت دی کہ اس کی تخلیقات کی نظارگی کے لیے دن کا وقت ہی موزوں ہوتا۔

”مجھے احساس ہو رہا ہے، میں آپ دونوں کے معمولات میں حارج ہو رہا ہوں۔“

”بالکل نہیں۔“ اس نے خوش وضعی سے تردید کی۔ ”پاپا تو رات گئے تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پاپا ان ڈاکٹروں میں نہیں جو ایک بار ڈگری لے کے سمجھ لیتے ہیں کہ بس سب کچھ جان لیا، میدان مار لیا۔ پاپا طب کی جدید کتابوں، دواؤں اور امراض کی تازہ ترین تحقیقات سے متعلق کتب و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ جتنے پرانے ڈاکٹر ہیں، اتنے ہی نئے بھی۔“

”لوگوں کا ان پر بڑا عقیدہ ہے۔ کہتے ہیں، کسی کسی کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے۔ یہاں اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کرامت بہت مشہور ہے۔“

”شفا تو ڈاکٹر کے علم، اس کی سنجیدگی، صبح و شام، مریض سے ہم دردی، غرض اپنے کام میں دیانت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پاپا کے لیے ہر مریض ایک سا انہیت رکھتا ہے، اور وہ اس پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ کسی پیچیدہ مریض پر وہ دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے میں ذرا تکلف نہیں کرتے۔“

”مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بے مثال ڈاکٹر ہیں اور آدمی بھی بہت نادر۔“

میرے اعتراف کی صداقت اس نے محسوس کی کہ اس کی آنکھوں میں شرارے نمودار ہوئے۔

”اور آپ۔۔۔۔۔ آپ کیا کرتی ہیں ان اوقات میں؟“ میں نے تمام تر شائستگی سے پوچھا۔

”کوئی ایک کام نہیں۔“ وہ خواہید ہی آواز میں بولی۔ ”کبھی ادھوری تصویریں مکمل کرتی ہوں، کبھی گراموفون سنٹی رہتی ہوں، کبھی ریڈیو، کبھی ستار بجانے لگتی ہوں، زیادہ تر کتابیں پڑھتی ہوں۔

کتاب بھی کھڑکی کی طرح ہوتی ہے، جھانک تو کچھ نہ کچھ ضرور نظر آتا ہے، ہر بار نیا منظر۔“

”لیکن بعض کھڑکیوں کے آگے دیوار بھی پڑ جاتی ہے۔“

میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھل کھلا ہنسی۔ ”بعض کتابیں بھی ایسی کھڑکیوں کے مانند

ہوتی ہیں، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔“

اس نے میری بات سے لطف لیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔

”اور ایک مصروفیت تو میں بتاتا ہی ہوں گئی۔“

اپنے مخاطب سے اس کے کلمہ کا کھف اب کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی، ”کبھی کسی چیز میں جچی نہیں لگتا تو پاپا کے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ ان سے زندگی سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ بھی کتاب چھوڑ کے مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ طب کی کتابوں کے علاوہ پاپا کو ادب کا بھی اچھا ذوق ہے۔ دنیا کے مشہور ناول، کہانیاں پڑھنے کے لیے جانے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔“

”آپ اپنے پاپا سے بہت محبت کرتی ہیں۔“

”وہ میرے دیوتا ہیں، میرے باپ اور ماں بھی۔“

”اور آپ کی والدہ۔۔۔۔۔؟“

”وہ اب تک ہیں ہمارے درمیان۔“ وہ

اداس ہو گئی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو بولی، ”تعلیم مکمل ہو گئی، لیکن آرٹ پر کچھ اور پڑھنے کا ارادہ تھا۔ پاپا کی تنہائی کا سوچ کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے یہاں چلی آئی۔“

”اب آپ کا یہاں دل لگتا ہے؟“

”یہ میرا وطن ہے۔ یہاں میرے پاپا رہتے ہیں۔“

اسی سے پہلے کہ وہ میرے بارے میں سوال کرنے لگی، میں نے انگشتان کی زندگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے دیکھا تھا، لوگ کتنے ہی گوروں سے ناراض، ان کے دشمن ہوں، انگشتان کے نظم و ضبط کی مدح و ثنا کرتے نہیں جھکتے۔ پھر تو جیسے بیٹا کو موضوع مل گیا۔ ایک دربار واں ہو گیا۔ وہ ہنر چر باتیں کرنے لگی۔ میرے کان ڈاکٹر کی وابستگی کی آہٹ کے منتظر تھے۔ میں نے کوشش کی کہ بیٹا کو

میری بے چینی کا احساس نہ ہو پائے۔ یوں اس کی

”سوچ رہا ہوں، کیا بتاؤں آپ کو۔ اس کا مطلب ہے فیض آباد پولیس سے ان کا رابطہ ہو چکا ہے۔“

”مسکینا یہی بتانے آیا تھا۔“

”اور اس نے خواہ مخواہ آپ کو تنگ کیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے یہی کچھ ہوگا کہ فیض آباد پولیس ٹھاکر بستی میں ہونے والے قتل و خون کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔“

”ایسا ہی کچھ کہا اس نے۔“

”تو آپ اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہیں۔ اڑے پانچوں سے متعلق لوگوں پر سنگین الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں۔ کیا میں اور بھائی ٹھاکر بستی کے حادثے میں فیض آباد پولیس کو مطلوب ہو گئے ہیں؟“

”اس نے یہ کچھ نہیں کہا۔“

”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں، اگر آپ سننا چاہتے ہیں۔“

”میں..... میں جانا چاہتا ہوں۔“

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد میں قیام کے دوران ایک روز بازار میں اڑے سے وابستہ ہریانائی آدمی پر زیادتی ہوئی دیکھ کے مجھ سے رہا نہیں گیا، مجھے قتل دینا پڑا۔ یہی ایک واقعہ ام پر پولیس کے شک کی بنیاد بنا۔

فیض آباد کے قریب واقع ٹھاکر بستی میں ایک خاندانی جاگیر دار ٹھاکر ہر دیو کی علاقے بھر میں دہشت، اس کے بدکار بیٹے ٹھاکر بھل دیو کی فیض آباد میں مقیم ایک نوجوان، حسین، جمیل، تعلیم یافتہ اور آسودہ حال لڑکی برکھا پر زبردستی اور شادی کے لیے پیام۔ برکھا کے باپ کے انکار پر ٹھاکر بھل دیو کا عتاب، برکھا کا اغوا اور اڑے کے آدمی کے آڑے آجانے پر ٹاکا کی، انتقام اڑے کے دو آدمیوں کا قتل، دوسری کوشش میں برکھا کے گھر پر حملہ، دو ملازموں کی ہلاکت اور برکھا کا اغوا، اور

قریب ہی کچھ کم سحر ناک نہیں تھی۔ کاش، انسپٹر کی آمد سے یہ رخنہ انداز کی نہ ہوتی۔ بعض لوگ بھی رنگ رنگ منظر کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ انگلستان میں ایک عرصہ گزار کے آئی تھی اور گوروں کی علوم و فنون سے دل چسپی، کام کی لگن، وقت کی پابندی، نفاست اور سلیقے سے بہت متاثر تھی، لیکن کچھ دیر ہی گئی، یہاں اپنے وطن کی بے اطواری، بے سلیقگی میں بھی ایک رنگ ہے۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی کہ اس نے یہاں کیا دیکھا ہوگا۔ یہاں تو بہت اندھیرے ہیں۔ اس نے یہاں کی غربت اور اس کے عذاب کہاں دیکھے ہیں، اور جہالت تو سب سے بڑی غربت ہے۔ ہندوستان تو اب اپنی جہالت کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں تو ستارا ہا، اور میری خوش سمتی سے وہ ہمیز ہوئی رہی۔ اس نے حسرتی لہجے میں کہا۔

”جب تک یہاں ہوں، اتنا رہوں گا۔ آپ بلائیں گی اور ڈاکٹر صاحب کا حکم ہوگا تو کیوں نہ آؤں گا۔“

”آپ سے مل کے عجیب سا احساس ہوا۔ بہت دنوں بعد کوئی.....“

ڈاکٹر کی آمد پر جیسے کسی خواب سے آکھ کھل گئی۔ ڈاکٹر کا چہرہ دیکھ کے اندازہ ہو گیا کہ انسپٹر مسکینا نے اس سے کچھ خوش گوار باتیں نہیں کی ہیں۔ ڈاکٹر کو گے دیر بھی خاصی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے سانس لینے کا وقت دیا، پھر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں، ہاں۔“ اس کے تپور کسی حد تک مغائرانہ تھے، معاندانہ نہیں۔ ”یہ ٹھاکر بستی کا کیا قصہ ہے؟“ اس نے ناگواری سے پوچھا۔

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ میری خاموشی پر وہ ڈپٹ کے بولا، ”چپ رہو؟“

دوسرے تیسرے روز گھر کے قریب پرہنہ اور شکستہ لاش کی صورت میں برکھا کی بازیابی، صدمے سے باپ کے حواس معطل، چند دنوں بعد ایک رات ٹھاکر بستی کی بابائی، ٹھاکروں کی ساری حوصلہ، بھیت کھلیاں نذر آتش، ٹھاکر، خاندان کے دیگر افراد، ملازمین اور مصاحبین پر مشتمل پالیس آدمیوں کی موت، اڑے کے دو آدمیوں کی ہلاکت سے ہم پر پولیس کے شک کی پتلی، حادثے کی تفتیش کے لیے پولیس کے بڑے بڑے افسروں کی تعیناتی، کوتوالی میں میری، بھل دیو اور اڑے کے سارے آدمیوں کی طلبی، سوال جواب اور کوئی ثبوت نہ ملنے پر کوتوالی سے ہماری بے عافیت دالسی کا سارا واقعہ ڈاکٹر کی شرح صدر کے لیے مجھے سنا پڑا۔

دونوں باپ بچی سن سے ہو گئے۔ بیٹا کے چہرے کی چپا زرد پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر بھی گنگ بیٹھا رہا۔ ان کے عالم حیرت کی ایک وجہ مجھ پر ان کا اعتبار تھا۔ یہ کسی غلط بیانی کا مرکب ہوں گا نہ کسی مبالغے کا۔

میں نے ڈاکٹر کو بتایا، پولیس کے اطمینان کی خاطر ہم نے فیض آباد میں قیام کی مدت بڑھا دی۔ سترہ اٹھارہ روز بعد ہم نے از خود کوتوالی حاضری دے کے پولیس افسروں کو فیض آباد سے اپنی روداگی سے مطلع کیا۔ انہوں نے ہمیں نہیں روکا۔ تاہم ہم نے اپنی جانب سے انہیں یقین دلایا کہ اس خوش ریزی میں ہمارے عمل دخل کا کوئی اشارہ نہیں ملے گا، ہم کہیں ان سے دور نہیں ہوں گے۔ پولیس، فیض آباد میں ہمارے گھر، بلاکٹ کے اڑے پر طلبی کا پیغام بھیج دے۔ ہم جہاں نہیں ہوں گے، فیض آباد چھو جائیں گے۔

”مگر ٹھاکروں کی بستی میں کس نے آگ لگائی؟“ ڈاکٹر کی آواز دھڑک رہی تھی۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ٹھاکروں نے گرد و نواح میں جانے کب سے بہت تباہی مچائی ہوئی تھی۔ کسی

کی عزت آبرو محفوظ نہیں تھی۔ ظاہر ہے، انہوں نے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہوں گے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“

”میں نے اس پر بہت غور کیا تھا، ہر پہلو سے اور میں آپ کو بتاؤں، مجھے شغل بھائی پر بھی شبہ ہوا تھا۔ شبہ کا وجہ وہی تھی جو پولیس کی تھی۔ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آئی تھی۔ ٹھاکر بھل دیو کو فیض آباد میں ہماری موجودگی اور ہمارے اڑے کے پشت پناہی کا علم یقیناً ہو گا۔ اڑے کے بعض آدمیوں کو ہمارے گھر آنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ یہ خدشہ در نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کسی دن ٹھاکر بھل دیو اپنے زور و اثر کے فتنے میں ہمارے گھر کو نشانہ بن جائے، لیکن پولیس کی طرح میرے پاس بھی کوئی گواہی نہیں تھی۔ جس رات یہ واقعہ ہوا، ہم سب فیض آباد میں تھے۔ میں مسلسل بھٹل بھائی کے ساتھ تھا۔ پولیس کو شہر میں ہماری موجودگی کی ساری شہادتیں ملی تھیں۔“

”پالیس آدمیوں کی موت، اتنا سنگین واقعہ! کوئی نقش، نشان، کوئی علامت نہیں۔“ ڈاکٹر کی حیرت بے جواز نہیں تھی۔

”تفتیش کے لیے گورے افسر بھی آئے تھے۔ انہوں نے تو حادثے کی جگہ کا سائہ بھی کیا تھا، مگر سنا ہے، سب کچھ خاکستر بکھنڈر ہو چکا تھا۔“

”صبح سویرے اکبر علی خاں کے قتل کی جگہ پر تین لاشیں پائی گئیں۔ گان ہے، انہی تین آدمیوں نے اکبر علی خاں کا قتل کیا تھا۔ کسی نے انہیں ان کے انجام تک پہنچا دیا۔ پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میرا اپنے اڑے پر آرام سے بیٹھا ہوا ہے، اس کے سامنے بھی۔ ٹھاکر بستی اور یہاں، بٹے کے واقعے میں ہمیں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی؟“ ڈاکٹر رائے بڑے تیوروں سے بولا، ”یاد ہے، جہی نے کہا تھا کہ ان تین آدمیوں کے قاتلوں کی گرفت آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر یہ میرا اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے تو انہوں نے اپنی گردنیں محفوظ کر لینے کی

ہر تہہ پر کر لی ہوگی، یعنی میدانے یہ کام کسی اور کو سونپا ہوگا۔“

”جی ہاں۔“ میں نے اقرار کیا۔ ”یہی کہا تھا میں نے اور کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔“

”پھر..... پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ تھا کر بستی میں تمہارے۔“ ڈاکٹر نے اپنی بات خود ہی ادھوری چھوڑ دی، کیوں کہ اسے میرا جواب معلوم ہوگا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا، ”اسپیکٹر سکسینا کو اس وقت یہاں آنے کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ کو ابھی اس سے باخبر کرنا لازم ہو۔“

”وہ نہیں آیا تھا۔“ ڈاکٹر نے ترشی سے کہا، ”اسے ڈی آئی جی نے بھیجا تھا۔ وہ تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ تم اس وقت میرے گھر پہنچے ہو۔ اسپیکٹر سکسینا ڈی آئی جی کی طرف سے مجھے متنبہ کرنے آیا تھا کہ تم پر اور تمہارے بھائی پر اتنی شدید نوعیت کے الزامات ہیں۔“

”کھنڈ الزامات نا!“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کاش، الزامات ہی رہیں۔“
”آپ کا وہاں لہجہ شک سے آلودہ ہے۔“
”نہیں نہیں۔“ ڈاکٹر کا لہجہ بدافشان ہو گیا۔
”پولیس کے پاس فضول قسم کے کام بہت ہوتے ہیں۔“

”ہاں پایا، کیا غلط ہے، دیکھیے نا پولیس افسر نے ہماری ایک خوب صورت شام بل کہ رات منتشر کر دی۔“ بیٹا نے دبے لہجے میں باپ سے شکایت کی ”میں اسی لیے آپ کو منع کر رہی تھی۔“

”پھر تم تھا کر بستی کے اس عبرت ناک واقعے سے محروم رہ جاتیں۔“ ڈاکٹر کی آنکھوں میں خاصی دیر بعد آسودگی نمودار ہوئی۔

”یہ بہت سستی خیز تھا۔“ بیٹا نے جھرمھری لے کے کہا، ”نا قابل یقین۔“

”مجھے شبہ ہے، اس قسم کے کتنے واقعات اس کے سینے میں دفن ہوں گے۔“

ڈاکٹر کی قیاس آرائی میں طنز کی رقع دانستہ نہیں تھی۔ دانستہ بھی ہوتی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ”ان پر مٹی ہی پڑی رہنے دیجیے۔“ میں نے پشیمردگی سے کہا۔

”دیکھا،“ ڈاکٹر نے اچھل کے بیٹی کو مخاطب کیا، ”یہ کیسا مختلف نوجوان ہے، اور بھی..... اور بھی ایسے واقعات سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔“

”میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔“ میں نے مسکرا کے کہا، ”رات بھی بہت ہوئی ہے۔“
”بٹھیے نا، کچھ دیر اور۔“ وہ اٹھائی آواز میں بولی اور باپ کی طرف حمایت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیوں پایا! ایک کافی اور نہ ہو جائے۔ کافی یا چٹھا اور۔“

کھانا کھائے وقت ہو چکا تھا۔ بیٹا اٹھ کے ہال سے باہر چلی گئی۔ خانساں شاید کہیں قریب ہی تھا کہ وہ فوراً واپس آگئی اور تیز سانسوں سے بولی، ”کیا آپ نے ابھی تھا کر بستی..... جس جگہ کا یہ واقعہ بتایا ہے، دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟“

”یہ کیا، اس سے بڑی حقیقتیں ہیں۔ یہاں صرف گوروں کی حکومت نہیں، بے شمار ظلم راس ہیں یہاں، دولت مند، زمین دار، جاگیر دار، نوابین۔ بالی خلقت تو ان کے پالتو جانوروں کی طرح ہے، ان کے گھوڑوں، ان کے کتوں کی طرح۔ پالتی سارے ان کی رعیت ہیں، ان کے قلام۔ یہاں کا تو باد آج بھی ہنر والا ہے۔“ میں نے خود کو تھما اور اپنے لہجے کی جڑ پر معافی مانگی۔

”میں..... میں پایا، آپ سے کیا کہتی ہوں۔“

بیٹا جو شیلے انداز میں بولی، ”یہ وہی بات کر رہے ہیں۔ یہاں تو دو قسم کے آدمی رہتے ہیں، ایک حاکم، ایک مظلوم، آقا اور غلام۔ نواب راجا لوگ وہاں بھی بہت ہیں، لیکن ایسا کچھ، یہاں جیسا کچھ نہیں۔“

”وہ ایک اور دنیا ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں بے چارگی سی تھی۔ ”وہ تین صدیوں سے جاگ رہے ہیں۔“

”اور ہم.....؟ ہم سوتے رہے ہیں۔“ بیٹا تڑپا سے بولی۔

”نہ سو رہے ہیں، نہ جاگ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اذاسی سے کہا، ”ہم کچھ تھک سے گئے ہیں۔ قوموں پر تلکان، اعصاب شکنی اور غنودگی کے یہ دور آتے رہتے ہیں۔“

خانساہاں نے بہت غلٹ کی۔ کافی کے ساتھ انگریزی بیکنٹ، خشک میوہ اور دال مونگہ وغیرہ کے لوازم بھی تھے۔ کافی ختم کر کے میں اٹھ گیا۔ پھر انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

ہم ہال سے باہر آ گئے۔ بالکی سی ٹھنڈی ہوا پر رات کی رانی کا راج تھا۔ دونوں میرے ساتھ دروازے تک بڑھتے اور مجھے شرمندہ کرتے رہے۔ دروازے پر آ کے بیٹا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک ٹھٹھے کے لیے جی میں آیا کہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دوں، دوسرا لہجہ بہ ہر حال میرے اختیار میں آ گیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس کی خرد طبی انگلیوں کی گرفت سے اس کی سرخوشی جھٹک رہی تھی۔ مجھ سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کے وہ دروازے سے لوٹ گئی، لیکن ڈاکٹر رائے میرے ساتھ باہر آ گیا۔ میں نے اس سے واپس چلے جانے کی عاجزی کی۔

”کچھ چھل قدمی ہو جائے گی۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

ہماری رفتار سست تھی۔ چند قدم آگے جانے پر میں نے خاموشی توڑی اور رک رک کر آواز میں

کہا، ”بیٹا، آپ کی صاحبزادی تو بہت لائق ہیں۔ ان کا کام بہت بڑا کرتا ہے۔“

”اس میں بہت سے گمن ہیں۔“

”وہ تو کوئی شہزادی ہیں۔“

”حالاں کہ باپ بادشاہ نہیں۔“ وہ ان کے بولا۔

”باپ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے، باپ تو ایک مسیحا ہے، باپ تو ایک فرشتہ ہے۔“

”اوہ، تمہیں نہیں، انا مت کہو۔“ وہ ناراض ہونے لگا۔

”میں جو سمجھتا ہوں، جو میں نے دیکھا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”ہم کیا بات کر رہے تھے؟“ اس نے اپنے ذکر سے بھٹکانے کے لیے موضوع بدلا دیا۔

”آپ شہزادی کی بات کر رہے تھے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں، میں کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ یہاں آگئی ہے، لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، اس نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے۔ اسے یہاں بہت ٹھن بھی ہوئی ہوگی۔“

”وہ تو بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔“

”گھر میں کم لوگ آتے ہیں اور بہت کم لوگوں میں اس کا جی لگتا ہے۔ بیش تر ایسی ہی رہتی ہے۔ تمہارے آنے سے خاص کھلی کھلی لگ رہی تھی، کیوں کہ تم اس کے لیے دوسروں جیسے نہیں تھے، ایک بہت نئے آدمی، ہر اعتبار سے۔“

”میں کیا.....؟ میرے شانے سکڑ گئے۔“

”آپ جب انیسویں سے ملنے باہر چلے گئے تھے تو میری ان سے خوب باتیں ہوئیں ان کے لیے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ اپنے پاپا کے پاس ہیں۔“

”وہ بڑی بچی ہے۔ سوچو، کب تک میں اس کے ساتھ رہوں گا اور کب تک وہ میرے ساتھ رہے گی؟“

سکے گی۔ اسے اپنا گھر تو بہانا ہوگا، بہانا چاہیے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے ہنسی کے لڑکیوں کے ساتھ یہ کچھ غجب ہے، ان کا گھر بدل جاتا ہے۔“

”پہلے تو شادی ہی سے انکاری تھی۔ کہتی تھی، میں تو آپ کے ساتھ رہوں گی۔ کیا ضروری ہے کہ ہر لڑکی کی شادی ہو کرے۔ بعد کو میرے بچھانے بچھانے پر آمادہ ہوگی۔ پھر یہ شرط عائد کی کہ میں بھی اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں نے ہائی بھر لی کہ پہلے وہ اپنے گھر کی تو ہو جائے بعد کو دیکھا جائے گا۔“

”پھر کیا ہے۔ اب تو وہ راضی ہو گئی ہے۔ کوئی ایسا خوش قسمت تلاش کر لیجیے جو آپ کے ساتھ رہ سکے۔“

”لیکن کوئی اسے پسند تو آئے۔ تم نے تو اسے دیکھا ہے، ایسی نفیس طبع، نادرہ کار اور ندرت پسند لڑکی ہے۔ اسے چیدہ چیدہ چیزوں کی عادت ہے۔ کلکتے میں کچھ عزیز رہتے ہیں۔ ان کے نہایت لائق بیٹوں سے ملوایا تھا میں نے اسے۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے آزادی دی تھی کہ پھر اپنے لیے خود کوئی لڑکا منتخب کرے۔ لندن میں ایک عرصے رہی، وہاں بھی اسے کوئی نہ بھار سا..... تمہیں ایک دل چسپ بات بتاؤ کیا۔“

”جی..... میں نے تجس سے پوچھا۔“

”جب مسلسل کئی لڑکے مسترد کر چکی تو مجھے آ کے سارا بار مجھ پر ڈال دیا کہ جو مجھے پسند آجائے، وہ اسے قبول کر لے گی۔“

”تو سب کچھ اب آپ منحصر ہے۔“

”اور ظاہر ہے، مجھے بھی اس کے مزاج، رجحان، طبیعت کا خیال رکھنا ہوگا۔“

”جی ہاں، پھر تو بات وہی کچھ رہی۔“

”وہ بڑی تیز ہے، اسے معلوم ہے، اس کا باپ بھی پسندنا پسند میں کچھ کم جت نہیں کرتا۔ تم بھی کچھ بھری مدد کرو۔“

”جی..... جی ہاں۔“ میں نے تذبذب سے کہا۔

”کونھوں کے علاقے کی چار دیواری قریب آگئی تھی۔ سامنے دروازہ تھا ڈاکٹر رائے ٹھہر گیا۔ میں بھی رک گیا۔“

”تم سڑک کرتے رہتے ہو کوئی ایسا جوان جو ایسا ہی پر خیال، عزم و جوہلے ملے ایک تار بڑھا کھا، ہوش مند، کچھ تمہارے جیسا۔“ اس نے سراٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور گھر کی طرف واپس ہو پڑا، اور ابھی قدم دو قدم کا فاصلے طے کیا ہو گا کہ پلٹ کے بولا، ”اور وہ..... وہ تم بھی ہو سکتے ہو۔“

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

ڈاکٹر آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اپنے حواس کی رکی پر شبہ ہوا اور جی میں آیا، اس کا تعاقب کروں یا اسے آواز دوں کہ کیا اس نے یہی کہا ہے جو میں نے سنا ہے۔

مجھے یہاں لانے والا ڈاکٹر کا لازم کچھ نا صلی پر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا ڈاکٹر کے لوٹ جانے کے بعد وہ میرے قریب آ کے ٹھہر گیا اور منتظر رہا کہ کب میں اس کے ساتھ چلا ہوں گے میرے قدم تو زمین سے جکڑ لیے تھے۔

جانے کیوں مجھے گمان تھا کہ ڈاکٹر مڑ کر مجھے دیکھے گا لیکن وہ دور ہوتا گیا اور بولا سا نظر آنے لگا۔

”چلیں صاحب!“ مجھے بے حس و حرکت دیکھ کے مازم نے دنی آواز میں ٹوکا۔

میں نے اضطراب سے سر ہلایا اور پٹا تے ہوئے پلٹ کے دروازے کی طرف چل پڑا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور میرے جسم و جاں میں شور مچا ہوا تھا۔ چند قدم بعد اسپتال کی چار دیواری آ جاتی تھی۔ اسپتال کے اس حصے پر تعینات مستعد دربان نے چند لمحوں کے فاصلے کے بعد بھیجا کھول دیا۔ سپاہیوں کے انداز میں اس نے مجھے سلام کیا

تھا۔ مجھ سے کوئی جواب دیا جا سکا نہ ہاتھ ہلایا جا سکا۔ سامنے اسپتال کی عمارتیں سکوت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ راہ واریوں اور مختلف وارڈوں کے درمیان پھلتی ہوئی سڑکوں اور سبزہ زاروں پر نصب روشنیاں ہلکی ہلکی کمر میں غنما رہی تھیں۔

ڈاکٹر رائے کا خدمت گار میرے ساتھ ساتھ چلا رہا۔ کمرہ نزدیک ہی تھا۔ مجھے اسے لوٹا دینا چاہیے تھا لیکن اس کی ہمارا ہی میں کوئی سہارا سا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر ٹھہرے میں نے غیر ارادی طور پر مصائب کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بوکھلا گیا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ خدام اس عزت افزائی کے عادی نہیں ہوتے۔ وہ سرتاپا ہرا گیا اور جسم خم کر کے اس نے مجھے تعظیم میں دی تو اتنی مجھے پشیمانی ہوئی۔

نرس ایک جاگ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر جکتی ہوئی باہر آ گئی۔ ایک لمبی سانس کھینچنے کے بعد وہ چلی گئی۔ ”بہت دیر کر دی تم نے۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

”بس“ میں نے سر جھکا کر ناتوانی سے کہا۔

”وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔“

”کیسا ہوا؟“ وہ اشتیاق سے بولی۔

”بہت اچھا“ میں نے بے ربطی سے کہا۔

”اوہ شکر ہے۔“ وہ جھرجھری لے کر بولی۔

”مجھے تو طرح طرح کے آم آ رہے تھے۔“

”کیوں..... کیسے وام؟“ میں نے تندی سے پوچھا۔

”کوئی ایسی لمبی بات نہ ہو کہیں۔ میں نے جنہیں بتایا تھا، ڈاکٹر رائے بہت کم کسی کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ یہ تو بڑی ان ہوئی قسم کی بات تھی، خصوصاً تمہارے لیے۔“ ایک جھجکتے ہوئے بولی۔ ”ان حالات میں جو تین چاروں سے پیش آ رہے ہیں، تمہاری حیثیت کسی سوالیہ نشان کی سی ہو گئی ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر اور تمہاری شاسانی کو وقت ہی نکلتا

گزر رہا ہے۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظریں بے اختیار بنگھل کے بستر پر پڑیں اور جیسے کسی خواب سے آنکھ کھل جائے میں نے اضطرابی آواز میں پوچھا۔ ”کیا حال ہے ان کا؟“

”بالکل ٹھیک۔“ ایک فرارخ دلی سے بولی۔ ”درمیان میں دو ایک بار آنکھ کھلی تھی، جنہیں پوچھ رہے تھے۔“

”تم نے کیا کہا پھر؟“

”میں نے بتا دیا کہ تمہیں ڈاکٹر رائے نے گھر پر بلایا ہے۔ کچھ تو کہنا تھا مجھے۔ میں نے بتا دیا کہ ڈاکٹر نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے۔ یہ واضح کرنا ضروری تھا، کہیں کوئی اندیشہ، وسوسہ، مریض کے دماغ میں نمودار نہ پالے۔ بیماری بہت حساس کر دیتی ہے۔“ ابھی سرگوشیاں انداز میں بولی۔ ”خاصی دیر تک جاگتے رہے پھر میں نے سیب کی چند قاشیں کھلائیں، دوا لیں دیں، سو گئے۔ خون کا دباؤ، حرارت وغیرہ دیکھی گئی میں نے۔ سب کچھ معمول پر ہے۔ یہ ظاہر فکر کی کوئی بات نہیں۔“

سو نے پر بیٹھ کے میں نے اپنا بکھرا ہوا جسم سینے کی کوشش کی۔ ابھی بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔ لکھوں تک خاموش رہی پھر اپنے گرم ہاتھ سے میری گدی سہلاتے ہوئے وہ بولی۔ ”کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو۔“

”نہیں تو.....“ میں نے تہی ہوئی آواز میں کہا۔

”نیند آ رہی ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ میں نے اپنا جسم سیدھا کر لیا۔ وہ نیند کو پوچھ رہی تھی۔ نیند تو بڑی مشروط ہوتی ہے۔

”ٹپا ہوا ہوا؟“ وہ پچھل کے بولی۔

”کیسا ہوتا؟“ میں نے کسمسا کے کہا۔

”کیسا کیا باتیں ہو میں؟“

”دنیا بھر کی، ادھر ادھر کی۔ بہت سی باتیں۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ میں ابھی کو کیا بتاتا۔ ”کیسا لگا ڈاکٹر کا گھر؟“

”وہ تو کوئی نگار خانہ ہے۔“

”ہاں، بے شک۔“ غمر رسیدہ ایک بچوں کی مانند کہنے لگی۔ ”کوئی نگار خانہ یا عجائب خانہ..... مگر تمہیں سارا گھر دیکھنے کا موقع کہاں ملا ہوگا۔“

”تھوڑا بہت جتنا دیکھا وہی بہت مختلف اور منفرد تھا بہت۔“ میری آواز کھوس گئی۔

”تم نے غور کیا، کیسا تناسب و توازن ہے اس گھر میں۔ ہر چیز جہاں رکھی ہے، جیسے اسی جگہ کے لیے بنی ہو۔ اس طرح کے اکثر گھروں میں بڑی نادر چیزیں ہوتی ہیں لیکن ایک سلیقہ بھی تو چاہیے۔ بعض جگہوں پر تو چیزیں پھولتی ہوئی، اٹلی ہوئی لگتی ہیں۔ جتنے نفس ڈاکٹر رائے ہیں۔ انتہائی اعلیٰ ان کا ذوق ہے..... اور جب سے بیٹا انگلستان سے آئی ہے، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بیٹا تمہارے سامنے آئی تھی؟“

”ہاں آئی۔“ میں نے ہچکچاہٹ سے اقرار کیا۔

”دیکھا تم نے اسے۔ کیسی ترشی ہوئی، سامنے میں ڈھکی ہوئی لڑکی ہے، شکستہ، شائستہ..... ہزاروں، بلکہ میں تو کہوں گی، لاکھوں میں ایک.....“

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

”کیسی گلی وہ جنہیں؟“

”بہت اچھی، تم ٹھیک کہتی ہو، وہ بڑی نادر لڑکی ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کی بیٹی شاید کچھ ایسی ہی ہونی چاہیے۔“

”اُسے مت پوچھو۔“ ابھی بے تاب سی ہو گئی۔

”میں تو اس کی عاشق ہوں۔ ذرا سا بھی تکبر نہیں اس میں۔ جب بھی جاتی ہوں، بہت خوش ہوتی ہے اور میں..... میں تو اسے بس دیکھتی رہتی ہوں۔ جی کرتا ہے آنکھوں میں بسا لوں۔ بھی لمبا وقت ہو

جائے تو شکایت کرتی ہے۔ باپ سے کھلو اور ملائی ہے۔ جس گھر میں جائے گی بہاریں بکھیر دے گی۔ وہ تو ایک گھٹان ہے۔ سوچی ہوں، کون خوش نصیب ہوگا جس کے گھر اور دل کی زینت بنے گی۔ کوئی شہزادہ ہی ہونا چاہیے اس کے لیے۔“

”ہاں ہاں۔ وہ خود کسی شہزادی سے کیا کم ہے۔“

”تم بتاؤ تم تو جوان آدمی، کچھ کہنا، تم اس کے سحر کے امیر نہیں ہوئے؟ ہیں نا؟“ ایک مجھے ہنوکا دیتے ہوئے بولی، لگتا ہے، کچھ ایسا ہی ہے جی چپ چپ ہو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔“ میں نے زبردست آواز میں کہا اور پہلو بدلا۔

”کچھ بتاؤ، تم نے نہیں چاہا کہ تم اس کے پاس بیٹھے رہو۔ تم سو نے کی اس سواری کو دیکھتے رہو، اس کے پہلو میں، اس کی روشنی اور گداز میں زندگی بسر کر دو..... کچھ بتانا۔“

”میں نے ایسا کچھ خیال نہیں کیا۔“ میں نے تجنی سی کہا، ”حسین لوگ بھی حسین مناہر کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہیں اور دید و بازید کے لیے کسی کا جی نہیں چاہتا..... مگر تم کچھ زیادہ ہی اس سے متاثر ہو۔“

”وہ ہے ہی ایسی..... اور یہ تم کیسے تو جوان ہو۔“

”کیوں، مجھے کیسا ہونا چاہیے۔“

”تمہیں تو آہیں بھرتے ہوئی واپس آنا چاہیے تھا۔“ وہ شوقی سے بولی۔

”آدمی کو اپنے آپ کو بیچنا ہوتا ہے۔“

”تم..... تم کیا کسی سے کم ہو۔ میں تو زندگی بھر بیٹے کی آرزو کرتی رہی۔ دو بیٹیاں ہوئیں، ایک زندہ نہ رہ سکی، دوسری اپنے گھر کی ہوئی اور دوسری گئی، لیکن اگر میری کسی بیٹے کی خواہش بھی جو خداوند نے پوری نہیں کی تو وہ کوئی بیٹی جیسا تھا۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔

رات نئی رات، ہر دن نیا دن ہوتا ہے۔ آدمی وہی پرانا ہوتا ہے۔ ان پہروں اور موسموں کے طلوع و غروب ہی سے وقت کے پیمانے یا گھڑی کی ایجاد ممکن۔۔ ہوئی ہوگی۔ ایک ہی پہر رہتا، یا ایک ہی موسم تو آدمی ماہ و سال کے اعداد و شمار کے فریب سے دوچار نہ رہتا۔ کسی لمحے ایسی کی نظر گھڑی پر پڑی کہ وہ چونک پڑی اور اس نے معذرت چاہی کہ اپنی رو میں جانے کیا کیا دکھڑے، داستانیں لے کے بیٹھ گئی، اس کی یاد ہوئی مجھے ناگوار خاطر ہوئی چاہیے۔ میں نے شدت سے تردید کی کہ میں تو کسی رنڈ انداز کی خیال سے خاموش رہا ہوں، ایک ہر صفت شخص کا احوال دروں جاننے کی جست جو میں۔ ڈاکٹر رائے کا ذکر ایسی کا جتنا پسندیدہ موضوع ہے، میرے لیے بھی سردست اشتیاق و اضطراب کا باعث ہے۔ مجھے تو خلش ہے کہ یہ سارا کچھ میں پہلے کیوں نہ جان سکا۔ ڈاکٹر میرے محسن ہیں اور محبوب بھی۔ انہوں نے جس انتہاک سے مشکل کا علاج کیا ہے اور اس شہر میں میرے آنے کے بعد پیش آنے والے بے درپے تخمین واقعات پر، جس میں میرا نام ہر حال ملوث ہے، بل کہ بنائے فساد ہے، ان کا تحمل، ان کی بردباری میرے لیے پہلے ہی ایک ناقابل یقین واقعہ ہے، لیکن جتنا کچھ میں نے یہاں، اسپتال میں اور ان کے گھر جا کے دیکھا اور سمجھا ہے اور اب جتنا کچھ میں نے ان کی سے سنا اور جانا ہے، مجھے احساس ہو رہا ہے، ڈاکٹر کے لیے واجب مرتبت اور منزلت کے اظہار میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔

ایک چپ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بستر پر لیٹ جانے اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے پاس سونے پر بیٹھا رہا، پھر ایسی کی وجہ سے کہ اس عمر عزیزہ کو بھی آرام کا کچھ وقت مل جائے، بستر پر آ کے دراز ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے کا وہ آخری کلمہ میرے کانوں میں پیوست ہو گیا تھا۔ مجھے ہر جانب

اسی کی گونج سنائی دیتی تھی اور اپنی سماعت پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ ایک بار اپنے غلط حواس میں مجھے یہ بے جواز بدگمانی بھی ہوئی کہ ایسی ڈاکٹر رائے کی وکالت تو نہیں کر رہی، جیسے وہ مجھے کچھ جتنا چاہتی ہو اور اسے معلوم ہو کہ ڈاکٹر رائے نے اپنے گھر سے وداع کرتے وقت مجھ سے کیا کہا ہے۔ دوسرے لمحے اپنی بے لگائی اور بدحواسی پر مجھے شرم ساری بھی بہت ہوئی۔ ایک تو ایک سادہ و معصوم اور متفق خاتون ہے۔ ڈاکٹر کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کرب و سوز شامل تھا، جو کسی شامل شخص ہی میں ہوتا ہے۔ بے شک ڈاکٹر رائے اس کے لیے کسی دیوتا کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ایسے ہی کوئی کسی کا دیوتا نہیں بن جاتا، بہت شہادتوں اور دلیلوں کے بعد پرستش کا یہ مقام آتا ہے۔

بستر پر آ کے میرے جسم و جاں میں تلاطم سا برپا ہو گیا۔ بستر آدمی کو آرام پہنچاتا ہے تو ہلکان بھی کم نہیں کرتا کہ پھر تو بہت سے روزن کھل جاتے ہیں اور روزنوں سے طرح طرح کے حشرات اُٹھ آتے ہیں۔ آنکھیں بند نہیں ہو پاتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے آدمی کو کبھی بہت ڈر لگتا ہے۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے اشیاء و موجودات کوئی رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ بند آنکھوں سے آدمی خود اپنے سامنے آ جاتا، اپنے آپ سے نبرد آزما ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی بائیں کھنچے رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن چھوٹ چھوٹ جانی تھیں۔ ایک بھی جاگ رہی تھی۔ درجہ تک مجھے کروٹیں بدلتے دیکھ کر میرے سر ہانے آ گئی۔ ”نیند نہیں آ رہی میرے بچے؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے بے چارگی سے سر ہلادیا۔
 ”اسی کے متعلق سوچ رہے ہو؟“
 ”کس کے؟“ میں کھسا سا گیا۔
 ”اسی کے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یا آ رہی ہے

۴۴

نہرے جی میں آئی، اسے پرے دھکیل دوں۔
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ آنکھیں میچ کے
 بولی۔ ”لیکن نہیں۔“ کیا ایک اس کی آواز بھاری
 ہوگی۔ ”وہ بہت دور کھڑی ہے۔ نہیں پہنچ سکتے تم اس
 کے پاس۔ بہت فاصلہ ہے درمیان میں، بہتر ہے،
 کوئی دیا نہ جلاؤ۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ وہ میرے سر پہ ہاتھ
 پھیرنے لگی۔ ”بہتر ہے، اچھے بچوں کی طرح
 سو جاؤ۔“

”کہا کہہ رہی ہو تم؟“ میں نے ناتوانی سے
 کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کچھ رہی ہے۔
 ”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ میں سمجھتی
 ہوں۔“ اس نے میرے گال پر ہلکا سا طمانچہ
 مارا۔ ”مجھ پر بھی تو تمہارے جیسے دن آئے ہوں گے
 نا کبھی۔“

ایک مجھے اور منتشر کر رہی تھی۔ اس کی کسی بات
 کا جواب دینے اور ٹھکر کرنے کے بجائے خاموشی
 ہی مناسب تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہلے
 کی طرح وہ میرے بالوں میں انگلیاں الجھاتی رہی
 اور میری پیشانی کا بوسہ دے کے چپے سے اٹھ گئی۔

آدھی کے سرے کھڑ جائیں تو بہت ہاتھ پاؤں
 مارتا ہے۔ ہجوم میں جیسے کوئی چمچڑ جائے، بھی آدھی
 اپنے آپ سے بھی چمچڑ جاتا ہے اور خود کو تلاش کرتا
 رہتا ہے اور ڈھونڈ بھی لیتا ہے تو اپنا سامنا نہیں
 کر پاتا۔ میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بہت
 سے سوال و جواب تو مجھے خود سے کرنے اور خود کو
 دینے تھے۔ میں اپنی کو کیا مطمئن کر پاتا۔

مجھے دروازے کھلنے اور بند ہوجانے کی آواز
 آئی۔ میں نے نہیں دیکھا، مگر شاید اپنی پہلو میں،
 نرموں کے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس
 کی ناموجودی سے جانے کیوں کچھ سکون سا ہوا۔
 ہر چند رنگوں میں چوڑیاں ہی رینگ رہی تھیں اور
 آنکھوں میں آگ سی گئی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں
 ٹوٹتے ہوئے جیسے کوئی سرا ہاتھ آجائے، کسی سوال کا

جواب مل جائے، رات کے آخری پہر میں کہیں مجھے
 لگا، میں گم گشتہ خود کو نظر آ گیا ہوں۔
 یقیناً ڈاکٹر رائے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا
 تھا۔ ڈاکٹر پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ کچھ دیر
 پہلے اس نے گھر آنے والے پولیس افسر سے گفت
 گو کی تھی اور میرے بارے میں کچھ اچھی باتیں نہیں
 سنی تھیں، پھر اس نے مجھ سے تہہ بیدی و شیشی لب
 و لہجہ میں بحث کی تھی اور میری صراحتیں محل سے سنی
 تھیں، وہ نہایت متوازن باتیں کرتا رہا تھا۔ کوئی
 ابہام نہیں تھا اس کے کلام میں۔ اپنا مدعا بیان کرنے
 سے پہلے اس نے تمام تر سیاق و سباق کا خیال رکھا
 تھا اور اس نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا، محض ایک
 امکان ظاہر کیا تھا۔ اس نے پوری ناز کی برتی تھی۔
 یہی ایک شیشی، اشارتی سا قریب ہوتا ہے ایسے
 موضوع پر لب کشائی کا۔ ایک دانش مند، ہر اعتبار
 سے مکمل، ایک جہاں شناس شخص کی جانب سے ایسی
 کسی خواہش کا اظہار اچھی طرح عواقب و نتائج پر
 غور کر کے ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کی عزیز از جاں
 بیٹی کا معاملہ تھا۔ اس بیٹی کا جو اس کی زندگی کا حاصل
 ہے۔ سب کچھ بکھر جائے اور لٹ جانے کے بعد اس
 کے لیے بچی بچی کا ثنات کے مانند ہے۔ تندہ رندی
 و سرمستی کی کسی کیفیت سے دوچار تھا، نہ میرے اس
 کے درمیان بے تحاشی و بذلہ کجی کی کوئی رسم و رواج تھی
 اور ایسی باتوں کا تعلق تو زندگیوں سے ہے۔ زندگی
 کے اتنے اہم فیصلوں میں یہ شوشیاں نہیں کی
 جاتیں۔

میرے اس کے مراسم کو دن ہی کتنے ہوئے
 تھے، ٹھیک سے ہفتہ بھر بھی نہیں۔ اس مختصر دورانیے
 میں جس بے سروپائی، بے دردی، بے دادرگی میں
 روز و شب گزرے تھے، بے شک مجھے قریب سے
 جاننے بوجھنے کا اسے موقع مل گیا تھا۔ اور اس کے
 سامنے اپنے مزاج، اپنی روش کی بیٹی تھی، عام
 لڑکیوں سے یک سر مختلف، پھر شاید کچھ یوں ہوا کہ

جنت بسیار کے بعد ڈاکٹر کو اپنی بیٹی اور مجھ ایک
 خاک بسر، آشفستہ سر کے درمیان کسی تار و پود کی کوئی
 صورت دکھائی دے گئی۔

وہ ایک سراپا حتمکت، سرتا بارعنائی، چہرہ ماہ
 تاب، بدن کندن، نقش و نگار تراشیدہ، کوئی حسین
 و جمیل لڑکی کچھ ایسی ہی ہو سکتی ہے اور حسن و جمال کی
 خوبیاں تو ظاہری ہیں۔ خیال کی افراط، ذہانت
 و فطانت کے اوصاف خداوندی عطیہ ہیں، مگر آدمی
 ان پر کس قدر روادار طلب ہو، ناز تو ان اوصاف پر ہوتا
 چاہیے جو اپنی جست جو، مساعی اور ریاضت کا ثمر
 ہوں۔ ڈاکٹر رائے کی صاحب کمال بیٹی بیٹا کو اپنی
 بیش از بیش عقلی صفات کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا
 کہ اس نے اس کی بالیدگی اور افزائش کا ہر چہن کیا
 تھا۔ وہ بری زاد آسمانی حسن سے آراستہ نہ ہوئی تو
 بھی علم و فکر، ہنر و فن، نفاست و شائستگی کی آکسابی
 اور ارادی خوبیوں میں یک تار و یکا نہ تھی۔

تو پھر استراداد کا کیا گل، تردید کا کیا جواز ہے۔
 سامنے کون ہیں، دانائے دہر، دانش سرشت، فکر
 پیشہ، سیمائیس، عالی مقام ڈاکٹر رائے اور ان کی
 نادرہ کار، نادر روزگار بیٹی بیٹا اس میں استقامت
 ہے جو ڈاکٹر رائے کی عزت مآب گھرانے سے
 دانشی میں سرتابی کا ارتکاب کرے۔ لازم ہے کہ
 بیٹی کے اشارہ و عنایت کے بغیر باپ کو اس قلندر کی
 جرأت نہیں ہوتی چاہیے، تو پھر یہ تصور ہی کیسا جاں
 گداز ہے کہ ایسا کوئی ریشم و ششم، شیشہ و شعلہ، گل
 اندام، ایسا کوئی گلستاں مثال، آمادہ لطف و نشاط
 ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اس کی بیٹی کا کسی نا آشنا، بے
 نشان پر یہ خسروانہ اتفاقات ایک عزد و شرت ہے۔ پھر
 وہ خوش کام و خوش انجام کسی اور کو بچے کا رخ کیوں
 کرے، خود کو پھولوں اور رنگوں کی نذر کیوں نہ
 کر دے۔ آدمی وہیں تمام کیوں نہ ہو جائے۔

رات کے آخری پہر کی لمحے مجھے نیند آگئی۔ سنا
 ہے، کسی ارادے کی توانائی نصیب ہو جائے تو نیند

آجاتی ہے۔ ارادے کی نوعیت چاہے کسی کیوں نہ
 ہو، ارادہ ہی راحت ہے۔ بھان و اضطراب کے
 ایک گرداب کے بعد مجھے جیسے کوئی کنارہ نظر آ گیا۔
 میرا ارادہ استوار ہو گیا تھا۔ کمرے میں ایسی کس
 وقت واپس آئی، مجھے خیر نہ ہو سکی۔

صبح اچھی اندھیرا لٹ رہا تھا کہ راہ داری میں
 خاک رو بہوں کی چمبل پہل سے آنکھ مل گئی۔ پہلے
 میری نگاہ نعل کے بستر پر گئی، وہاں خاموشی تھی، پھر
 دروازے کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز بیگانہ
 ہوش ایسی نظر آ گئی۔ میں نے بھی پھر آنکھیں
 موند لیں، لیکن آدھ گھٹنا نہیں گزرا ہوگا کہ کمرے
 میں در آنے والا اچالا پھیل گیا۔ پھر نیند نہیں آئی۔
 ایسی بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور
 کھڑکیوں کے پردے ایک طرف سمیٹ دیے۔
 ملحق غسل خانے میں منہ ہاتھ دھو کے میں کمرے
 سے باہر آ گیا۔ دن رات کا کوئی پہر صبح سے بہتر نہیں
 ہوتا۔ دنیا بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تازہ تازہ،
 جیسے آج ہی وجود میں آئی ہو۔ آدمی کیا، پرندوں کو
 بھی صبح بہت مرغوب ہے، کیسے ناپنے، گانے،
 اترانے لگتے ہیں۔ کاش ایک پہر ہی ہوا کرتا، مگر صبح
 کی لطافت ”سرے پھروں سے میز کس طرح
 ہو پانی، اندھیرے ہی سے روشنی کا مرتبہ ہے۔

ایک نے کی خدمت گار سے جائے منگوالی
 تھی۔ راہ داری میں کرسی اور میز ڈلو کے اس نے
 اپنے ہاتھ سے میرے لیے چائے بنائی اور خود چند
 گھونٹ پی کے الپس کمرے میں چلی گئی اور دروازہ
 بند کر لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے اندر جانے
 کی اجازت نہیں ہے۔ صبح سویرے وہ زیادہ فعال
 ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اسے بہت
 سے کام کرنے ہوتے تھے۔ حرارت، خون کے دباؤ
 اور جنس کی رفتار کی جانچ پڑتال اور مریض کے
 کیفیت نامے میں خانہ پر، مریض کے لباس کی
 تبدیلی، ناشتا کرنا، دواؤں کی خوراک دینا وغیرہ۔

اسنے دونوں میں میں بھی اسپتال ہی کا کوئی آدمی بن گیا تھا۔ اسپتال کے بھی اپنے صبح و شام ہوتے ہیں، باقی دنیا سے الگ تھلگ۔ اسپتال اور قید خانے میں بڑی مماثلت ہے، وہاں جیلر ہوتا ہے، یہاں ڈاکٹر، وہی نظم و ضبط، وہی ان کا گشت، وہی پابندیاں۔ یہاں مریض بھی کسی زندانی کی طرح ہوتا ہے۔ میں نے سات سال کائے تھے، بھٹل نے بھی جانے کتنی زندگی قید خانوں میں گزار دی تھی۔ اسے اپنی مرضی و نشا ترک کر دینے کی عادت تھی، حالاں کہ زندانی ہونے کے باوجود جیل میں ایک طرح اس کی عمل داری ہوتی تھی۔ یہاں تو وہ کسی محتاج کے مانند ہو گیا تھا۔ قید خانے سے اسپتال کی سزا زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ آدمی آزاد ہے بھی نہیں بھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سیورین آگئی۔ اودی رنگت کے کڑھے ہوئے کرتے، تنک مہری کے سفید پاجامے اور سفید دوپٹے میں ملبوس۔ نوگشت، کھلی کھلی مسکراتی، لہراتی ہوئی اور کسی قدر گھبرائی گھبرائی سی۔ عقب میں اسپتال کا نو عمر ملازم، توشیدان اٹھائے ہوئے تھا۔ آج وہ کچھ پہلے ہی چلے آئی تھی۔ لگتا تھا، بس صبح ہونے کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کے مجھے اپنے ہی گھر کی کسی لڑکی کا گمان ہوا، شاید اس لیے کہ وہ زریں، فرخ، فریال، سلیمی اور نیساں ایسا لباس پہنے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رائے کسی وقت بھی معمول کی گشت پر آسکتا تھا۔ ادھر سیورین ناشتا ٹھنڈا ہو جانے کے اندیشے میں لیکان نظر آتی تھی۔ اس وحشت کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق کی داغ بیل کی بے غلی ہوئی ہے۔ ہنرمندی نے اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ وارڈ ہوائے کو بیچ کر ڈاکٹر کی نقل و حرکت کا سراغ لگایا، پھر اس اطمینان کے بعد کے ڈاکٹر کے آنے میں کچھ وقت لگنا چاہیے۔ میز پر ناشتا سجا دیا گیا، مجھے اندازہ تھا کہ سیورین نے کیا کیا اہتمام کیا ہوگا۔ رات کو سو بھی سکی، یا نہیں۔ بالشت بھر کی چھوٹی چھوٹی پوریاں،

سبھی ایک پینٹس کی، ہلکی ہلکی تلی ہوئی، پنے، آلو، پالک اور پیچڑ کا ریاں مختلف بھی سبز یوں کی فاشیں، ٹوسٹ، مکھن اور شہد، ولاتی قسم کا سیسوں کا مٹھا اور جانے کیا..... وارڈ ہوائے چائے لے آیا۔ میرے انکار کے باوجود سیورین کے اشارے پر ایکی بار بار میری تشری بھرتی رہی۔ میں نے کچھ شکم سیری کی، کچھ وضع نبھائی۔ کچھ مجھے اس تکلف پر خفت بھی بہت ہو رہی تھی۔ میری پسندیدگی کے اظہار پر سیورین کے رخساروں کی چمک دیدنی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنی بھی کم نہیں آتی، اور اس میں عرصہ، وقت اور کسی ایثار و احسان کی بھی شرط نہیں، بس آدمی کو آدمی اچھا لگتا چاہیے، آدمی کو آدمی کی قدر ہوئی چاہیے۔ اس کی مجبوری، محرومی اور ضرورت کا احساس، اور آدمی کا دل کشادہ ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں نفرت بھل ہے، محبت سخاوت اور آدمی کا شرف۔

اچھا ہوا جو وارڈ ہوائے نے لپکتے جھپکتے آکے ڈاکٹر رائے کے آنے کی اطلاع دی اور سیورین اور ایکی کی خاطر دار یوں پر بندش تھی۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہا تھا۔ انہوں نے گوارا نہیں کیا اور خود ہی انہوں میں میز صاف کر دی اور ناشتے کی کوئی نشانی میز پر باقی نہ رہنے دی۔

روزی طرح تر و تازہ ڈاکٹر رائے دو ڈاکٹروں اور ایک نرس کے ہم راہ تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ شاید پہلی نظر بھی پر گئی اور اس کے ہونٹوں پر شائستہ مسکراہٹ کو مدغی۔ اس ایک لمحے میں میرا سارا وجود دھڑک اٹھا۔ دوسرے لمحے وہ قدم بڑھا چکا تھا، لیکن یکایک درمیان میں ٹھہر گیا اور سرگھماتے ہوئے چوٹی آواز میں بولا۔ ”دیکھی تم کا ناشتا! یہاں اسپتال میں تو نہیں بنتا۔“

سیورین ابھی تک گھر کے لباس میں تھی، وہ دو چمر آگئی۔ ایکی نے سامنے آکے جھجکتے ہوئے پردہ

پوشی کی کہ سیورین اس کے لیے کچھ گھر سے بنا کے لائی تھی۔

ڈاکٹر نے آنکھیں چڑھا کے سر ہلایا۔ ایک ناگواری چہرے پر ہوا پیدا ہوئی اور وہ آگے چلا گیا۔ بھٹل کے پاس جانے کے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب جانے سے دانستہ گریز کیا اور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ڈاکٹر نے بھٹل کی کیفیت نامے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے سامنے ڈاکٹروں سے سرگوشیوں میں مشورے کرتا رہا۔ بھٹل جاگ گیا تھا یا پہلے سے جاگ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے پر مکا مارے ہوئے مہیا نہ اور مشفقانہ انداز میں حال پوچھا۔ بھٹل نے ہلکی آواز میں کیا جواب دیا تھا کہ بے ساختہ ڈاکٹر کا قہقہہ بلند ہوا۔ دوسرے ڈاکٹر بھی مسکرا اٹھے۔ اس سے پہلے کہ گذشتہ مرتبہ کی طرح ڈاکٹر رائے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم صادر کرے، میں نے خود ہی کمرے سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ باہر آکے مجھے عداوت و ملامت کے احساس نے آھیرا۔ اس طرح میرے چلے آنے کا کیا جواز ہے، صرف اتنا نہیں کہ میں نے خود کو وہاں غیر ضروری جانا، یا جلد، یا بد پر ڈاکٹر کو میری موجودی ناپسند ہوئی، اس کے حکم کے بغیر میرے باہر آ جانے کی یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر سے نظریں ملانے کی مجھے تاب نہیں ہے، اس کا سامنا کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ ہو رہی ہے مجھے، لیکن یہ گریز و اجتناب تو میرے استوار کیے ہوئے ارادے کے منافی ہے۔ اس اعتراف و تلقین کے باوجود کمرے میں واپس جانے کی ہمت نہ ہوگی۔ راہ داری میں کمرے کے پہلو ٹک رہی ہوئی کرسی پر میں کسی دربان کی مانند بیٹھ گیا اور در پر ہو گئی۔

آج کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ اندر سے آنے والی تیز آوازوں پر یک بارگی مجھے اٹھنا پڑا اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایک طرف نرس

ایکی، دوسری طرف ڈاکٹر کے ساتھ آنے والی نرس کا ہاتھ تھا۔ بھٹل اپنے بیروں سے چلتا ہوا باہر کی جانب آ رہا تھا۔ تینوں ڈاکٹر اس کے پیچھے تھے اور حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ بھٹل نے کمرے کا دروازہ بھی عبور کر لیا اور باہر آکے اس نے دونوں نرسوں سے اپنے ہاتھ پھڑا لیے اور خود اپنے سہارے دائیں طرف پوھٹنا شروع کیا۔ ڈاکٹر تالیاں بجانے لگے۔ بھٹل کے حیدر میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور جسم بھی ڈمگمگ گیا تھا، لیکن دو گرا نہیں۔ دونوں نرسیں اس کے جسم سے تقریباً چپکلی ہوئی ساتھ تھیں۔ ڈاکٹروں کی آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی۔ چند قدموں کا قاصد بھٹل نے خود طے کر لیا تھا۔ وہ اور آگے جانا چاہتا تھا کہ ایک ڈاکٹر نے آگے جانے کے اسے روک دیا۔ بھٹل واپس بھی اپنے بل پر آیا اور کمرے کے دروازے پر بھی جس کرسی پر کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا، وہیں ٹھہر کے اس نے بیٹھ جانے کی خواہش کی۔ نرس ایکی نے اس کا بازو تھاما، مگر وہ اپنے آپ ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ بھٹل کی ایسی بات نہیں ہوگی، اتنے دنوں تک کمرے کے در و دیوار سے دور ہو کے کئی جگہ اسے اچھی لگ رہی ہوگی۔ راہ داری کے آگے سبزہ زار تھا، کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبزہ زار کے اس پار درخت تھے اور پرندے پھدک رہے، چچہارے تھے۔ کچھ قاصد پر میں بھی دہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ایک گہری سانس لی۔ سارے لوگ، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کس طرح ڈاکٹر رائے سے احسان مندی کا اظہار کروں، ایکی اور سیورین سے کیا کہوں اور بھٹل کو کیا تسلی دوں۔ میں تو سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔ میرا جسم بے وزن ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر رائے، سامنے ڈاکٹروں کے پاس سے ہٹ کے میرے پاس آ گیا۔ میں سوچتا رہا۔ اس

دیکھا کیا۔

”کیسا ہے رے؟“ اس نے بد بداتی آواز میں پوچھا۔

”میں..... میں ٹھیک ہوں بالکل۔“ میرا جزم اکر گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ ”تم..... تم بتاؤ کیسے ہو اب؟“

اس نے جواب دینے میں تامل کیا، پھر بولا،

”کتنے دن ہو گئے؟“

”زیادہ نہیں۔“ میں نے بہ عجلت کہا، ”یہی کوئی چار پانچ بل کہ سمجھو، چھ دن۔“

اس کے ہونٹ پھیل گئے اور وہ سر ہلا کے رہ گیا۔

”اب کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہی ہے۔ اچھا ہوا جو ہم یہاں آ گئے۔“ اپنی آواز قابو میں رکھنا مجھے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا، میری بات کا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”خط، تار وار تو نہیں دیا کہیں کو؟“ اس نے پوچھنا شروع کیا۔

”نہیں۔“ اس کے استفسار پر پہلا خیال مجھے زریں کا آیا تھا، اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا، پھر میں نے تردید کی۔ ”کتنے تار دیا تھا جامو بھائی اور جرمو کو بلانے کے لیے۔ انہیں آ جانا چاہیے تھا اب تک۔“

”کیوں دیا ہے۔“ وہ اداسی سے بولا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی بیماری کے ان چند دنوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے..... پانچ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ سارا شہر ہی متاثر ہوا ہے، میں بھی بس اتفاقی سے اس کے پاس موجود ہوں۔ ڈاکٹر رائے پولیس کے آڑے نہ آ جاتا تو میں پولیس کی تحویل میں ہوتا، اور جانے پھر کیا ہوتا۔ میں نے کہا، ”اکیلا لگ رہا تھا میں خود کو۔“

اس نے ہنکاری بھری اور کچھ نہیں بولا۔

میں نے اس کی بات کو اس کے پاس کھڑی رہیں۔ انہوں نے اسے کمرے میں واپس لے جانا چاہا، لیکن نھل کے منع کرنے پر انہوں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے انہیں ایسی کوئی تاکید نہیں کی ہوگی کہ وہ زیادہ تنویش کرتیں۔ ایسی نے خدمت گار سے کہہ کے وہیں ایک اور کرسی رکھوا دی اور کمرے میں جا کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ سیورین بھی لباس کی تبدیلی کے لیے حق کرنے میں چلی گئی۔ نھل اور میں وہاں اسیکے رہ گئے اور میں دزدیدہ نظروں سے اس کی صورت

”مغصوم نہیں، کیوں نہیں آ سکتے وہ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ تار نہ پہنچا ہو۔ جانے کیا بات ہے؟“ میں نے اسے نہیں بتایا کہ ایک کے بجائے دو تار دیے گئے تھے، اور وہ بھی ار جنت۔

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پھر مددگی سے بولا، ”ابھی اور کتنے دن کا بوتلے ہیں ڈاکٹر لوگ؟“

”کوئی بات نہیں ہوئی ابھی، لیکن یہ اسپتال اچھا ہے، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی لوگ بہت ذمے دار ہیں۔ اور کچھ دن لگ جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔“

میں نے عمو آسرسی طور پر کہا۔

”جگہ تو بڑی ہریانی ہے۔“ ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے اس نے میری تائید کی۔

”یہ اسپتال کا سب سے خوب صورت حصہ ہے، الگ تھلگ بھی اور اسپتال میں شامل بھی۔ بہت بڑے بڑے لوگوں کو کمرے ملتے ہیں ایسے، گورے، بڑے افسروں اور پیسے والوں کو۔ وہ تو ڈاکٹر نے مہربانی کی۔ کسی جان پہچان، صاحب سلامت کے بغیر ہمیں ادھر جگہ دے دی اور پھر کیسا خیال رکھا، جیسے ہم ان کے کوئی عزیز ہوں۔ کیا کیا بناؤں تمہیں، اپنے ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر رائے کے بارے میں.....“

وہ سر اٹھائے سن رہا اور جانے کیا بڑے بڑے لگ۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔

اسی لمحے ایسی آکے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید کپڑے سے ڈھکی ایک مختصر رے تھی۔ نرے میں فحان اور گلاس دیکھ کر نھل نے منہ پھیر لیا، مگر ایسی کا انداز نہایت معذرت خواہانہ تھا۔

میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ”شفقت سے کچھ نہیں گزرتی ہے۔“ نھل نے فحان سے اچک کے حلق میں اثر مل لیا۔ ایسی پانی بھرا گلاس بڑھایا تو ایک ہی سانس میں اس گلاس بھی خالی کر دیا۔ ایسی شکر ادا کر کے چلی۔ نھل نے منہ بنا کے میرے گھٹنے پر آہستہ سے

”بازی گڑ (255)

شوکا دیا۔ ”بیڑی مل جاوے گی ادھر؟“

”بیڑی؟“ میں چونک پڑا۔

”ہاں رے بیڑی، کبھی دیکھی نہیں؟“ وہ سختی سے بولا۔

”دیکھی ہے، بہت دیکھی ہے۔“ میں نے زنج ہو کے کہا، ”نر نہ بیو تو اچھا ہے۔“ مجھے نرس ایک سے پوچھنا پڑے گا۔ ”میں نے کمرے میں موجود ایسی کے پاس جانے کے لیے اٹھنا چاہا۔ میں نے سوچا تھا، ایسی سے کہہ کے منع کرادوں گا۔ بیڑی سے کھانسی ہو سکتی ہے۔

”رہنے دے۔“ اس نے جھڑکی آواز میں مجھے روک دیا۔

بیڑی کی طلب سے مراد تھی کہ واقعی اس کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔ حالاں کہ وہ بیڑی کی کا ایسا عادی نہیں تھا۔ دن میں چند بیڑیاں اور حق سامنے ہوتو قطعاً نہیں۔ یہاں حق کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس نے پھر چپ سادھ لی تھی۔ بڑے زار پر اچھلتی، کودتی اور ٹٹو نہیں مارتی چڑیاں دیکھتا رہا۔ اور دیر بعد تاسف آمیز دھرتی سے بولا، ”الہا ہو گیا رے ہمارا بیڑا۔“

ساتھ نہیں ہوا تھا؟ آسن سول میں اس بدعاش سید محمود علی کے گھر کتنے دن ٹھہرنا پڑا تھا۔ مجھے تو بخار تھا..... اور تمہیں.....“ مجھے اپنی زبان قحاشی پڑی اور میں نے ملامت سے کہا، ”تمہارا تو رکا معاملہ تھا، اور اب، اب تو تم ٹھیک ہو۔“

”ہاں رے، سارا ٹھیک ہی لگتا ہے۔ چل پھر سکتا ہوں اب ایک دم۔“

”چل کے تو تم اپنے پیروں ہی سے یہاں آئے تھے۔ کوئی اٹھا کے نہیں لایا تھا، لیکن ہوا کیا پھر۔“ میرے لہجے میں تیزی آ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے ہم۔“

سیورین نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا اور
 اپنی اپنے گھر بلو لباس میں گھر جانے کے لئے تیار
 ہو چکی تھی۔ ہٹھل کو وہاں بیٹھے قریب آدھ گھنٹا گزرا
 ہو گا کہ ایک کسی ناگہانی بلا کی طرح سر پہ آدھمکی۔
 اس بار اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے
 ہٹھل کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بیمار آدمی سب سے
 بڑا محکوم ہوتا ہے اور ابھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنے
 محکوموں سے کب اور کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ہٹھل
 کے پاس خشونت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے اور
 تعمیل کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ وہ اٹھ
 گیا۔ سیورین اور ایک نے اس کے بازو پکڑ لیے
 تھے۔ اس نے بازو جھٹک کے دونوں کو ہٹا دیا اور
 تین قدم کی دوری طے کر کے اپنے کمرے، اپنے
 زنداں میں داخل ہو گیا۔

ایک پھر نہیں ٹھہری۔ شام کو جلد ڈیوٹی پر واپس
 آنے کا کہہ کے اور ہٹھل کی صحت یابی کے لیے رسمی
 دعائیہ کلمات ادا کرتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

”ہٹھل جاری ادھری۔“ ہٹھل نے ہٹھلی آواز
 میں فرمائش کی۔